
مجلۂ عثمانیہ
مدیر
احمد خاں بی۔ اے (عثمانیہ)
شریک مدیر
سید حسین رضوی بی۔ اے (عثمانیہ)

مجلّہ عثمانیہ

مہاراجہ نمبر

مہتمم مدیر و مدیر حصہ اُردو

احمد خاں

بی اے (عثمانیہ)

شریک مدیر

سید حسین رضوی

بی اے (عثمانیہ)

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن فون نمبر ۳۴۰۲

مجلس انتظامی

سال تعلیمی ۴۹-۱۳۴۸ف

صدر

قاضی محمد حسین صاحب

ام اے۔ ال ال۔ بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

نگران کار حصہ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین قادری ام اے۔ پی ایچ۔ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

نگران کار حصہ انگریزی

وی یس کرشن ام۔ اے (اکسن) مددگار پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمان صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

معتمد

احمد خاں بی اے (عثمانیہ) مہتمم مدیر و مدیر حصہ اردو جامعہ عثمانیہ

اراکین

محمد تراب علی خاں نائب معتمد انجمن اتحاد — **سید محمد تقی ہاشمی** مدیر حصہ انگریزی

سید حسین رضوی شریک مدیر حصہ اردو — **غلام غوث خاں** شریک مدیر حصہ انگریزی

چندہ سالانہ پیشگی

( ) سرکار آصفیہ و برطانیہ	۵	روپے
( ) ارباب جامعۂ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸	”
( ) عام خریداروں سے	۶	”
( ) طلبائے قدیم رفاہیہ انجمنوں اور دارالمطالعوں سے	۵	”
( ) طلبائے جامعہ عثمانیہ سے	۲	”
( ) ممالک بیرون ہند سے	۱۵	اشلنگ
( ) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ سے	۱۰	”
( ) فی رسالہ	۴	روپے

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد (۱۳) شمارہ (۴)

انتساب

"مشرقی تہذیب کے نام جس کی آخری یادگار
مہاراجہ آنجہانی تھے اور جو آج بھی عثمانی نوجوان
نسل کی متاع عزیز ہے"

فرمان مبارک

افسوس ہے کہ کل مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنت کا انتقال ہوگیا ہے (چند دن کی علالت کے بعد) لہٰذا ان کے دیرینہ وفادارانہ خدمات کے مدنظر اور بایں خیال کہ ان کا تعلق طبقہ امرائے عظام سے تھا (علاوہ خدمت پیشکاری جس کا درجہ خدمت دیوانی کے بعد ہے) لہٰذا ایک دن کی عام تعطیل بلدہ میں آئندہ پنجشنبہ ۸ ربیع الثانی دی جائے۔ یعنے اس دن بلدہ کے سرکاری دفاتر و مدارس وغیرہ اس سوگ میں بند رہیں تو مناسب ہے۔

آخر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہر جاندار کو جو کہ دنیا میں آیا ہے ایک نہ ایک دن اسکو رخصت ہونا ہے۔ تاہم جو خوش قسمت ہستیاں ہوتی ہیں وہ ضرور بالصفات نیک ہوتی ہیں کہ دنیا میں رہتے تک عزت و آبرو کی زندگی بسر کرتی ہیں اور جب یہاں سے کوچ کرتی ہیں تو اپنے اعمال حسنہ اپنے پیچھے بہ شکل باقیات الصالحات چھوڑ جاتی ہیں لہٰذا ایسے افراد کی جتنی تعریف کیجائے کم ہی کم ہے۔

عوام کی اطلاع کی غرض سے یہ جریدۂ غیر معمولی میں طبع کر دیا جائے۔

شرح دستخط مبارک اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہم العالی

۶ ربیع الثانی شریف ۱۳۵۹ھ

فرمان

چونکہ مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کے دیرینہ وفادارانہ خدمات بہ حیثیت پیشکار و دیوان (در دو دور) و صدر اعظم قابل قدر اور حسب نوعیت کے رہے ہیں اس کا مقتضی یہی ہے کہ ان کی وفات پر میرے اور ہز ایکسلنسی دی وائسرائے بہادر کے مابین "تعزیت" سے متعلق جو ٹیلیگرامس کا تبادلہ ہوا تھا وہ پبلک کی اطلاع کی غرض سے شائع کر دیئے جائیں کیوں کہ یہ مرحوم اور ان کے خاندان کے لئے باعث فخر و نازش رہے گا لہٰذا حکم دیتا ہوں کہ اس فرمان کے ساتھ ٹیلیگرامس کے نقول بھی جریدہ غیر معمولی میں طبع کر دیئے جائیں۔

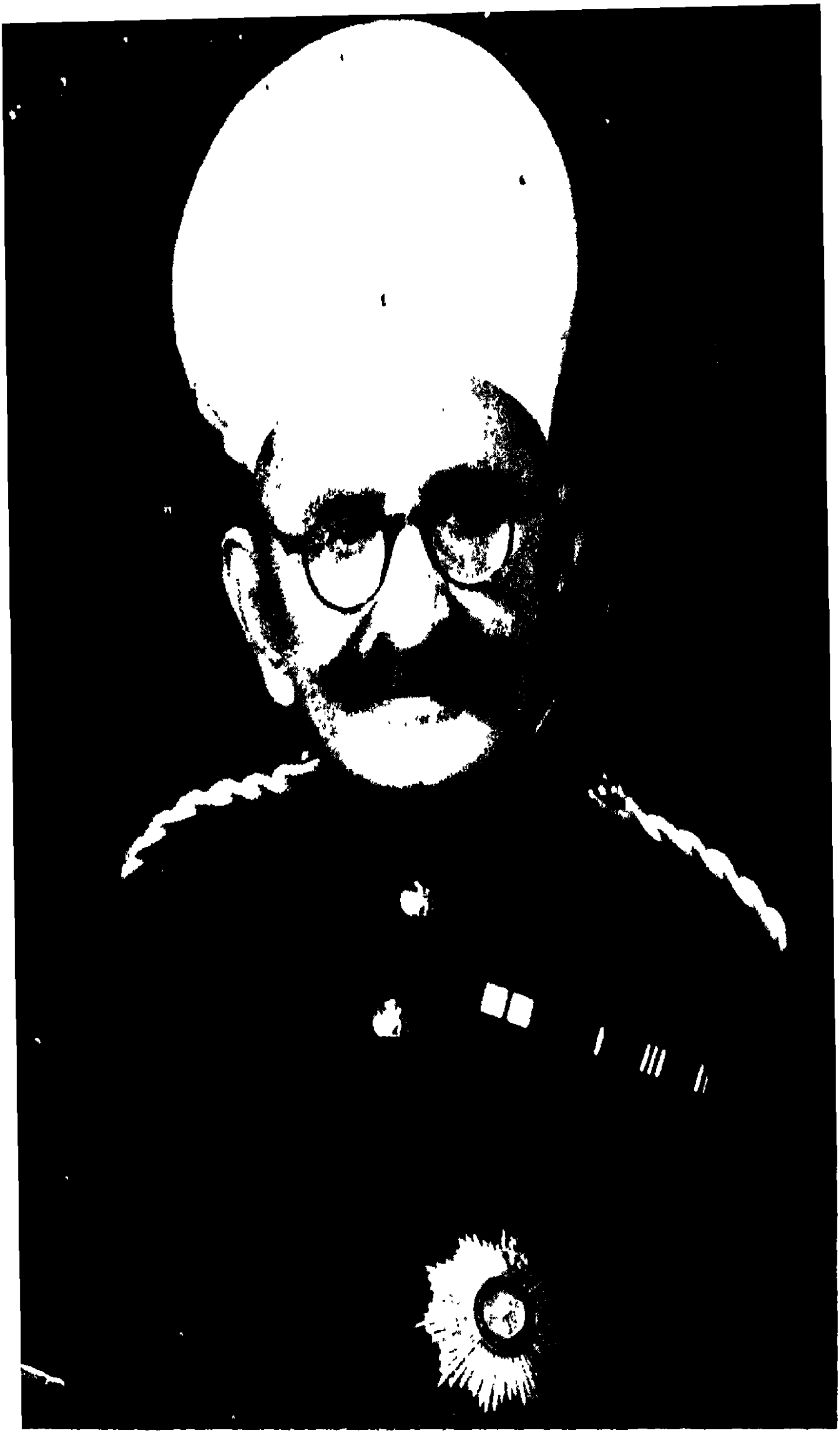
یکم شعبان المعظم ۱۳۵۹ھ شرح دستخط مبارک اعلیحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہم العالی

ترجمہ ٹیلیگرام از شملہ۔ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء۔ منجانب ہز ایکسلنسی وائسرائے بہادر۔ بنام ہز اکزالٹیڈ ہائینس نظام حیدرآباد دکن

براہ مہربانی سرکشن پرشاد کی وفات پر میری مخلصانہ ہمدردی قبول کیجئے جنہوں نے اتنی طویل مدت تک یور اکزالٹیڈ ہائینس کی خدمت وفاداری کے ساتھ انجام دی۔ "وائسرائے"

ترجمہ ٹیلیگرام از حیدرآباد دکن۔ مورخہ ۱۵ مئی ۱۹۴۰ء۔ منجانب ہز اکزالٹیڈ ہائینس دی نظام۔ بنام ہز ایکسلنسی وائسرائے وایسریگل لاج شملہ

یور ایکسلنسی نے اپنی مہربانی سے مہاراجہ سرکشن پرشاد کی ناگہانی وفات پر جو تعزیت کا تار بھیجا ہے اس کا میں ممنون ہوں اس میں شک نہیں کہ وہ ریاست حیدرآباد کے وفا شعار اور قابل اعتماد عہدہ داروں میں سے تھے جن کے انتقال سے سخت نقصان ہوا "نظام"



اِدارِیَہ

"پُرانی بساط کا آخری مُہرہ"

کارلائل کا نظریہ تھا کہ مشاہیر کی زندگی قوموں کی اصلی تاریخ ہے۔ اگر اس نظریہ کے بموجب ہندوستان اس بدلتے ہوئے زمانہ میں کسی کا نام پیش کر سکتا ہے تو وہ مہاراجہ آنجہانی ہی تھے۔ مہاراجہ کی تواضع ملنساری، خلق و مروت، عجز و انکسار اور سخاوت و امارت سے قطع نظر کیجئے لیکن اس حقیقت کو کس طرح بھلایا اور مٹایا جا سکتا ہے کہ دورِ مغلیہ کا عظیم الشان تمدنی ورثہ انہی کے ذریعہ ہم تک پہونچا!! عہد گذشتہ اور موجودہ کے درمیان جو گہری خلیج حائل ہے اس پر مہاراجہ کی ذات ہی نے استوار پل تعمیر کیا تھا۔ ماضی اور حال انہی دوراہے پر آملتے تھے۔ دورِ قدیم اور جدید کے درمیان وہ ایک اتصالی کڑی تھے۔ اور کیا اتصالی کڑی کے بغیر کوئی سلسلہ قائم رہ سکتا ہے؟؟

اگر مہاراجہ چلتے پھرتے ہم میں موجود نہیں ہیں تو کیوں نہ ان آثار کو محفوظ کر لیا جائے جو انہوں نے اپنے زمانۂ حیات میں چھوڑے تھے تاکہ اس کڑی کی معنویت گم نہ ہونے پائے!

انفرادی حیثیت سے وہ ان گنت خصوصیات کے حامل تھے ــــــ اچھے خطاط، بہترین مصوّر، پُرگو شاعر اور بلند پایہ نثر نویس ــــــ کسی کے لئے دریا دل سخی تھے تو کسی کے لئے متواضع مہمان ــــــ دوستوں کے غم گسار و ملنسار ــــــ علماء کے ہمدرد و سرپرست ــــــ ماتحتین کے ملجا و ماویٰ ــــــ امراء میں اعلیٰ مراتب و مناصب کے حامل ـ ـ ـ سلطنت کے یمین، رعایا کے غم خوار اور شاہ کے وفادار!! ـ ـ ـ یہ سب کچھ تھے ــــــ لیکن ــــــ لیکن اجتماعی حیثیت سے

"پُرانی بساط کا آخری مہرہ"!!

یہ واقعات اب "قصّے" ضرور بن گئے ہیں لیکن "پارینہ" ابھی نہیں ہوئے ـ ـ دل کے بہلانے کے لئے قصہ ہائے پارینہ کو بھی "گاہے گاہے" دہرانے کی ضرورت اب بھی محسوس کی جاتی ہے ـ پھر ان افسانوں کو، جو کبھی حقایق تھے اور آج بھی افادیت سے خالی نہیں، دماغی تفریح ہی کے لئے سہی کیوں نہ پڑھا جائے ؟ کیا عجب کہ ہمیں ان ہی میں اپنی منزلِ مقصود کا صحیح سراغ مل جائے !!

مادیت کی ہماہمی نے دل و دماغ کی ساری توانائیوں پر قبضہ کر رکھا ہے، زندگی مشینی بن گئی ہے، فرصت کم کام زیادہ ہے، حیات کی رو اس تیزی کے ساتھ جاری ہے کہ پیچھے دیکھنا محال ہے !! ــــــ لیکن اس طرح اس دھارے پر اس تیز رفتاری سے آگے بڑھتے چلا جانا خطرات سے خالی ہے ؟ ــــــ اگر رکنے، دم لینے، اور پلٹنے کی فرصت نہ ہو تو نہ سہی، لیکن پس منظر سے ایسی روشنی پڑنی تو ضروری ہے، جو ہمیں راہ کی آیندہ دشواریوں اور منزل کے بعید خطرات سے آگاہ کر دے ! ــــــ

زمانہ ایک نئی کروٹ بدل رہا ہے، زندگی اور اس کے سارے متعلقات پر نئے زاویہ ہائے نظر سے غور کیا جا رہا ہے ـ قدیم روایات قدیم نظریئے اور قدیم ادارے مٹ رہے ہیں یا مٹائے جا رہے ہیں ــــــ ایسے وقت جبکہ ماضی کا ہر نقش، نقش بر آب تصور کیا جا رہا ہو، ان قدیم نقوش کو، جو

قوموں کی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں محفوظ کرلینا، قومی دولت کو تباہی سے بچانا ہے — نہیں قوم کو ہلاکت سے محفوظ رکھنا ہے۔ — آنجہانی کی ذات انہی نقوش کا مجموعہ تھی اور مجلہ کا یہ نمبر انہی کا مرقع ہے۔

احوالِ واقعی

آگے بڑھنے سے پہلے بعض گزارشات پر غور فرمالیجئے۔ اس نمبر کی ترتیب، طباعت، مضامین کی فراہمی وغیرہ کا سارا بوجھ مجھ پر ہی پڑا اور تعطیلات سرما میں اس کام کا بیشتر حصہ سرانجام پایا۔ ترتیب سے زیادہ مضامین کی فراہمی میں دقت اٹھانی پڑی۔ گرما کی تعطیلات ہی میں مہاراجہ نمبر کے لئے فراہمی مضامین کا کام شروع کردیا گیا تھا۔ مراسلت کے ذریعہ مضمون نگار حضرات کی توجہ دو دو تین تین مرتبہ اس طرف مبذول کرائی گئی۔ برادران جامعہ حال و قدیم سے بھی مضامین لکھنے کی استدعا کی گئی لیکن صدائے برنخاست۔ جب پیہم اصرار اور مسلسل استدعا سے کچھ کام نہ چلا تو شخصی طور پر مداخلت بے جا کا مرتکب ہونا پڑا۔ پھر بھی کچھ روز تک مایوسی رہی۔ بالآخر اس دوران میں شمارہ (۳) کا کام شروع کردیا گیا لیکن مہاراجہ نمبر کے لئے مضامین کی فراہمی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شمارہ سوم کی طباعت ابھی پایۂ تکمیل کو نہ پہونچی تھی کہ موعودہ مضامین وصول ہونے شروع ہوئے۔ یوں تو مجلہ کو سہ ماہی شایع ہونا چاہئے لیکن چند سال سے انتظامی دشواریوں کے باعث مشترکہ شمارہ شایع کرنے کی روایت پڑ گئی ہے۔ اس دفعہ مناسب معلوم ہوا کہ مہاراجہ نمبر بالکلیہ مخصوص رہے اس لئے شمارہ (۳) علیحدہ شایع کردیا گیا۔ اس علیحدہ اشاعت کے سبب بعض برادرانِ جامعہ کو غلط فہمی ہوئی کہ مجلہ کی ضخامت میں کمی کردی گئی ہے۔

اس نمبر میں ایک ہی شخصیت کو مختلف نقاطِ نظر سے دیکھنے والے آپ کو ملیں گے۔ بعضوں نے قریب سے دیکھا ہے اور بعضوں نے کچھ دور سے۔ لیکن قرب و بُعد کے فرق نے انکی نظر کو متاثر نہیں کیا ہے

مہاراجہ قریب سے بھی وہی تھے جو وہ دور سے نظر آتے تھے۔ اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی کے فرمان مبارک کو جو آنجہانی کی وفات پر شرفِ صدور لایا تھا اور حضرت اقدس و اعلیٰ و والسرائے بہادر کے مابین جن پیامات کا تبادلہ عمل میں آیا تھا، مجلہ کے شروع میں شایع کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔

حصۂ نثر کی ابتدا نرسنگ راج بہادر عالی کے مضمون سے ہو رہی ہے۔ کسی شخصیت کے مطالعہ کے قبل اس کی زندگی کی نشوونما سے واقفیت ضروری ہے۔ اس مضمون میں یمین السلطنت کے حالاتِ زندگی تاریخ وار بیان کئے گئے ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب، قائدِ ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر، خواجہ حسن نظامی صاحب، جیسے مشاہیر اہلِ قلم اور آنجہانی سے قریبی تعلق رکھنے والے حضرات کے مضامین شایع ہو رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبد الماجد دریابادی، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور قاضی عبد الغفار صاحب جیسے مایۂ ناز ادیبوں کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ان مضامین کے متعلق ؏ "خامہ انگشت بہ دنداں کہ انہیں کیا لکھئے"

طلبا، جدید کے چار انعامی مضامین شایع کئے جا رہے ہیں ان کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ عثمانین کا قلم سیرت نگاری کے میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ فن سیرت نگاری کے مغربی معیار پر خواہ کسی کے خیال میں، یہ مضامین پورے نہ اتریں لیکن ان کی اس طالب علمانہ مساعی کی داد ہر شخص دیگا۔ مضامین کی جانچ ممتحنین کے ایک بورڈ کے سپرد تھی۔ جس میں پروفیسر سید محی الدین صاحب قادری زور، پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی، پروفیسر عبد القادر صاحب سروری شریک تھے۔ بورڈ کے فیصلہ کے مطابق محمد بن علی صاحب باذہاب متعلم سال چہارم، محمد مصلح الدین صاحب متعلم سال دوم (کلیہ طب) شیخ رحیم الدین صاحب کمال متعلم سال اول انعامات کے مستحق قرار پائے۔ ہم ان برادران جامعہ کو مبارکباد دیتے ہیں اور اراکین بورڈ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم عالیجناب نائب معین امیر جامعہ کے ممنون ہیں کہ آپ نے اپنی جانب سے دو انعامات عنایت فرمائے۔ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی نے بھی ایک انعام عطا فرمایا۔ ہم موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

حصۂ نظم کی ابتدا، آنجہانی کی ایک رباعی اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کی ایک نظم سے کی جا رہی ہے

شاعر مشرق نے اپنی تمام عمر میں اگر کسی امیر کی مدح سرائی فرمائی ہے تو وہ آنجہانی ہی تھے۔ اردو زبان میں جب تک اقبال اور کلام اقبال زندہ ہیں شاؔد کا نام بھی باقی رہے گا۔ مسعود علی صاحب محویؔ علامہ نواب ضیا، یار جنگ بہادر اور علامہ عبداللہ العمادی نے ہماری استدعا پر مہاراجہ سے متعلق اپنا بلند پایہ کلام عنایت فرمایا ہم ان بزرگوں کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہم مشکور ہیں کہ ملک کے دیگر شعرا حضرت فانیؔ علی اخترؔ، ماہرؔ اور برادران جامعہ میں سے وجدؔ، اور باقیؔ نے اپنی نظمیں روانہ فرمائیں۔

مہاراجہ نمبر کی تیاری اور خصوصی مضامین کے لئے مجھے بطور خاص شکریہ ادا کرنا ہے قائد ملت نواب بہادر یار جنگ بہادر نے اپنی گوناگوں کثیر ملکی و ملی مصروفیتوں کے باوجود میری استدعا کو درخور اعتنا سمجھا اور ایسی حالت میں اپنا مضمون لکھوایا جب کہ بخار تھا، طبیعت خراب تھی ٹیلیفون پر ٹیلیفون آرہے تھے اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ آپ نے ان طلباء کو بھی اپنی معلومات سے مستفید فرمایا جو انعامی مقابلہ مضمون نگاری میں شریک ہو رہے تھے۔ نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے نہ صرف مضمون عنایت کیا بلکہ اپنے پاس سے آنجہانی کی قلمی مصوری و خطاطی کے نمونے بھی دیئے جو اس شمارہ میں شایع ہو رہے ہیں۔ اور مضمون نگار طلباء کو بھی سہولتیں بہم پہونچائیں۔ مولوی محمد بیگ صاحب ناظم اسٹیٹ و مولوی سید علی رضا حسینی صاحب مددگار ناظم نے مجلہ کی تیاری میں ہر ممکنہ سہولت بہم پہونچائی۔ ہم ان حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اختتامیہ

یہ افتتاحیہ اختتامیہ بھی ہے۔ اپنے زمانۂ ادارت میں ہم نے ایک مشترکہ شمارہ اور دو علیحدہ شمارے شایع کئے۔ ستایش کی تمنا نہ پہلے تھی نہ اب ہے۔ خدمت ہی ہمارا صلہ ہے اور ضمیر کا اطمینان ہمارا انعام! ادارت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوتے ہوئے آخری مرتبہ برادران جامعہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اپنے رفقاء کار کا ممنون ہوں فقط۔

احمد خاں
ایڈیٹر

[illegible] سے مضمون بھیجا تو آپ نے یہ قطعہ عنایت فرمایا۔
ایڈیٹر

قطعہ

صدر اعظم گذشت شاد ز عمر تلخ
نیکی او دو جہان را بہ سرشت

سال این غم سروش غیب دان
گفت
جان سلطان سرکشن پرشاد
۱۴ ۱۳

محمد اقبال
لاہور

رباعی

از

ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

الحمد کہ مسلمست و ہمیں ایمانم
احوال دگر ز مذہب و ملت دانم
تعیین بود مرا کہ ایمانم شاد
کافر نشود گو مرا ہست زبانم

"حضرتِ شاد اب کہاں عالی"

میں نے ایک مرثیہ لکھا ہے جس کا یہ مضمون ہے۔ اور جو زیر طبع ہے ایک ایسی عظیم الشان ہستی کا ذکر خیر کرنا اور ضبط تحریر میں لانا مشکل اور سخت مشکل ہے، جس کے لئے ہزاروں کیا لاکھوں انسانوں نے آنسو بہائے ہیں اور جس کی یاد ابھی تک ہر دل کو بے چین کئے ہوئے ہے۔ میرے قلم میں کہاں یہ طاقت ہے کہ وہ لکھتے ہوئے لرز نہ جائے میرے دل میں کہاں یہ ہمت ہے کہ میں اپنے اس محسن بزرگ عنایت فرما کے حالات خاطر خواہ لکھ سکوں۔ عالیجناب سر مہاراجہ بہادر کے تعزیتی جلسے ہر طبقہ ہر فرقہ میں ہوئے اور میں یاد کیا گیا۔ مگر میری ہمت نہ پڑی کہ میں دو کلمہ بھی اس سانحۂ عظیم اور داغ مفارقت دائمی سے متاثر ہونے کے بعد زبان سے نکالتا۔ میں نے معافی مانگی اور اس دلخراش و روح فرسا فرض کی ادائی سے قاصر رہا۔ عالیجناب سر مہاراجہ آنجہانی کو نہ معلوم مجھ سے کیوں اتنی محبت تھی کہ وہ مجھے اپنا عزیز ترین خیال فرماتے اور ہمیشہ مشفق و محب کے لقب سے افتخار بخشتے تھے۔ مجھے گھنٹوں ہم کلامی اور ہم نشینی کی عزت حاصل رہی ہے۔ میں انتہائے فخر کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میرا جتنا وقت مرحوم کی پر لطف اور امیرانہ صحبت میں صرف ہوا ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے کو میسر ہوا ہو۔ ہر دعوت تقریب اور خوشی کے موقعہ پر مجھے ہمراہ رکھا ہر تعزیت بیماری اور تکلیف میں نزدیکی کا شرف بخشا۔ بہر حال میں اور میرے مرحوم بھائی محبوب راج محبوب کو یہ طرۂ امتیاز حاصل رہا۔ ان وسیع تعلقات کی وجہ اکثر ناواقف اشخاص مجھے مہاراج مرحوم و مغفور کا قرابت دار تصور فرماتے اور قرابت کی صراحت چاہتے۔ مجھ سے نہ کوئی رشتہ داری تھی نہ کوئی قرابت

البتہ محبت کا وہ مضبوط رشتہ غیر متزلزل اور مستحکم ہوگیا تھا جو ٹوٹ نہیں سکتا تھا اور جس کو دنیا کی کوئی قوی سے قوی طاقت بھی مٹا نہیں سکتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ واجب التعظیم مہاراج کے خاندان سے مجھے تین پشتوں سے لحاظِ خدمات جدّی و مادری تعلق رہا ہے اور سب سے بڑھکر خصوصیت یہ رہی ہے کہ میرے پرنانا رائے عالمچند متوفی کو معتمدی پیشکاری کا ساٹھ سال تک خاص امتیاز حاصل رہا۔ اُنہوں نے مہاراجہ نرنید ربیکنٹھ باشی کے لئے اپنے ناچیز خدمات کو ایسے زمانہ میں پیش کیا جبکہ ناموافق حالاتِ زمانہ نے مہاراجہ ممدوح کو نہایت بددل اور مایوس کردیا تھا اس کے صلہ میں جن خدمات کا اعتراف مہاراجہ ممدوح بیکنٹھ باشی نے فرمایا اور ایسی پرعظمت قدر فرمائی جو آجتک تازہ اور باقی ہے۔ اسی طرح میرے والد مرحوم راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی کو اس خاندان سے اتنی عقیدت اور محبت تھی کہ بعد انتقال مہاراجہ نرنید ربیکنٹھ باشی یہ ہمیشہ اپنے آقائے ولی نعمت سے اپنے محسن مہاراج نرنیدر کے جانشین مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنۃ آنجہانی کے لئے عرض کرتے اور ہر وقت ان کی خدمت اپنا فرض عین سمجھتے رہے ایسے متعدد عنایت نامہ ابھی تک راقم کے یہاں موجود ہیں جو غیر معمولی خاندانی تعلقات کے شاہد ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہی موروثی محبت اور عقیدت مجھے بھی نصیب ہوئی کہ میں مہاراجہ آنجہانی کے تلطفات بیکراں اور عنایات دلی کا مورد رہا۔ میں بخوف طوالت یہاں اُن گذشتہ واقعات سے صرفِ نظر کرتا ہوں اب اس پاکیزہ صفات بزرگ کے حالات زندگی آپ کو سناتا ہوں جس کے لئے مجھ سے فرمائش کی گئی ہے۔ قبل از آغاز مضمون میں یہ عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ ممدوح میں اس قدر خوبیاں جمع تھیں کہ ان میں سے ایک ایک کو گنایا جائے اور اس کی وضاحت کیجائے تو صرف ایک ہی اس مضمون کی جگہ بآسانی لے سکے گا اور اس کے بعد بھی تکمیل نہ ہوسکیگی۔

حالاتِ زندگی

آپ راجہ ہرکیشن سررشتہ دار محکمہ نظم جمعیت کے فرزند اور مہاراجہ نریندر بہادر پیشکار دو ا المہام سرکار عالی کے حقیقی نواسے تھے۔ مہاراجہ نریندر مہاراجہ چندو لال کے نبیرہ تھے مہاراجہ نریندر کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ "وہ تین کروڑ کے پتلے تھے" ایک کروڑ تعلیم ایک کروڑ زنار بندی اور ایک کروڑ آپ کی شادی میں مہاراجہ چندو لال نے صرف فرمائے تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی ۱۸ شعبان المعظم ۱۲۸۰ سنہ ہجری مطابق ۱۷ اسفندار ۱۲۷۳ ف کو پیدا ہوئے۔

"فرزند فرخندہ"

۱۲۸۰ سنہ ہجری

آپ کی تاریخ ولادت ہے۔ بچپن سے آپ ذکی اور خوردار تھے آپ کو اپنے والد کے گھر رہنے کا کم موقعہ ملا۔ نانا کے چہیتے آنکھوں کے تارے تھے۔ مہاراجہ نریندر بہادر کو اولاد نرینہ نہ ہونے سے آپ نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو ہمیشہ اپنے پاس رکھا، تعلیم دلائی اور ایسے معقول اساتذہ مقرر کئے کہ جو آپ کو فارسی، عربی، فقہ، تفسیر، منطق اور فلسفہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دے سکیں۔ آپ کو پڑھنے کا ازحد شوق تھا۔ آپ کے اوقات صبح سے شام تک قابل ترین اساتذہ کی فیضِ صحبت میں گذرتے۔ آپ کو جسمانی ورزش پھیک پٹہ، بنوٹ وغیرہ سکھلانے کے لئے بھی ممتاز اشخاص مقرر کئے گئے تھے۔ آپ کی کمسنی میں بعمر تیرہ سال آپ کی والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ تھا۔ آپ کے والد راجہ ہرکیشن نے بھی ۲۹ رجب ۱۳۰۲ سنہ ہجری میں انتقال فرمایا۔ جس کا آپ کو بہت ملال تھا۔ آپ ماں کی محبت کو یاد کرکے اکثر آبدیدہ اور ملول ہوتے تھے۔ خصوصاً اس واقعہ کا

بطور خاص اظہار فرماتے تھے کہ ایک دفعہ آپ کو کثرت سے چیچک نکل آئیں زیست کی امید نہ تھی آپ نے چہرہ کو کہا کہ اس قدر بگاڑ لیا تھا کہ چیچک کے بہت سے داغ پڑ گئے تھے۔ ایک روز آپ کی والدہ صاحبہ نے آپ کو گود میں لیکر بارگاہِ الٰہی میں نہایت منت و زاری کے ساتھ دعا کی کہ اے میرے رحیم وکریم مالک اس لڑکے کے چہرے کو بے داغ بنا دے۔ آپ فرماتے تھے کہ ایک سال کے اندر آپ کا چہرہ بالکل صاف ہو گیا۔ آپ نے تعلیم حاصل کرکے اپنے نانا مہاراجہ نریندر بہادر بیکنٹھ باشی کی ہمراہی میں امراء اور دیگر معززین کے مجلس ومحفل میں اکثر شرکت فرمائی۔ چنانچہ نواب سہالار جنگ اول کے یہاں و نیز درباروں میں آپ کی شرکت ہمیشہ ہوتی رہی چنانچہ دربار شاہانہ کی حاضری اور مجالس امرا کی کم عمری سے شرکت نے تو آپ کو تہذیب اور آداب کا ایک کمل نمونہ بنا دیا۔ مہاراجہ نریندر بیکنٹھ باشی کی زندگی میں اور اس کے بعد آپ کے بعض امراء جو جانشینی مہاراجہ نریندر مرحوم کا خواب دیکھ رہے تھے اور جس کی تعبیر ان کے حق میں ناموافق اور مضر ثابت ہو رہی تھی آپ سے بظاہر نہیں بلکہ دل ہی دل میں بغض وحسد رکھتے تھے اور دیگر ممکنہ ذرائع سے آپ کے پیمانہ زندگی کو قبل از وقت ختم کرنیکی ناکام کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ آپ پر آگ ڈالی گئی آپ نہ جلے آپ کو کھانے میں زہر دیا گیا۔ آپ کی نانی صاحبہ نے عین وقت پر غذا کا رنگ دیکھکر شبہ فرمایا اور آپ بچ گئے۔ آپ پر فیر کیا گیا، نشانہ خطا کر گیا۔ بہرحال تقدیر نے آپ کا ہمیشہ ساتھ دیا قدرت کا غیبی ہاتھ ہمیشہ آپ کو بچا رہا تھا۔ بقول ہندی شاعر کے۔

"جا کو راکھے سائیاں مار نہ سکے کوئے"

(ترجمہ) جس کو خدا رکھنا چاہے اس کو کون مار سکتا ہے

قدرت کو اس ہستی سے آفات اور بلیات سے بچا کر بہت سے کام لینے تھے وہ کیسے مرنے دیتی۔ زندہ رکھا اور صحت وعافیت کی زندگی بخشی۔ آپ اپنے نانا کی حیات ہی میں بتاریخ ۶ ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ ہجری خطاب راجہ بہادر سے سرفراز ہوئے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام آں جو نیر امراء۔ جاگیردار منصبدار اعلیٰ عہدہ داروں سے آپ کی ملاقاتیں اور تعلقات رہے جو ایوان پیشکاری

سے تعلق رکھتے تھے اور کم وبیش حاضر ہوتے تھے اس کے علاوہ متعدد عالم فاضل افراد شعراء اور حکماء سے روز کی ملاقاتیں رہتیں۔ آخر ۱۲ رمضان ۱۳۱۸ھ ہجری کی تاریخ آئی جس روز مہاراجہ نریندر نے تین چار روز کی مختصر علالت کے بعد رحلت فرمائی۔ آپ کے لئے یہ دن سخت مصیبت کا دن تھا۔ باوجودیکہ مہاراجہ نریندر کنھیا ہاشمی نے سرکار و نیز دیگر امراء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کو اپنا جانشین وارث جائز قرار دیدیا تھا۔ مگر بعض دشمنوں کی کوششوں اور ان میں چند مقتدر اشخاص کی تائید نے اس مسئلہ کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا تھا کہ حسب رسم ورواج ہنود مہاراجہ آنجہانی کو بروز تجہیز وتکفین آگ دینے سے روکنے کی کوششیں کی گئیں۔ اور اعلیٰ ترین حکام سے عین وقت پر خلاف حکم حاصل کیا گیا۔ مگر "آنچہ تقدیر بہم میرسد" کے مصداق دیر ہونے اور اکثر معززین کی رائے سے میت اٹھائی گئی۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے کفن باندھا اور رواج خاندانی کے موافق آگ دی۔ مہاراجہ نریندر بہادر کے انتقال کے بعد سے آپ کا پُر راحت دور زندگی رنج وپریشانیوں میں مبدل ہوگیا۔ آپ کا سکون جاتا رہا بیفکری نے ساتھ چھوڑا۔ بہرصورت آپ کے یہ چار سال بہت کٹھن گزرے بہت سی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ بلا کے علوہمت اور مستقل مزاج تھے۔ آپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری ہمیشہ مالک حقیقی کا بھروسہ رکھتے ہوئے اپنے مالک مجازی کی رضاجوئی میں لگے رہے اُن کا کوئی یار ومددگار نہ تھا۔ مصیبتیں یکے بعد دیگرے گن گن کر آئیں۔ دوست دشمن اپنے پرائے بنگئے۔ اُنہیں اس کی پروانہ ہوئی۔ نہ ہمت کو ہاتھ سے جانے دیا۔ اسی عادت کے لحاظ سے آپ اس زمانہ میں بھی کاملین اور اہل دل بزرگوں کی خدمت فرماتے۔ آپ کو دنیا کے کسی رشتہ اور تعلق سے جب تسکین کی صورت نظر نہ آئی تو اس تعلق اور رشتہ نے آپ کے بیٹھے ہوئے دل کو بہت اُبھارا۔ آپ کو ان مقدس واجب التعظیم ہستیوں سے بعض ایسے سبق ملے جو آپ کو عمر کے آخری دن تک فراموش نہ ہوئے۔ ان ہی شاہدات اور تجربات نے آپ کو ان کا اتنا معتقد بنا دیا تھا۔ کہ آپ اس کے خلاف کبھی کسی کی نہ سنتے۔ سنتے بھی تو مطلق اس پر اعتبار نہ فرماتے اور رتی برابر اپنے خیال اور عقیدہ سے نہ ہٹتے۔ چنانچہ اسی کے یہ اثرات تھے کہ آپ نے بزرگوں کے اقوال پر عمر بھر بھروسہ کیا اس چار سالہ دور نے

آپ کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کیا اور آپ کو مکمل انسان بنایا۔ آپ مصیبت نہ اُٹھاتے تو دوسرے مصیبت زدوں کے دُکھ درد میں کیسے حصہ لے سکتے۔ انسان مصیبت اور تکالیف کے بغیر کبھی تکمیل زندگی نہیں کر سکتا۔ عاشقانِ خدا ایسی مصیبت میں زندگی کا مزہ لیتے اور اُس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اُن کو راحت زہر اور مصیبت آبِ حیات معلوم ہوتی ہے۔ یہ راحت کو عارضی نقصان رساں اور خدا سے بچھڑانے والا سمجھتے ہیں اور اُس کو کوستے ہیں اُنہی کی زبان سے سنئے۔

سکھ کے ماتھے سِل پڑو جب پردے سے جائے　بلہاری وا دُکھ کے جو چھن چھن نام جپائے

ترجمہ

راحت کے سر پہ سِل گرے اور یہ سب دلوں سے کافور ہو جائے

ہم اس مصیبت پر قربان جاتے ہیں جو ہر لحظہ یادِ الٰہی کا باعث بنے

مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی پر اُسی زمانہ میں تصوف کا بیش بہا رنگ جمنے لگا۔ کہ جس کے بعد تنگ نظری اور تعصب کا رنگ نہ چڑھ سکا آپ کے مندرجہ ذیل اشعار اِس کے شاہد ہیں۔ ؎

خدا را اگر بدانی خالقِ کُل　بود توحید خالق را سزاوار

دگر صوفی صفت گوئی ہمہ اوست　ہمہ مخلوق را یک نفس پندار

حباب و موج را ماند دو عالم　وجودِ حق بود چون بحرِ ذخار

حباب و موج از دریا جدا نیست　تو کثرت را نشانِ وحدت انگار

ز وحدت میشود کثرت نمایان　ز کثرت میشود وحدت نمودار

پریشانیوں کا یہ دَور ۲ رجب ۱۳۰۱ھ ہجری کو ختم ہوا اور آپ کے آقا محبوب جہان حضرت غفران مکان علیہ الرحمہ نے اپنی قدر پرور ذرہ نواز نظر سے آپ کو موروثی خدمت پیشکاری سے سرفراز فرمایا اور خلعت عطا فرمائی۔ اب آپ کی غیر معمولی قابلیت نے جہاں اپنے مالک کے دل میں جگہ کر لی تھی وہاں آپ کی وفاشعاری رضاجوئی منکسر المزاجی بہی خواہی اور جاں نثاری کے اوصاف نے

ایک ایسا درجہ حاصل کرلیا تھا کہ جس کے مماثل کوئی اور ہستی امرا میں پیش نظر ملک و مالک نہ تھی آپ صدر المہام فوج اور وزیر افواج کے خدمت جلیلہ سے ۱۵ اسفندار ۱۳۰۲ف کو سرفراز فرمائے گئے ۲۰ مہر ۱۳۱۱ف تک آپ نے اس خدمت کو انجام دیا اس کے بعد ذمہ دارانہ و اہم ترین خدمت مدار المہامی ۱۰ جمادی الاول ۱۳۱۹ھ کو آپ کے سپرد کی گئی آپ کے مورث اعلیٰ مہاراجہ چندو لال اور راجہ رام بخش جیسے ممتاز اور مشہور ہستیوں کو اس خدمت کی انجام دہی کا سالہا سال فخر رہا اور جنگی سندیں آج تک ریاست کے بڑے بڑے خاندانوں کے لئے ماحصل و مدار زندگی بنی ہوئی ہیں زمانہ مدار المہامی میں آپ نے ہمیشہ اپنے مالک کی رضا جوئی کو شہرت اور عزت پر برتری دی اور اسی لئے آپ کی خدمات بیحد پسندیدہ اور مقبول پیشگاہ سلطانی ہوئیں۔ آپ اس خدمت جلیلہ پر ۲۵ رجب ۱۳۳۰ھ ہجری تک مامور رہے اور خود مستعفی ہوئے۔ آپ کے خطابات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

راجہ بہادر	۶ ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ ہجری	موقعہ دربار سالگرہ مبارک
راجہ راجایان	۲۷ 〃 〃 ۱۳۱۱ھ 〃	〃 〃 〃
یمین السلطنتہ	موقعہ جشن جوبلی	حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ
کے۔ سی۔ آئی۔ ای	۲ شوال ۱۳۲۵ھ ہجری	از سرکار عظمت مدار
جی۔ سی۔ آئی۔ ای	۱۰ شعبان ۱۳۲۸ھ 〃	〃
بھارت بھوشن	از بھارت دھرم مہامنڈل بنارس	
ال۔ ال۔ ڈی	از عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۳۵ء عیسوی	

آپ پہلے مدار المہام گذرے ہیں جن کی مدار المہامی میں نواب وایسرائے لارڈ کرزن بہادر نے بمعیت حضرت غفران مکان علیہ الرحمتہ آپ کے دیوڑھی میں سال ۱۳۲۰ھ ہجری میں محرم کی پانچویں تاریخ کا لنگر ملاحظہ فرمایا خدمت مدار المہامی سے ہٹنے کے بعد آپ نے پنجاب۔ دہلی۔ بمبئی۔ اجمیر شریف وغیرہ کا طویل سفر فرمایا گئے اور اپنا وقت مصروفیت میں ہی گذارا۔ آپ کو

ریاضت حبس دم اذکار اور اشغال کا شوق پہلے سے ہی تھا آپ نے زمانہ مدار المہامی کے قبل اسمیں اچھا ملکہ حاصل فرمایا تھا۔ مگر گران بار خدمت نے اس کو خاطر خواہ جاری نہ رہنے دیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر ان اشغال کو جاری رکھا۔ شعر و سخن کے تذکرے تازہ فرمائے علمی و ادبی محفلیں آراستہ ہونے لگیں علما، فضلا، شعرا اور کاملین کی ملاقاتوں میں اذکار علمی و روحانی سے سیر کام ہوتے رہے۔ آپ کے اوقات کبھی بیکاری میں نہ گذرے اس زمانہ میں آپ کو پینٹنگ کا قدیم شوق یاد آیا اس میں بہت دلچسپی لی۔ اور اس طرح بقیہ اوقات دلچسپی سے گذارے۔ آپ کو حضرت غفران مکان علیہ الرحمہ کے انتقال کا اس قدر دلی صدمہ تھا کہ آخر عمر تک جب کبھی ان کا ذکر آتا تو ان کی خبر گیری اور کمال عنایات کی یاد سے اس قدر روتے کہ ہچکیاں لگ جاتیں کئی رومال تر ہو جاتے اور طبیعت بالکل بے قابو ہو جاتی۔ آپ نے اس سانحہ عظیم کے بعد اپنی دیوڑھی میں دیوالی کی روشنی موقوف فرما دی۔ اپنے آقا و ولی نعمت حضرت پیر و مرشد بندگانعالی متعالی کی درازی عمر و اقبال کے لئے ہر وقت نہایت خلوص سے دست بدعا رہتے اور آپ ہمیشہ فرماتے کہ خدا اس بابرکات وجود مغتنم ذات کو دیرگاہ سلامت رکھے کہ اب ہم قدیموں کی لاج انہی کے ہاتھ ہے اور انہی کے قدوم میمنت لزوم ہماری زندگیوں کا سہارا ہیں۔ اسی مستحکم عقیدت کا نتیجہ تھا کہ پھر مہاراجہ ممدوح کو مالک کی بالغ اور حکیمانہ نظر نے ملک دکن کی صدارت عظمیٰ کے لئے منتخب فرمایا اور پھر بتاریخ ۱۰ جمادی الاول ۱۳۴۵ھ ہجری کو اس خدمت سے ممتاز فرمائے گئے۔ اس کی مسرت میں متعدد جلسے ہوئے اور ملک کے گوشہ گوشہ میں اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ آپ کے صاحب اقبال ہونیکی یہہ بڑی دلیل تھی کہ آپ کا ہر زمانہ مقبول رہا۔ آپ کے اخلاق نے علم نے برتاو محبت نے خیرات و داد و دہش نے حیدرآباد ہی کو آپ کا فدائی نہیں بنایا تھا بلکہ تمام ہندوستان اور انگلستان کی معزز ممتاز ہستیاں آپ کی شیدائی تھیں اکثر وائسرائے، گورنرس، کمانڈران چیف دیگر یورپین عہدہ داران اور ان کی لیڈیوں کے خطوط میں نے دیکھے اور سنے ہیں کہ وہ کن بلیغ اور پرشوکت الفاظ میں آپ کی تواضع اور مدارات کا ہر سال بزمانہ کرسمس خیر مقدم کرتے ہیں۔

اس سے آپ کی غیر معمولی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے اُن میں سے اکثر نے تو انتہائی محبت و خلوص کیساتھ بار بار اِسکا اعادہ کیا ہے کہ "آپ ہمیں کبھی ایسا موقعہ عطا کریں کہ ہم آپ کو اپنا مہمان بناکر اپنی دلی آرزو پوری کریں"

آپکی وزارت کا دور تخمیناً دس سال رہا اور پھر صدارت عظمیٰ کا عہد بھی تخمیناً گیارہ سال کے قریب رہا۔ اس میں متعدد اصلاحی کام انجام پائے۔ آپ ہی نے نواب مہدی نواز جنگ بہادر کا معتمدی باب حکومت پر انتخاب فرمایا جنھوں نے اس ذمہ دارانہ کام کو نہایت خوش اسلوبی اور دیانتداری سے انجام دیا۔ آپ کا وہی قدیم خیرخوانہ وطیرہ اس دور میں بھی بنظر وقعت و استحسان دیکھا گیا اور اپنے مالک کی غیر متزلزل وفاداری اور اہل ملک کی دلی محبت اور ہمدردی کا آپ نے متعدد دفعہ ثبوت دیا۔ آپ حق رسی کے معاملہ میں اس قدر مستقل مزاج تھے کہ کبھی اپنے کسی عزیز یا قرابت دار کو بھی غیر پر ترجیح نہ دی باکثر موقعوں پر ان کو ناکام اور مایوس ہونا پڑا۔ آپ کے خدمات مدار المہامی اور صدارتِ عظمیٰ کے دو واقعات قابلِ توجہ ہیں ایک تو یہ کہ نواب سرو قارالامراء سے آپ نے مدار المہامی کا جائزہ حاصل فرمایا تھا اور پھر انہی کے صاحبزادے نواب ولی الدولہ بہادر سے صدارت عظمیٰ کا جائزہ لیا اسی طرح حضرت غفران مکان علیہ الرحمہ کی جشن جوبلی میں بحیثیت مدار المہام ملک کیجانب سے اڈریس گذرانا اور پھر حضرت بندگانعالی متعالی کے جشن سیمین کے موقعہ پر بحیثیت صدر اعظم اڈریس پڑھنے اور گذرانے کا شرف حاصل فرمایا۔ یہ فخر شکل سے کسی مدار المہام یا صدر اعظم کو نصیب ہوا کہ دو عہد حکومتوں میں مہاراجہ بہادر کی کارگذاری مقبول اور پسندیدہ رہی اور مرتے دم تک ملک اور مالک کی نظر میں سچے وفادار جان نثار اور بہی خواہ ملک ثابت ہوئے خدمت پیشکاری ۱۲۲۱ھ ہجری سے تاریخ انتقال سر مہاراجہ بہادر یعنے ۱۳۵۹ھ ہجری تک آپ کے گھر رہی اور اس موروثی خدمت کا یہ رتبہ اور درجہ حضرت بندگانعالی متعالی نے قائم فرمایا کہ دوسرے صدر اعظم بہادر کے دور میں بھی ہر دربار میں سر یمین السلطنت مہاراجہ بہادر کی کرسی سب سے پہلی رہی آپ کے اسٹیٹ کی آمدنی تخمیناً دس لاکھ تھی جو کسی والئی اسٹیٹ پیشکاری کے زمانہ میں نہ پہونچی تھی انتظام اسٹیٹ اور ادائی قرض کا معقول بندوبست تھا۔ تیس چالیس لاکھ کا قرض آپ ہی کے زمانہ میں ادا ہوا آپ کے معتمد

گنڈے راؤ صاحب نے نہایت دیانت سے اسٹیٹ کا کام انجام دیا آپ ان سے بہت خوش تھے۔

آپ ملک کے ہر خاندان سے واقف تھے اور ہر ایک سے ان کے لحاظ سے ملاقات فرماتے تھے۔ آپ ان کے امرا اور ان کے صاحبزادوں کو موٹر تک جا کر لیتے اور پہونچاتے تھے۔ آپ حکیم تھے حکمت سیکھی تھی ہزہا نہ پنساری مطب فرمایا کرتے تھے آپ علم رمل اور جوتش کے ماہر تھے۔ اکثر صحیح احکام لگاتے تھے۔ جن کا مجھے کافی ذاتی تجربہ ہے بلدہ کے متعدد معزز اصحاب بھی اس سے واقف ہیں آپ بیپاہیانہ جوہر سے متصف تھے۔ شکار اچھا کرتے تھے تلوار بنوٹ وغیرہ کے خوب ماہر تھے۔ آپ نے برسوں تک باضابطہ ورزش کی تھی۔ آپ کو فن مصوری، نقاشی، عطر سازی میں کمال تھا۔ فتنہ شاد آپ ہی کی ایجاد ہے۔ آپ کو موسیقی میں اچھا دخل تھا۔ آپ نے اس کو باضابطہ سیکھا تھا۔ ستار ہارمونیم وغیرہ آپ کے خاص مذاق کی چیز تھی۔ آپ کھانے اور کھلانے کے بڑے شایق تھے۔ اکثر دفعہ آپ نے مجھے اور اپنے دیگر دوستوں کو بعض نایاب کھانے پکا کر کھلائے ہیں۔ عالموں مشائخوں اور بزرگوں کے آپ شیدائی تھے۔ شعرا کی عزت آپ کے دربار میں خاص تھی۔ آپ کے یہاں کے مشاعرے بڑے اہتمام سے ہوا کرتے تھے۔ ان میں امرا معززین اور قابل حضرات شرکت فرماتے تھے۔ اب ان شاعروں کی نظیر ملنی مشکل ہے پرانے زمانہ میں بارہ دری مہاراجہ چندو لال کے مشاعرے ابھی تک زبان زد خاص و عام ہیں جہاں آپ ہی کے نانا مہاراجہ چندو لال بیکنٹھ باشی کے زمانہ میں حضرت ناسخ وغیرہ بڑے بڑے استاد تشریف لاتے تھے اس زمانہ میں بھی ہندوستان کے بڑے بڑے مشہور اور نامور اصحاب نے آپ کے در دولت سے اپنی دلی مرادیں حاصل کی تھیں اس فہرست میں حضرت ترکی، داغ، ظہیر، کامل، اختر، حضرت استاد جلیل، ضیا، ثاقب محوی، فانی، ماہر، جوش، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا شرر، مولانا ظفر علی خان صاحب وغیرہ متعدد اصحاب کے نام نامی شریک ہیں۔

آپ جوانی میں حسن پرست تھے اور اس عمر میں بھی حسین صورت دیکھ کر صانع حقیقی کی صفت کی ثنا فرماتے تھے۔ آپ قدر دانِ فن تھے ہر صاحب کمال کی عزت اور امداد فرماتے تھے آپ کا

سینہ بے کینہ تھا۔ آپ دشمنوں سے بھی محبت سے پیش آتے تھے اور ہر مذہب و ملت کی عزت فرماتے تھے کس کے خلاف کچھ کہنا اور جس سے ایک دفعہ راہ و رسم قایم فرمائی اس کے خلاف عمل آپ کی شان وضعداری کے بالکل منافی تھا اس عمر میں آپ کی زندہ دلی قابل تقلید تھی آپ نے کبھی یاس و حزن کو نزدیک پھٹکنے نہ دیا۔ آپ دوستوں کی محبت سے بیحد مسرور ہوتے اور ان کی ہر وقت امداد فرماکر تسکین پاتے آپ کسی کا کام نکالنے کے لئے زبانی یا تحریری سفارش سے کبھی عار نہ فرماتے اور اپنی ذات سے سرکاری جو امداد بھی دیجا سکتی بخوشی دیتے۔ آپ کے یہاں متعدد دفعہ حضرت غفران مکان علیہ الرحمۃ اور اعلیحضرت بندگانعالی رونق افروز ہوتے اور مکارم شاہانہ کا ایسا اظہار فرمایا گیا جو کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ ملک آپ کا فدائی تھا جہاں کہیں بڑے بڑے جشن یا تقاریب میں آپ شریک ہوتے تو اظہار مسرت اور خیر مقدم میں پبلک سلام کرتی اور تالیاں بجاتی جہاں جہاں آپ کی سواری جاتی وہ تالیوں کی گونج سے گذرتی۔ آپ حیدرآباد میں اس وجہ سے مشہور تھے کہ امراء میں آپ سے کوئی بڑا سخی داتا نہیں تھا۔ دیوڑہی یا ایوال سے دفتر باب حکومت تک یا جہاں بھی آپ کی سواری جاتی دو رویہ مانگنے والوں کی قطاریں کھڑی رہتیں اور آپ کا دست کرم مصروف بہ خیرات رہتا۔ آپ پولیس سرکارعالی و انگریزی کے جوانوں کو بروقت انعام دیتے اور آپ کے موٹر چلانے والے کو تاکید تھی کہ وہ موٹر کو اس رفتار سے چلائے کہ لینے والوں کو زحمت نہ ہو۔ آپ کے موٹر کے پیچھے دوسری موٹر کا چلنا دشوار تھا۔ فقراء کے ہجوم کی وجہ سے رات میں بارہ ایک بجے بھی مانگنے والے حاضر رہتے اور سیکڑوں کی تعداد میں مستفید ہوتے برطانوی ہند مثلاً بنگلور۔ دہلی۔ کلکتہ میں بھی یہی حال تھا۔ آپ کا نام بچوں جوانوں بڈھوں کے زبانوں پر تھا اور سوائے دعائے خیر کوئی کلمہ سنائی نہ دیتا تھا۔ آپ کی سواری آنے کی خبر سیٹیوں۔ سے ہوجاتی تھی۔ اس کے سنتے ہی گلی کوچوں۔ ہوٹلوں اور چاءخوانوں تعمیرات کے مزدوروں اکثر کم معاش سیکل سواروں اور پیادہ پا اشخاص جمع ہوجاتے اور آپ کی موٹر تک پہنچنے کے لئے کشمکش کرتے۔ یہ ایک عجیب سماں ہوتا۔ آپ ہر غریب کی فریاد سنتے

اور اس کی درخواست بغور دیکھکر ملتفت ہوتے آپ کو امداد و اعانت کا دلی شوق تھا۔ آپ جسقدر زیادہ کسی کو دیتے اتنا ہی خوش اور مسرور ہوتے۔ آپ اپنی داد و دہش کو ظاہر کرنا نہ چاہتے تھے نہ کبھی اس پر ناز فرماتے۔ آپ اپنے واجب التعظیم نانا مہاراجہ چندولال کے نقش قدم پر چلتے مہاراجہ چندولال نے لاکھوں روپیہ تقسیم فرمائے مگر سر نیچا کئے ہوئے۔

کبھی اوپر نہیں دیکھا نہ جس کو دیا اس کی صورت دیکھی کسی نے مہاراجہ سے دریافت کیا کہ دیتے ہوئے آپ کیوں نیچے دیکھتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میں اس لئے شرماتا ہوں کہ جتنا مجھے دینا چاہیئے ہیں نہیں دیسکتا۔ یہی حال مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی کا تھا آپ نے کبھی اپنی داد و دہش کا ذکر یا اعادہ کسی سے نہیں فرمایا۔

آپ اتنے رقیق القلب تھے کہ مرضی اور طبیعت کے خلاف کسی واقعہ کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ حضرت بیگم صاحبہ قبلہ والدہ پیر و مرشد حضرت بندگان عالی متعالی جب سخت علیل ہوئیں تو آپ صحت تک ہر روز بیحد پریشان رہتے تھے اکثر اوقات نہایت عجز و انکساری سے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑاتے اور دعائیں کرتے کہ میرے مالک کی محنت چینہ کر۔ اس کے دل کو اطمینان بخش۔ اے مولی ایک دفعہ میری اس دعا کو قبول کرے میرے مرحوم بھائی محبوب راج محبوب کے انتقال کے بعد جس وقت میں پہلی دفعہ دیوڑھی گیا ہوں مجھے دیکھکر اتنا روئے کہ میرا کوئی حقیقی بزرگ بھی شاید اس قدر اظہار رنج و غم کرتا۔ عالیجناب نواب فخر الملک مرحوم و مغفور۔ عالیجناب نواب خانخانان مرحوم مغفور۔ نواب صاحب تازین مرحوم کے انتقال کی کیفیت سنکر اس قدر غمگین اور بیچین ہوئے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حقیقی بھائیوں اور قریبی عزیزوں کے انتقال پر ماتم کر رہے ہیں۔ آپ کی پیشی میں اگر کوئی ستم رسیدہ مظلوم بیکس اور محتاج پہونچ جاتا اور اپنا درد دکھ بیان کرتا تو آپ اشکبار ہوتے اور اس کی پوری امداد فرماتے۔ امتیازی حیات ملازمین کی وفات کے بعد آپ کی رحم دلی نے امداد کا سلسلہ کبھی بند نہ کیا حالانکہ قواعد سرکاری کے رو سے ایسی ماہواریں قابل اجرائی نہیں تھیں سیکڑوں معذوروں اور محتاجوں کے متعلقین آپ کی مخیر ذات سے وابستہ تھے۔ ماہانہ مقررہ تنخواہیں علیحدہ تھیں جو

سیکڑوں ہزاروں کی جیب خاص کی رقم سے انصرام پاتی تھیں۔ آپ کے چندے ہر قوم و ملک کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ آپ کا یہ قول تھا کہ " خدا آخر وقت تک میرا ہاتھ نہ رُوکے اور نہ اپنی یاد سے مجھے محروم رکھے " آپکی دعا قبول ہوئی بستر علالت پر فرش ہونے کے دن تک آپ کا دست کرم نہ رکا۔

آپ فارسی میں سیر کلام فرماتے تھے۔ اسی طرح اُردو میں بھی آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ جملہ کتب کی تعداد ساٹھ سے زائد ہے۔ ان میں سے اکثر طبع ہو چکی ہیں۔ پریم درپن۔ جلوہ کرشن۔ نذر عقیدت۔ پیمانہ عقیدت۔ ہندو مسلم اتحاد وغیرہ بہت سی مقبول تصانیف ہیں۔ مخزن القوافی بھی اچھی کتاب ہے۔ آپ کا غیر مطبوعہ کلام اُردو فارسی کافی موجود ہے۔ آپ نے دیوان حسن سنجری کو طبع کرا کے ادب فارسی پر بڑا احسان کیا۔

آپ کی محفل میں گھنٹوں بیٹھنے والا بھی یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ برخاست کرے کبھی عالم فاضل جمع رہتے تھے، کبھی جوہندس و رمال۔ کبھی فلسفی۔ شاعر کبھی ریفارمر یا مذہبی اشخاص بہرحال ایک ایسا سلجھا ہوا مجمع رہتا جو کہیں اس طرح نظر آنا محال تھا۔ ایک دفعہ ایک معمولی شخص جے پور سے آیا۔ کارڈ بھیجا آپ نے یاد فرمالیا۔ اس نے اپنے آپ کو علم جوتش و رمل کا ماہر بتلایا۔ آپ نے چند سوالات فرمائے اور جان گئے کہ یہ مبتدی ہے۔ اس کے بعد بھی ایک لفظ نہ فرمایا۔ بیس روپیہ میرے ذریعہ سے مرحمت فرمائے۔ اس قسم کے صدہا واقعات ہیں جن کو میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ پرانے شاہی خاندانوں کی عظمت آپ کے دل میں بہت تھی آپ کا برتاؤ اُن افراد کے ساتھ خاص اثر پیدا کرتا تھا۔ ایک موقعہ پر ایک صاحب تشریف لائے اور خود کو تیموری خاندان کا رکن ظاہر فرما کر ملاقاتی کارڈ بھیجا۔ لباس بہت معمولی لیکن حاضرین مجلس نے حیرت سے دیکھا کہ سر مہاراجہ بہادر اُن کے لئے آگے بڑھے اور اُن سے جھک کر ملاقات کی اور اپنے بازو بٹھا لیا۔ دیر تک گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد جو مدد دینی تھی دی اور انکو دروازہ تک چھوڑا۔ یہ اب قصہ رہ گئے ہیں۔ بقول شاعر " جو سُنا افسانہ تھا " اب آنکھیں ترسیں گی دیکھ نہ سکیںگی دل مسوس کر رہجائیگا مگر ایسا اور قدردان نظر نہ آئیگا۔

دربار شاہانہ کی قدر افزائیوں سے مہاراجہ مالا مال ہو جاتے تھے اور اپنے جامہ میں نہیں سما سکتے تھے وہ کسی چیز کے طالب نہ تھے سوائے اپنے مالک کی نظر ترحم وکرم کے۔ دونوں شاہی دور میں آپ کے اعزاز اور وقار بلند تر رہے اور حضرت پیر و مرشد بندگانعالی نے "آپ" کے لفظ سے ہمیشہ یاد فرماکر عزت افزائی فرمائی۔ جریدہ غیر معمولی مورخہ ۹ آبان ۱۳۴۳ف میں حضرت پیر و مرشد کے ارشاد مبارک پر جو آپ نے اظہار خیال جوش عقیدت سے فرمایا وہ درج جریدہ مذکور ہے اس سے آپ کی عقیدت خاص اور بلند نظری کا پتہ چلتا ہے۔ آپ نے اعلیحضرت بندگانعالی متعالی کے فارسی ارشادات اور زور قلم کی جو مدح سرائی فرمائی اور جس کی نسبت حضور پرنور حضرت بندگانعالی مدظلہ العالی کے ارشادات کو آپ نے پیمانہ عقیدت نامی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ یہ وہ عزت تھی جو کسی پیشکار کو آج تک نصیب نہ ہوئی۔

آپ کے تین محل ہندو اور چار محل اہل اسلام سے تھے جنہیں ایک ہندو مہارانی صاحبہ اور ایک مسلمان محل بقید حیات ہیں آپ کو پندرہ صاحبزادے تولد ہوئے جن میں نو ہندو چھ مسلمان تھے اب انمیں صرف پانچ زندہ ہیں ایک راجہ ارجن کمار عرف راجہ خواجہ پرشاد بہادر جانشین سر مہاراجہ یمین السلطنتہ بہادر ہیں دوسرے صاحبزادگان نواب اسد اللہ خاں صاحب۔ نواب نصر اللہ خاں صاحب۔ نواب عظمت اللہ خان صاحب اور نواب حشمت اللہ خاں صاحب ہیں۔ پندرہ سے زیادہ صاحبزادیاں تولد ہوئیں اب صرف تیرہ بقید حیات ہیں جن میں چار ہندو بقیہ مسلمان ہیں آپ کو اولاد کا اس قدر صدمہ ہوا کہ آپ کا دل موم ہو گیا تھا۔ آپ سب کچھ برداشت کرسکتے تھے مگر اولاد کی نسبت کوئی کچھ کہے تو اس کو سننا پسند نہ فرماتے اور نہ ان پر سختی یا ان کے خلاف ایک لفظ بھی آپ کو گوارا تھا۔ صاحبزادہ اور صاحبزادیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کی اولاد کو جان سے زیادہ عزیز اور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ جب سے چھوٹی مہارانی صاحبہ کا انتقال سال ۱۳۴۵ف میں ہوا آپ بہت ہی غمگین اور ملول تھے اور اکثر اوقات دل بہلانے کے لئے تھیٹر یا سینما تشریف لیجاتے تھے۔

تواضع اور مہمانداری | نواب، راجہ، مہاراجہ، دیوان، شاعر، ادیب، مشائخین، فلاسفر، ریفارمر، اڈیٹر

واعظ، وکیل، حکیم، ڈاکٹر جو کوئی حیدرآباد آتا آپ سے ملاقات کئے بغیر نہ جاتا یا آپ اُن کی دعوت کے بغیر اُن کو واپس نہ ہونے دیتے۔ خواہ کتنی دفعہ یہ اصحاب کیوں نہ آئیں، مہاراجہ کا دسترخوان اُن کا منتظر رہتا تھا۔ مہاراجہ بیکانیر پورا جہ میسور۔ مہاراجہ دھولپور۔ نواب صاحب خیرپور نواب صاحب لوہارو۔ دیوان صاحب دتیا۔ دیوان صاحب میسور۔ سرتیج بہادر سپرو۔ سر فضل حسین۔ سر یعقوب حسین۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولوی سبط حسن صاحب و ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔ ڈاکٹر اقبال۔ پنڈت وسدیال جی وغیرہ آپ کے مہمان رہ چکے ہیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب حضرت کلیمی شاہ صاحب آپ کے یہاں ٹھہرتے اور مہمان ہوتے تھے کئی کئی مہینوں تک آپ نے پنڈت جگت پرشاد جی کو پانچ روپیہ روزانہ دیکر اپنی بارہ دری میں ٹھہرایا تھا۔ یورپ اور ہندوستان کے کیشن علمی یا سیاسی جو کوئی آئے آپ کی دعوت مقرر تھی۔ آپ نے حیدرآباد دکن سے کسی کو خالی جانے نہ دیا۔

جاترائیں عرس اور میلے

آپ کے علاقہ میں الوال اور ایلوارہ کی جاترائیں نہایت مشہور سمجھی جاتی تھیں جاترائے الوال کے لئے لوکل ٹرینیں چلائی جاتی تھیں اور جملہ دفاتر رزیڈنسی کو ایک روز کی تعطیل عام دیجاتی ہے۔ عرس حضرت داؤد علیشاہ صاحب قدس سرہٗ ہر سال پھول باغ میں نہایت تزک و احتشام سے کرتے تھے بلدہ کی دیوڑھی میں ہر سال عشرۂ شریف نہایت اہتمام اور اعتقاد سے آپ فرماتے تھے نویں کو حضرت نعل صاحب کی سواری اور دسہرہ کے بعد بھرت ملاپ گیشون کے جلوس آپ پاس دھوم دھام سے آتے تھے اور متعدد موقعوں پر معمولات مقرر تھے۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندو مسلم اتحاد کے آپ مکمل نمونہ تھے۔ اصلاح ہمیشہ گھر سے شروع ہوا کرتی ہے آپ نے اپنے گھر میں دونوں کے میل جول کا ایک بین ثبوت دیا تھا۔ آپ کے محلات میں ہندو مسلم رانیاں اور بیگمات تھیں آپ کے صاحبزادے اور صاحبزادیاں ہندو مسلم ہیں، اُن میں مطلق غیریت کا نام و نشان نہ تھا یکجہتی۔ یکدلی ایک دوسرے کی خبرگیری بتلاتی تھی کہ عملی اتفاق ایسا ہوتا ہے۔ مسرت محل کے انتقال کے بعد اُن کی صاحبزادے اور صاحبزادیوں کی دیکھ بھال

اورنگرانی بڑی مہارانی صاحبہ فرحت محل نے اسقدر تکدر اور محبت سے فرمائی کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے
اسی طرح چھوٹی مہارانی صاحبہ کے انتقال پر سب مسلم صاحبزادے اور صاحبزادیاں
بیحد ملول اور غمگین رہے اور ہر تقریبی رسم میں شریک تھے۔ آپ ہمیشہ فرماتے تھے کہ ریاست حیدرآباد
میں جب تک ہندو مسلم اتحاد و اتفاق ہے اس وقت تک ریاست نیک نام، رعایا میں امن و
سکون، اور مالک کی شہرت میں فرق نہیں آسکتا۔ اس اصول کے خلاف جب کبھی عمل ہوگا، بےچینی
اور اضطرار رونما ہوگا۔ آپ کے اثرات دونوں فرقوں پر یکساں رہے۔ ہر ایک بلالحاظ قوم وملت
آپ کی بے تعصبی اور یکسانیت عمل کا معترف تھا۔ آپ ہی ایسے خوش قسمت وزیر گذرے ہیں
جن کو یہ افتخار حاصل رہا کہ آپ کے دور وزارت وصدارت میں نہ کوئی جنگ عظیم ہوئی اور نہ
ایسے مواقع پیش آئے جو دونوں فرقوں کی تنگ نظری کا نمونہ بنے ہوں۔ آپ صرف ان
حضرات کو ہی خواہ ملک و مالک تصور فرماتے تھے جو تعصب کے تنگ و تاریک نظریہ سے بلند
تھے۔ آپ نے راقم کے اس شعر کو بہت پسند فرمایا تھا جو اس خیال کے حسب حال ہے۔

تعصب سے خدا محفوظ رکھے ہزاروں مرچکے ہیں اس وبا سے

علالت اور انتقال ہندو مسلم فساد کے موقعہ پر آپ نے آنسو بہائے اور انتہائی
تکلیف ورنج کا اظہار فرمایا تھا۔ آپ ۱۲۶۱ھ ن کے موسم گرما میں علیل
ہوئے۔ علالت ایسی نہ تھی جو فریش ہونے دل کی شکایت تھی۔ اس سے بےچینی اور دھڑکن ہوتی
اور حملہ کے وقت سخت تکلیف محسوس فرماتے تھے۔ نیند بالکل نہ آتی۔ بمشکل دن رات میں تین
پا گھنٹہ آرام فرماتے تھے۔ نیند نہ آنے سے اکثر راتیں جاگتے ہوئے گذاردیں۔ آپ صوفی تھے
فقیروں کی صحبت میں برسوں گزارے تھے۔ یاد آلہی کا مشغلہ تازہ اور جاری رکھنے کے لئے
قوالوں کی چوکیاں دن رات کئی مہینوں تک حاضر رکھی گئیں۔ اور دن میں صبح سے خاصہ کے
وقت تک اور تمام شب یہ سلسلہ جاری رہتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے اس بیماری اور تکلیف
کو راحت اور خوشی میں مبدل کرلیا ہے اس زمانہ میں آپ نے شاہی درباروں میں حاضری دی

دعوتوں تقاریب کے موقعوں پر شرکت فرمائی کبھی مریض کی طرح بستر پر نہیں لیٹے نہ پریشان ہوئے۔ انتقال کے ڈھائی تین مہینے قبل آپ کے بائیں ہاتھ میں درد شروع ہوا۔ اور مونڈھے کے جوڑ میں بیحد تکلیف شروع ہوئی۔ ہاتھ پوری طرح اٹھانا تکلیف دہ تھا۔ متعدد علاج ہوئے ڈاکٹر واگھرے ڈاکٹر ہنگٹ چند اور انصاری صاحب کا علاج تھا۔ حکیم مقصود علی خاں صاحب حکیم سید مورتی صاحب وغیرہ کے علاج ہوتے رہے۔ خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ عارضی سکون نظر آتا تھا مگر وزن برابر گھٹتا گیا اور آپ کمزور ہوتے رہے۔ باایں ہمہ مقررہ کاروبار اور اوقات کی پابندی میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ آخر ۹ مئی ۱۹۴۰ء م غرہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ ہجری م ۹ مہر ۱۳۴۹ف روز جمعہ کو آپ حسب معمول چار بجے بیدار ہوئے اور خلاف عادت پھر بستر پر آرام فرما گئے اس دفعہ ایسا سو کر پھر نہ جاگے اور نہ زبان سے کچھ کہا۔ حسب فرمان خسروی ڈاکٹروں اور حکماء کی کمیٹی کے مشورہ سے علاج فوراً آغاز ہوا۔ حضرت بندگانعالی متعالی نے خبر سنتے ہی حکیم مقصود علی خاں صاحب اور ہوش صاحب بلگرامی کو روانہ فرمایا۔ خود بدولت ہفتہ اور اتوار کے شام کو دو مرتبہ فرماکر عیادت فرمائی۔ اور معالجہ کی نسبت ہدایات خاص فرمائے حالت روز بروز خراب ہونے لگی۔

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

پہلے بخار نہ تھا۔ بڑھکر ابکسو پاپ تک پہنچ گیا۔ ہچکیاں شروع ہوئیں۔ تنفس بڑھ گیا یہ حالت وہ تمام آثار پیدا ہوگئے جو مریض کے جان کنی کے وقت نمودار ہوتے ہیں آخر ۱۳ مئی ۱۹۴۰ء دوشنبہ کے دن چار بجکر دس منٹ شام کو آپ کی روح پاک قالب عنصری سے پرواز کر گئی ہمیشہ کے لئے آپ نے ملک ومالک بیوی بچوں، دوستوں رفیقوں کا ساتھ چھوڑا ستہتر سال کے تھے۔ آپ کے زائچہ کے لحاظ سے یہ سال نہایت نحس تبلایا جاتا تھا۔ تنہا آئے تھے تنہا گئے۔ آتے وقت جو نیکیوں کا گنج مخفی ساتھ لائے تھے وہ اوصاف لاتعداد خوبیوں کی صورت میں نمایاں چھوڑ گئے۔ جس کا تذکرہ ہر زبان پر جس کی یاد ہر دل میں جس کا بیان ہر مکان اور ہر محفل میں برابر جاری رہا اور اتبک ہے۔ لوگ مرنے کے بعد

جاتے ہیں کیونکہ دنیا مردہ پرست ہے۔ مگر مہاراجہ آنجہانی زندگی میں ہر جگہ ہر ملک میں یاد کیے گئے ہر جگہ عزت ہوئی۔ ایسے صاحب تقدیر اور صاحب اقبال انسان دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں جو جیتے جی لوگوں کے دلوں میں گہری جگہ کریں اور مرنے کے بعد اپنے اخلاق و کرم کا سکہ اس طرح بٹھائیں جو مٹ نہ سکے۔ انتقال کے روز پانچ چھ بجے کے درمیان سواری شاہانہ بہجت افروز ہوئی۔ کیوں نہ ہوتی ملک کا قدیم فدائی جو ہمہ وقت دیدار کا طالب مالک کی عزت و عنایت کا متمنی ترقی عمر و دولت کا خواہاں رہتا تھا اس کی عزت افزائی جسم دل قدما پرورانہ ذات بابرکات شاہانہ سے نہ ہوتی تو کس سے ہوتی! تشریف لا کر حضرت قدس اعلیٰ نے وفادار جاں نثار و قدیم روایات اور خاندان کے آخری نام لیوا پر اظہار رنج و سوگ فرمایا۔ محلات اور صاحبزادے صاحبزادیوں کو دلاسا دیا۔ اس کے بعد حسب اجازت پونے بارہ بجے جنازہ بلحاظ رسوم و طریق خاندانی اٹھایا گیا راجہ خواجہ پرشاد بہادر عرف ارجن کمار نے آگ دی اور رسوم تعزیت انجام دیئے۔ جملہ امراء معززین، عہدہ داروں کے سوا ہزارہا مخلوق جنازہ کے ہمراہ تھی۔ جس کی صراحت مقامی و بیرونی اخباروں میں بخوبی ہو چکی ہے۔ آپ کے ہاتھ کے ادائے نہ جلنے اور ایک انگلی رہ جانے کا واقعہ بھی اخباروں میں آ چکا ہے جو صحیح ہے۔ آپ کی سمادھ مہاراجہ چندو لال بیکنٹھ باشی اور مہاراجہ نریندر سرگباشی کے درمیانی خالی حصہ میں بنائی گئی ہے۔ آپ کے اوصاف کا تذکرہ ان مختصر اوراق میں ناممکن بلکہ دشوار تھا۔ خصوصاً ان واقعات کا تفصیلی ذکر جو سال ہا سال رہنے کی وجہ راقم الحروف کے مشاہدہ میں آئے تھے یہاں قطعی ناممکن تھا۔

نرسنگ راج عالی

یادِ رفتگان

۱۹۲۷ء تک نہ مہاراجہ بہادر مجھے جانتے تھے اور نہ میں انھیں جانتا تھا اور جانتے بھی تو کس طرح جانتے میں کسی سے ملتا جلتا ہی نہیں۔ ہوا یہ کہ رسالہ اُردو میں میرا ایک مضمون "۱۲۶۱ء میں دلی کا ایک مشاعرہ" طبع ہوا۔ وہ مہاراجہ بہادر کی نظر سے بھی گزرا۔ اور بہت پسند آیا۔ اُنھوں نے ایک اشرفی اپنے معتمد سید محمد مہدی صاحب (نواب مہدی نواز جنگ بہادر) کو دی کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کو پہنچا دو۔ ۴ ابہمن ۱۳۳۶ف کو معتمد صاحب نے مجھے خط لکھا کہ "عالیجناب سر مہاراجہ صدر اعظم بہادر یمین السلطنت دام اقبالہٗ آپ کے اس مضمون کو پڑھکر بہت محظوظ ہوئے جو رسالہ اُردو میں بعنوان "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" شائع ہوا تھا اور بطور اظہار خوشنودی ایک اشرفی آپ کو سرفراز فرمائی ہے جو ذریعہ ہذا مرسل خدمت ہے"۔ اس خط اور اشرفی لانے والوں نے میری تلاش شروع کی۔ مگر میں ایسا گمنام شخص تھا کہ کئی روز تک میرا پتہ نہ چلا۔ ہوتے ہوتے کھوج مل ہی گیا اور وہ اشرفی مجھ تک پہونچ گئی۔ میں نذر دینے مہاراجہ بہادر کی خدمت میں حاضر ہوا اور یہ پہلا روز تھا کہ میں نے اُن کو دیکھا اور اُنھوں نے مجھے دیکھا۔ اس کے بعد میرا آنا جانا اُن کے ہاں ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ میری عقیدت اُن کے ساتھ اور اُن کی محبت میرے ساتھ اتنی بڑھی کہ بیان سے باہر ہے۔ میں تو یہ سمجھنے لگا تھا کہ جتنی محبت مہاراجہ بہادر کو مجھ سے ہے شاید ہی کسی اور سے ہوگی۔ اور میں کیا۔ ہر وہ شخص جو اُن سے ملتا تھا یہی سمجھتا تھا کہ اس سے زیادہ مہاراجہ بہادر کسی کو نہیں چاہتے۔ اُن کا یہی رکھ رکھاؤ

تھا جس کی وجہ سے تمام لوگ ان کے گرویدہ تھے۔ شاید ہی کوئی بدقسمت ہوگا جو اُن کے پاس سے آزردہ آتا ہو۔ "دامے درمے قدمے" غرض ہر طرح کی مدد کو وہ تیار رہتے تھے "سخی داتا" کی تعریف اُن پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ ایک صاحب تھے کہ وہ اکثر ان کے پاس آیا کرتے تھے "وہ آئے۔ بیٹھے۔ بات کی۔ اُٹھے۔ چلے گئے" جہاں وہ اُٹھنے لگے اور مہاراجہ بہادر نے اپنی شیروانی میں سے قلم نکالا سامنے سے کاغذ کا پیڈ لیا۔ کچھ لکھا۔ اور مصافحہ کرتے وقت اُن کو وہ کاغذ دیا انھوں نے کاغذ لیا اور چلے گئے۔ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ ہے کیا بات۔ اِس سے پوچھا اُس سے پوچھا۔ آخر یہ پتہ چلا کہ یہ بیچارے ایک متوکل شخص ہیں۔ گزارے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتے۔ کبھی کبھی مہاراجہ بہادر کے پاس آجاتے ہیں۔ وہ اپنے معتمد کے نام چٹھی لکھ دیتے ہیں اور اتنا کچھ اُن کو مل جاتا ہے کہ مہینہ بھر گزارہ ہوجاتا ہے۔ یہ ہے وہ دینا جس کے متعلق کہا گیا ہے۔

"ہاتھ کی ہاتھ کو خبر نہ ہوئی"

یہ کیا۔ مہاراجہ بہادر کی وجہ سے خدا معلوم کتنے غریبوں اور بے وارثوں کا بھلا ہوجاتا تھا۔ ان کی سواری جب نکلتی تھی۔ تو اُس کے گرد حاجتمندوں کا ایک گروہ ہوتا تھا۔ موٹر کا چلنا مشکل ہوجاتا تھا۔ حکم تھا کہ اُن لوگوں کو نہ ہٹاؤ۔ اکنیوں، دوانیوں، چونیوں اور روپیوں کو ملاکر بازو میں تھیلیاں رکھدی جاتی تھیں۔ اُنھوں نے تھیلی میں ہاتھ ڈالا اور مٹھیاں بھر بھر کر پھینکنا شروع کیا۔ جب جاتے تو یہ تھیلیاں بھری ہوئی ہوتیں۔ اور جب آتے تو خالی ہوتیں۔ جہاں خرچ کا یہ حال ہو وہاں قارون کا خزانہ بھی ہو تو خالی ہوجائے۔ بہت قرضدار ہوگئے تھے۔ آخر خدا خدا کرکے یہ قرضہ اترا۔ مگر ان کا ہاتھ نہ رکنا تھا اور نہ رکا۔ اُن کے معتمد خانگی گنڈیراؤ صاحب چاہتے تھے کہ پھر قرضہ کا بار نہ ہو اور یہ تھے کہ کسی طرح اپنا ہاتھ نہیں روک سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر ان دونوں کی گفتگو میں ایک روز تلخی کی صورت پیدا ہوگئی۔ میں اُس وقت موجود تھا۔ یہ گفتگو جس طرح شروع اور جس طرح ختم ہوئی ہے وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مہاراجہ بہادر کو بھی غصہ آگیا۔ اور گنڈیراؤ صاحب

نے بھی بگڑ کر کہا کہ "سرکار کو اگر قرضہ لینا ہی ہے تو مجھے خدمت سے علحدہ کر دیجئے۔ میں اب جاگیر کا انتظام نہیں سنبھال سکتا۔" یہ سنکر مہاراجہ بہادر ذرا ٹھنڈے پڑے اور کہنے لگے "گنڈیراؤ۔ اب میری بہت گذر گئی ہے۔ تھوڑی رہی ہے میری اس آخری عمر میں تو میرا ہاتھ نہ رُکوا" یہ الفاظ انھوں نے کچھ اس طرح کہے کہ گنڈیراؤ صاحب کے خود آنسو نکل آئے اور کہنے لگے کہ "سرکار آیندہ ہاتھ روکنے کے الفاظ آپ میرے منہ سے نہ سنینگے" اور ہے بھی یہ کہ مہاراجہ بہادر کے مرتے دم تک گنڈیراؤ صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

جو کوئی بھی مہاراجہ بہادر سے ملا ہے اُس کو خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ اُن کو غصہ آتا تھا یا آسکتا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُن کو غصہ آتا تھا اور بہت آتا تھا۔ وہ بگڑتے تھے۔ اور بہت بُری طرح بگڑتے تھے۔ لیکن اُن کا یہ غصہ صرف اپنے گھر والوں اور جاگیر والوں ہی تک محدود تھا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ اگر ان کا کوئی خانگی ملازم دوسروں کے سامنے کوئی بیہودگی کرتا تھا تو یہ غصہ کو پی جاتے تھے۔ اُن کے مرنے سے چند ہی مہینہ پہلے میں اُن سے ملنے گیا۔ چند اور اصحاب بھی موجود تھے۔ کوئی دس بجے کا وقت تھا۔ گرمی کچھ زیادہ تھی ایک شاگرد پیشہ نے بجلی کا پنکھا جو عین اُن کے سر پر تھا، کھولدیا یہ پنکھا تھا خراب کھلتے ہی اس نے ایسی "غر۔غر" شروع کی کہ بات کرنا مشکل ہو گیا۔ اب کیا تھا مہاراجہ بہادر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور انھوں نے بڑی زور کی آوازیں کہا "یہ پنکھا کس نے کھولا" بیچارا شاگرد پیشہ کانپنے لگا۔ یہ دیکھکر کہ اب بات بڑھنے والی ہے میں نے کہا کہ "یہ میری غلطی ہے۔ میں نے اشارہ سے پنکھا کھولنے کو کہا تھا" یقین مانئے کہ یہ سنکر وہ اس طرح غصہ پی گئے اور مسکرا دیئے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

اگر مہاراجہ بہادر کے غصہ کے حالات معلوم کرنے ہیں تو اُن لوگوں سے پوچھو جو اُن کے خانگی ملازم تھے۔ یا جن کا تعلق اُن کی جاگیر سے تھا۔ اس کے بعد معلوم ہوگا کہ اُن جیسی متضاد طبیعت کا آدمی ملنا ذرا مشکل ہے۔ خیر چلتے چلاتے مجھ سے بھی ایک واقعہ سُن لیجئے کہ وہ اپنے ملازموں پر کیسے خفا ہوتے تھے۔ اور اس خفگی کا اثر کتنی دیر رہتا تھا۔ ہوا یہ کہ مہاراجہ بہادر اپنی خدمت سے

سبکدوش ہوئے اور ان کے قرضوں کے تصفیہ کے لئے ایک کمیشن بیٹھا۔ اس کمیشن میں گنڈیراؤ صاحب معتمد جاگیر پیروی کرتے تھے۔ مہاراجہ بہادر کچھ دن کے لئے اپنی جاگیر کے ایک قصبہ شادنگر میں جا ٹھیرے۔ اس کے بعد وہاں سے محبوب نگر جانے کی ٹھانی۔ گنڈیراؤ صاحب نے سوچا کہ چلو محبوب نگر تک میں بھی پہنچا آؤں۔ یہ اسی ٹرین میں حیدرآباد سے روانہ ہوئے جس ٹرین میں شادنگر پر مہاراجہ بہادر کا سیلون لگتا۔ اسٹیشن کو لاپلی پہ انھوں نے باز سلام کیا۔ مہاراجہ بہادر نے کہا "گنڈیراؤ جی۔ اچھا ہوا کہ تم بھی آگئے۔ تم سے مجھے بہت آرام ملے گا۔" اس کے بعد کمیشن کے متعلق کچھ پوچھتے رہے۔ کولاپلی سے چل کر ٹرین جڑچرلا اسٹیشن پر پہنچی۔ وہاں معلوم ہوا کہ شادنگر سے ملازمین تمبا کو لانا بھول گئے۔ مہاراجہ بہادر کی یہ حالت تھی کہ بغیر حقہ کے ان کا گزارہ نہیں تھا۔ گھر میں رہتے تو ہر وقت حقہ پیتے۔ موٹر میں حقہ پیتے یہانتک کہ جب بلیرڈ کھیلتے تو ایک ملازم حقہ لئے میز کے چاروں طرف پھرتا۔ اس کے بعد سمجھ لیجئے کہ تمباکو نہ لانے کی وجہ سے ان کو کس قدر ناگوار آیا ہوگا۔ قصور تو تھا اس شخص کا جس سے حقہ کا انتظام متعلق تھا اور بگڑ گئے گنڈیراؤ صاحب سے کہ یہ سب تمہارا قصور ہے۔ وہ کہتے تھے کہ میں شادنگر میں تھا ہی نہیں۔ مجھے کیا معلوم کہ تمباکو لایا گیا ہے یا نہیں۔" وہ کہتے تھے کہ تم میرے معتمد ہو۔ تم کو میری ہر چیز کا خیال رکھنا چاہیئے۔" بہرحال اسی حجت میں محبوب نگر آگیا۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ کھانے کا خیمہ بھی شادنگر میں بھول آئے ہیں۔ اس کے بعد تو اللہ دے اور بندہ لے گنڈیراؤ صاحب پر برستے اور خوب برستے۔ وہ بھی کبیدہ خاطر ہو کر دوسری ہی ٹرین سے حیدرآباد چلے آئے۔ جب مہاراجہ بہادر کو معلوم ہوا کہ گنڈیراؤ صاحب خفا ہو کر حیدرآباد چلے گئے تو آدمی بھیج کر ان کو بلوایا۔ اور سمجھایا کہ "گنڈیراؤ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔ تم سے میں نہ بگڑونگا تو اور کس سے بگڑونگا۔ مگر اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ تم ایسے بگڑ بیٹھو کہ مجھے عالم مسافرت میں چھوڑ کر حیدرآباد چلے جاؤ۔" بس یہ معاملہ ختم ہوا اور پھر گنڈیراؤ جی وہی ہوگئے جو پہلے تھے۔

آخر آخر میں عمر کے تقاضے سے ان کا دل بہت کمزور ہوگیا تھا۔ اور ذرا ذرا سی بات پر ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ہفتہ میں کم سے کم ایک دفعہ ان کے پاس آیا کروں اور یہ مجھ سے ممکن نہ تھا۔ آخر ایک دن کہہ ہی بیٹھے کہ "مرزا صاحب آپ میرے ہاں بہت کم آتے ہیں" میں نے کہا "بندہ پرور۔ میں کسی کے ہاں آتا جاتا ہی نہیں۔ یہ کیا کم ہے کہ آپ کے پاس حاضر تو ہوجاتا ہوں۔ اور یہاں میں اس لئے تھوڑا ہی آتا ہوں کہ آپ صدر اعظم باب حکومت ہیں۔ میں تو یہ دیکھنے آتا ہوں کہ مسلمانوں اور ہندوں نے ملکر جو آٹھ سو برس میں تہذیب پیدا کی تھی اس کا آپ آخری نمونہ ہیں" میرا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے ایک پھریری لی۔ اور آنکھوں پر رومال رکھ کر جو رونا شروع کیا تو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اور سچ پوچھو تو ہے بھی یہ بات کہ مہاراجہ بہادر نہیں مرے۔ ہماری مشترکہ تہذیب کا آخری نمونہ اٹھ گیا۔

ایک ایسا ہی واقعہ نواب فخر الملک بہادر کے مرنے کے تیسرے روز پیش آیا۔ مہاراجہ بہادر کا حکم تھا کہ "مرزا صاحب تم جب میرے پاس آؤ کوئی غزل کہکر ضرور لاؤ" اس کی پابندی میں نے ان کے مرنے کے چند دنوں پہلے تک کی۔ تو وہاں اس روز میں جو غزل کہکر لے گیا تھا اس کا ایک شعر یہ تھا۔

ملک عدم کے رہرو اس طرح جا رہے ہیں ہستی سے نیستی تک ایک کارواں ہے گویا

میرا یہ شعر پڑھنا تھا کہ مہاراجہ بہادر نے آنسوں کی جھڑی باندھ دی۔ ایک ایک مرے ہوے دوست کا نام لیتے تھے اپنے اور اس کے تعلقات بیان کرتے تھے اور روتے تھے۔ یقین مانئے مجھے وہاں بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ خدا خدا کرکے کوئی آدھے گھنٹہ کے بعد یہ بین ختم ہوے اور اس کے بعد کا شعر پڑھنے کی نوبت آئی۔

مہاراجہ بہادر کے مذہب کے متعلق لوگوں کے عجیب عجیب خیالات ہیں۔ کوئی ان کو مسلمان کہتا ہے، کوئی ان کو لامذہب سمجھتا ہے اور کوئی ان کو ہندو مانتا ہے۔ لیکن ہے یہ بات کہ جو لوگ ان کے ہاں زیادہ آتے جاتے تھے اور جن سے وہ کھلے ہوئے تھے۔

وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ ہر مذہب کے بزرگان دین کو نہ صرف اچھا سمجھتے تھے بلکہ ایک حد تک اُن سے عقیدت بھی رکھتے تھے جب کبھی اس قسم کی کوئی گفتگو ہوتی تو وہ حافظ شیرازی کا یہ شعر ضرور پڑھا کرتے۔

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

ان کی مجلس میں خواہ وہ عام ہو یا خاص کسی کو جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ کسی ملت کے کسی بزرگ کے خلاف ایک حرف بھی زبان پر لاسکے اور یہ اس ماحول کا اثر تھا جس میں انھوں نے پرورش پائی تھی۔ اور اس مشترکہ تہذیب کا نتیجہ تھا، جس پر کسی زمانہ میں ہندوستان کو ناز تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "یہ ساری شورشیں محض ضد کی وجہ سے پھیلی ہیں۔ ورنہ دیکھا جائے تو ہے کچھ بھی نہیں۔ ذرا سی رواداری ان تمام جھگڑوں کو ختم کرسکتی ہے۔"

پرانے زمانہ میں "علم مجلس" ایک بڑا ضروری علم تھا اور ہر شخص کو بتایا جاتا ہے کہ مجلس میں رکھ رکھاؤ کس طرح رکھا جاتا ہے۔ کس طرح اٹھا بیٹھا جاتا ہے کس طرح گفتگو کی جاتی ہے کس طرح ایک دوسرے کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح ہر علم سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنا لازم ہوتا ہے۔ مہاراجہ بہادر اس علم کے ماہر تھے۔ ان کی مجلس میں ممکن نہ تھا کہ بیہودہ گفتگو کرسکے یا اپنی حد سے آگے بڑھ سکے۔ ذرا کوئی اپنی حد سے بڑھا اور اس کا ان کی مجلس میں آنا جانا بند ہوا۔ ایک صاحب تھے جو بہت بڑھ بڑھ کر ان کی مجلس اور خاص کر مجلس مشاعرہ میں باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ طریقہ عمل مجھکو کیا سب ہی کو برا معلوم ہوتا تھا۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو ایک دن معلوم ہوا کہ مشاعرہ میں ان کے آنے کی بندی ہوگئی۔ آئیے اسی سلسلہ میں چلتے چلتے میں مہاراجہ بہادر کی مجلس کا رنگ بھی دکھادوں۔ زینہ سے چڑھتے ہی سامنے ایک لمبا برآمدہ ہے۔ برآمدہ میں بالکل سامنے ہی مہاراجہ بہادر بیٹھے ہیں۔ دونوں طرف کرسیاں پڑی ہیں ان پر اس سرے سے اس سرے تک لوگ بیٹھے ہیں۔ کوئی شاعر

ہے تو کوئی نثر نگار۔ کوئی عالم ہے تو کوئی جوتشی۔ کوئی طالب امداد ہے تو کوئی صرف جوشِ عقیدت سے حاضر ہوا ہے۔ کوئی ملنے والا دیرینہ ہے اوپر آیا۔ اور مہاراجہ بہادر اپنی کرسی سے ذرا اٹھے۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ اور ہاتھ مصافحہ کو بڑھایا۔ مصافحہ کرنے کے بعد وہ صاحب کسی خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مہاراجہ بہادر نے ان کے بال بچوں کی خیریت پوچھی انہوں نے مہاراجہ بہادر کا مزاج پوچھا۔ اس کے بعد جو سلسلہ گفتگو ان صاحب کے آنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا وہ پھر شروع ہوا۔ ظاہر ہے کہ جہاں اتنے مختلف خیالات کے لوگ جمع ہوں وہاں ایک ہی موضوع کی گفتگو رفتہ رفتہ بے لطف ہو جاتی ہے مہاراجہ بہادر اس کو خوب سمجھتے تھے اس لئے تھوڑی دیر کے بعد اس گفتگو کو چپکے سے اس طرح بدل دیتے تھے کہ گفتگو کرنے والا یہ بھی نہیں سمجھتا تھا کہ میری باتوں سے تنگ آکر یہ سلسلہ گفتگو بدلا گیا ہے۔ مثلاً ایک دن ایک جوتشی صاحب نے ستاروں کے چکر اس طرح بیان کرنے شروع کئے کہ لوگ چکرا گئے مہاراجہ بہادر کو جوتشی میں بھی درک تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ان کی باتیں سنتے رہے آخر جب انھوں نے دیکھا کہ اس گفتگو سے لوگ تنگ آ گئے ہیں تو کہنے لگے "مہاراج آپ کا مضمون اتنی گہرائی میں چلا گیا ہے کہ جب تک اس کو تحریر کی صورت میں نہ دیکھوں اس کا سمجھنا مشکل ہے۔ آپ یہ نقشے مجھے لکھ کر دے دیجئے تو اچھا ہے" یہ بحث یہ گفتگو ختم ہوئی۔ اور دوسرے مضمون پر شروع ہوئی جوتشی صاحب کو بھی شکایت کا موقع نہ رہا کہ مہاراجہ بہادر نے بے رخی برتی اور لوگ بھی اس بحث لامتناہی سے نجات پا گئے۔

ان کی مجلس میں ہر مذہب و ملت کے بزرگان دین کے قصے بہت چلا کرتے تھے۔ اور بہت شوق سے ان کو سنتے اور بہت متاثر ہوتے تھے۔ جب جوش بہت بڑھ جاتا تھا تو وہ پھریریاں لیتے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ کہتے اور آہستہ آہستہ "ہو ہو" کرنے لگتے تھے۔ میرے ایک دوست مہاراجہ بہادر کو لا مذہب سمجھتے تھے۔ ایک دن میں ان کو بھی مہاراجہ بہادر کے پاس لے گیا۔ بہت سے لوگ جمع تھے۔ اور اسی قسم کے قصے بیان ہو رہے تھے۔ مہاراجہ

کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ پہلو پر پہلو بدل رہے تھے اور بے تاب ہو رہے تھے۔ وہ حضرت ان کو بڑے غور سے دیکھتے رہے جب وہاں سے رخصت ہوئے تو موٹر میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ "مہاراجہ بہادر گو تمام مذاہب کے بزرگوں سے عقیدت ہے مگر میرا خیال ہے کہ ان کا رجحان ہندو مذہب کی طرف زیادہ ہے۔ میں نے کہا کہ "یہ تم نے کیونکر جانا" انھوں نے کہا کہ "جب کرشن مہاراج کا ذکر آیا تو مہاراجہ بہادر کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک آگئی اور ان کے چہرہ پر مسرت کی سرخی پھیل گئی۔ دوسرے بزرگان دین کے حالات سن کر وہ ضرور متاثر ہوئے تھے لیکن یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ اور اسی وجہ سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ ان کو اپنے مذہب کے بزرگوں سے زیادہ عقیدت ہے" میں نے کہا کہ "تم نے بالکل صحیح رائے قائم کی ہے۔ اور جو شخص ان کی مجلس میں زیادہ اٹھتا بیٹھتا رہے۔ وہ سوائے اس کے اور کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا جو تم نے قائم کی ہے" یہ سب کچھ تھا مگر باوجود اس کے ہر مذہب و ملت والا سمجھتا تھا کہ مہاراجہ بہادر کا تعلق میرے ہی مذہب سے ہے۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو ہر قوم اور ملت کے لوگ ان کی ارتھی کے ساتھ تھے اور ہر شخص اپنے عقیدہ کے موافق ان کے لئے دعا مغفرت کرتا تھا۔ یہانتک کہ ایک پادری صاحب انجیل پڑھتے ہوئے اس مجمع کے ساتھ مرگھٹ تک گئے میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ ان متعصب مسلمانوں سے جو رواداری کے متعلق احکام قرآنی پر عمل نہیں کرتے وہ دوسرے مذہب والے بہتر ہیں جو ان خداوندی ہدایتوں پر سچے دل سے عمل پیرا ہیں۔

بدلہ لینے کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے لیکن مہاراجہ بہادر کی زندگی میں بیسیوں مثالیں آپ کو ایسی ملیں گی کہ باوجود قدرت ہونے اور لوگوں کے بھڑکانے کے انھوں نے اس خیال کو دل میں آنے ہی نہیں دیا۔ اس کے متعلق صرف ایک واقعہ سن لیجئے۔ مہاراجہ بہادر کے ایک بہت عزیز قریب تھے۔ جاگیر سے ان کو ایک معقول رقم ملتی تھی۔ اور اس کے علاوہ بھی مہاراجہ بہادر ان سے سلوک کرتے رہتے تھے۔ ان کے ہاتھ چند ایسے خط لگ گئے جو مہاراجہ بہادر نے

اپنے ایک رشتہ دار کو لکھے تھے۔ اور اس میں تعجب ظاہر کیا تھا کہ باوجود اس کے کہ میں اور میرا خاندان ہمیشہ شاہان آصفیہ کا نمک خوار خیر سگال اور وفادار رہا ہے مجھ کو خدمت سے کیوں علحدہ کیا گیا۔ ان حضرت نے ان خطوں کو اضافہ آمدنی کا ذریعہ بنانا چاہا۔ اور ایک معاوضہ رقم کی مانگ شروع کی۔ مہاراجہ بہادر حیران تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ آخر یہاں کے ایک ذی اثر عہدہ دار نے ان سے کہا کہ ان خطوں میں ہے ہی کیا جو آپ اتنے پریشان ہوتے ہیں۔ آپ جواب دیجئے کہ میں ایک پیسہ نہیں دونگا۔ مہاراجہ بہادر نے اس رائے پر عمل کیا۔ جب ان صاحب نے دیکھا کہ جال میں پھنسا ہوا شکار نکل گیا۔ تو انھوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اور اس کی تقسیم اس دن کی جب مہاراجہ بہادر کے ہاں ایک تقریب تھی۔ بھلا ایسی خرافات پر کون یقین کرتا۔ چند ہی دن میں بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک دن گنڈیراؤ جی نے مہاراجہ بہادر سے کہا سرکار۔ آپ کے ان عزیز نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ ان کو ملنا چاہئے۔ بہتر ہے کہ ان کی جو امداد آپ دیتے ہیں وہ بند کردیں۔" مہاراجہ بہادر نے کہا۔ "گنڈیراؤ۔ اس غریب نے ایسا کیا ہی کیا ہے کہ میں اس کے رزق کا دروازہ بند کردوں۔ اس نے تو مجھ پر میری کمزوریاں ظاہر کی ہیں جس کا میں ممنون ہوں۔ اور اگر اس نے دشمنی سے کیا ہے تو بھی مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ دشمنی کا بدلہ دشمنی سے لوں۔ دشمن کو احسان سے دبانا چاہئے نہ کہ طاقت کے زور سے"۔ چنانچہ مرتے دم تک مہاراجہ بہادر اپنے اس مخالف کے ساتھ ہر طرح کا سلوک کرتے رہے۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ حضرت اپنے ان کرتوتوں پر شرمندہ بھی ہوئے یا نہیں۔

مجھے جوئے سے کچھ نفرت سی ہے۔ یہانتک کہ میں برج کی ان پارٹیوں میں بھی شریک نہیں ہوتا جہاں قانونی جوا کھیلا جاتا ہے۔ مگر باوجود اس کے میں اکثر مہاراجہ بہادر کے ساتھ جوئے میں شریک رہا ہوں۔ اور اس طرح کا جوا کوئی اب بھی کھیلے تو اس میں شریک ہونے کو تیار ہوں۔ ہوتا یہ تھا کہ چند ایسے لوگ جن سے مہاراجہ بہادر کے خاص تعلقات تھے جوا کھیلنے

بیٹھتے۔ بازی لگائی جاتی۔ مگر ساری رقم مہاراجہ بہادر کی ہوتی۔ جو کوئی جیتتا وہ سارا "غلق" اٹھا لیتا۔ اور پھر اسی طرح دوسری بازی شروع ہوتی۔ غا اجھوٹ نہ بلوائے تو ایسی مجلسوں میں مہاراجہ بہادر کے سینکڑوں روپیے اٹھ جاتے۔ اگر وہ خود جیتتے تو اس کو اپنے بچوں اور ملازمین میں تقسیم کر دیتے۔ جو ان کو ہر وقت ایسے موقعوں پر گھیرے رہتے تھے۔

غالب مرحوم کا شعر ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو ایک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

بس سمجھ لیجئے کہ مہاراجہ بہادر کو بس بے خودی کی دن رات ضرورت تھی۔ وہ داد و دہش کی دھن تھی وہ کسی نہ کسی طرح اپنے عزیزوں، دوستوں، بہی خواہوں اور ملازمین کو فائدہ پہونچانا چاہتے تھے۔ خواہ وہ جوئے کی شکل میں ہو یا مٹھی بھر بھر کے روپیہ لٹانے کی صورت میں۔

ان کی مجلس خاص میں جو جو باتیں ہوتی تھیں، ان کو اگر ظاہر کر دوں، تو یقیناً آپ کہنے لگیں کہ نہ بہت بڑا چھوٹا ہے۔ اس لئے اشارتاً اتنا کہہ دیتا ہوں کہ جب وہ

"یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جوان تھا"۔

کے قصے بیان کرنے شروع کرتے تو کچھ دوسرے ہی مہاراجہ بہادر ہو جاتے۔ وہ بڑے متین تھے۔ مگر ایسے موقعوں پر وہ متانت کو بالائے طاق رکھ دیتے تھے۔ اور کہنا پڑتا تھا کہ ایسی متضاد طبیعت کا آدمی ملنا دشوار ہے۔

تعجب ہوتا ہے کہ مجھ جیسے گمنام شخص کی نظم و نثر کی سب سے پہلے جس نے قدر کی وہ مہاراجہ بہادر تھے۔ چنانچہ دہلی کے مشاعرہ والا واقعہ میں اوپر دے آیا ہوں اس کے بعد جب وہ میری کوئی کتاب پڑھتے تو اس پر خط کی صورت میں بڑا لمبا چوڑا ریویو لکھتے۔ ایسے بہت سے خط اب بھی میرے پاس موجود ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان کا ایک خط اور اس کا جواب نقل کرتا ہوں اس سے معلوم ہوگا کہ ان کی طرز تحریر کیسی تھی اور میں ان کو کس نہج پر خط لکھا کرتا تھا۔

مہاراجہ بہادر لکھتے ہیں۔

شادمنش   ۱۹ رجمادی الثانی ۸۵ھ

محب شادمرز اصاحب۔

دیوانِ یقین آپ کی تصنیفات میں ماسٹر پیس ہے۔ کل میں نے تمام کیا۔ مگر اس درمیان میں مکتبہ ابراہیمیہ سے مضامینِ فرحت کے جو دو حصے میں نے خریدے تھے۔ حصہ اول بھی پڑھنا شروع کیا۔ مولوی نذیر احمد صاحب کا امیر کابل سے ملاقات کرنا اور امیر صاحب کا بوسے لینا اور مولانا کا اس قصہ کو دہرانا اس عمدگی سے آپ نے لکھا ہے کہ شاید میں نے ایسا ظریفانہ مضمون اس سے پہلے کم دیکھا۔ بلکہ نہیں دیکھا۔ اور شاید اپنی عمر میں کبھی اس قدر ہنسا بھی نہیں۔ لطف کی بات تو یہ تھی کہ میں اپنے بڈ روم یعنی خواب گاہ میں پڑھ رہا تھا۔ میرے کم سن نواسے نواسیاں اپنے کھیل میں مصروف تھے۔ دفعتاً میری ہنسی پر وہ چونک پڑے اور مجھے ہنستا دیکھ کر انھوں نے بھی ہنسنا شروع کیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ نانا ہنس رہے ہیں۔ ایک دو نے ان میں سے میرے نزدیک آکر کتاب میں جھانک کر دیکھنا شروع کیا۔ گویا ان کے ذہن میں کوئی تصویر اس کتاب میں ایسی ہے جس کو دیکھ کر میں ہنس رہا ہوں جب انھیں مایوسی ہوئی کہ کتاب میں کوئی شئے ہنسانے والی نہیں ہے تو مرا منہ تکتے تھے اور ہنستے تھے۔ میں نے ایک دو سے پوچھا "کہ باباتم کیوں ہنس رہے ہو۔ بی بی تم کیوں ہنس رہی ہو" تو اس کا جواب بہ خندہ پیشانی یہ ملا کہ نانا باباتم ہنچ لوتھے (ہنس رہے تھے)۔ اس ہنسی کے بعد رضیہ کے زیور کے قصہ نے بے حد رلایا۔ سچ ہے کہ "درپس ہر گریہ آخر خندہ است"۔ یہاں اس کو یوں کہنا بہتر ہوگا کہ "درپس ہر خندہ آخر گریہ ایست" آپ کے طرزِ بیان میں خاص ایک لطف ہے جو آپ ہی کے لئے ہے۔

ان دو مضامین کے بعد دلی کا مشاعرہ دیکھنا شروع کیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی مشاعرہ ہو رہا ہے اور ہم وہاں موجود ہیں۔ جو نقشہ آپ نے نشست کا دیا ہے کاپی نویس نے غضب ہی کر دیا اور معلوم ہوتا ہے کہ صحت کے وقت بھی نظر چوک گئی "قلق" کو (قاق) لکھ دیا۔ مجھے

پہلے اپنی نظر پر دھوکا ہوا۔ جب غور سے دیکھا تو واقعی بہت قلق ہوا کہ قاق لکھ دیا۔ آہ کیسے کیسے لوگ تھے اس کے بعد جو کچھ بچے تھے مثلاً۔ استاد داغ۔ اوستاد ظہیر۔ اوستاد امیر۔ یہ بھی نہ رہے مرزا صاحب ایک مشاعرہ اسی نمونہ کا حیدرآباد میں بھی ہو جائے تو یادگار رہ جائے گا۔ انشاءاللہ میں آپ کو مدد دینے پر تیار ہوں۔ مولوی صاحب سے بھی کہئے ان کی شرکت ضروری ہے۔

مرزا صاحب آپ نے رلایا بھی اور ہنسایا بھی۔ طبیعت بہت خوش ہوئی۔ خدا آپ کو شاد و آباد رکھے ایک رسٹ واچ تحفتاً بھیجتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کو قبول کرکے مجھے شاد کرینگے اور دل کو فرحت بخشیں گے۔ باقی عند الملاقات۔

آپ کی تصانیف کی کوئی فہرست ہو تو ضرور روانہ کیجئے۔

فقیر کشن پرشاد

اس کا جواب بھی سن لیجئے۔

فرحت کے قدردان سرکار۔

خدا ہمیشہ آپ کو شاد و آباد رکھے۔ تحفہ ملا۔ شکریہ اور بہت بہت شکریہ۔ عنایت نامہ نے جو اثر کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ ہر لفظ سے جوش قدردانی ٹپکتا ہے اور ہر حرف ہمت افزائی کرتا ہے۔ بھلا میں کیا اور میرا کام کیا۔ ہاں سرکار ہی جیسے قدردانوں کے برتے پر کچھ لکھ لیتا ہوں۔ پرانی تہذیب کا دلدادہ ہوں اور اسی یاد کو تازہ رکھنا میرا کام ہے۔ اکثر مضامین اسی پہلو سے لکھے ہیں اور اگر قلم نے یاری دی تو آئندہ بھی لکھونگا جب خدمت والا میں حاضر ہوتا ہوں تو خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے دل کا کیا حال ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ یا اللہ جب ہر امیر کے ہاں پہلے یہی صحبت ہوگی تو اس زمانہ والوں کی کیسی اچھی گزرتی ہوگی۔ پہلے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ بادشاہ کی شکل دیکھنے سے چالیس روز کا رزق بڑھتا ہے۔ آجکل کوئی اس کو مانے یا نہ مانے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ جب شاد کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر انسان ساری کلفتیں بھول جاتا ہے تو بادشاہ کا دیکھنا جو کچھ نہ کرے تھوڑا ہے۔ بہر حال عنایت نامہ سے میرے

دل میں وہ جوش بھر گیا ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بھلا لکھا کیا جائے گا۔

لکھا تو میں نے بہت ہے۔ رسالوں میں چھپا بھی بہت ہے۔ لیکن کتاب کی صورت صرف دو ہی حصوں نے اختیار کی ہے۔ تیسرے حصہ کے چھپوانے کا ارادہ کر رہا ہوں زمانے اگر فرصت دی تو وہ بھی عنقریب حاضر خدمت ہو گا۔ غرض حال یہ ہے کہ۔

واہ دے گرشادکی ایک بحر پیدا کنار ¹ — میری تحریروں کا فرحت کوئی ساحل نہیں

مشاعرہ کے متعلق میں انشاء اللہ مولوی عبدالحق صاحب سے تصفیہ کرکے عنقریب خدمت والا میں گزارش کروں گا۔ زیادہ حد ادب

کمترین

فرحت"

میں نے مولوی عبدالحق صاحب سے کہا۔ مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ ان کی حجت یہ تھی کہ میں یہ مشاعرہ اورنگ آباد میں کرا چکا ہوں دوبارہ حیدرآباد میں اصولاً نہیں ہو سکتا۔ مولوی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ اس لئے ان کا اصول بھی زوردار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہاراجہ بہادر کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ جس طرح میری نثر کی مہاراجہ بہادر نے سب سے پہلے قدردانی کی تھی۔ اسی طرح وہی پہلے شخص تھے۔ جنھوں نے نظم کے متعلق بھی میرا دل بڑھایا۔ اس واقعہ کو بھی سن لیجئے۔ ذرا طویل تو ہے مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔²

"ایک دفعہ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم نے مجھے جوش بھی دلایا اور کہا کہ "تیری فطرت میں شاعری ہے۔ تیری خاموشی کفران نعمت ہے"۔ مگر میں ان کی باتوں میں کب آنے والا

---

¹ میرا اصل شعر یوں ہے۔ بیوفائی ہے تیری ایک بحر ناپیدا کنار — مرے دریائے وفا کا بھی کوئی ساحل نہیں

² میری تصنیف "میری شاعری" سے یہ ٹکڑا نقل کیا گیا۔ چونکہ وہ کتاب بہت کم لوگوں کے پاس ہے اس لئے اکثر پڑھنے والوں کو یہ واقعہ بالکل نیا معلوم ہو گا۔

تھا "بہت خوب اور جی ہاں" کہہ کر بات ٹال دی۔ خدا کا کرنا کیا ہوتا ہے سنہ ۱۹۳۱ء میں مجھے اردو سوسائٹی مدراس کے سالانہ جلسہ میں صدر بن کر جانا پڑا۔ واپس ہوا تو گاڑی میں اکیلا تھا۔ چوبیس گھنٹے کا سفر اور تنہائی۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ہی طبیعت گھبرا گئی کتاب اٹھا کر دیکھی مگر دل نہ لگا۔ اخبار اٹھایا مگر وہ تھوڑی ہی دیر میں ختم ہوگیا اس وقت خیال آیا کہ شاعری شروع کرو کیونکہ بیکاری میں اس سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ ساتھ ہی وحید الدین مرحوم کی بات یاد آئی۔ اٹھا۔ ٹہلا۔ گنگنایا۔ اور ایک شعر دماغ سے اتر کر زبان پر آ گیا۔ شعر کیا ہے میری اس وقت کی حالت کا آئینہ ہے۔ عرض کیا ہے۔

مجھے ہے شاعری کا آجکل جوش ہوئے ہیں دین و دنیا سب فراموش

اس کے بعد ضرورت ہوئی کہ کوئی غزل کہی جائے۔ کیونکہ اردو شاعری کی یہی شارع عام ہے۔ نہ اس میں خیالات کی وسعت کی ضرورت ہے اور نہ الفاظ کے انتخاب کی حاجت۔ کئی ردیف اور قافیے خیال میں آئے۔ مگر بلا وجہ نظر انداز کر دئے گئے۔ آخر "انداز۔ آغاز" کے قافیوں اور "ہے" کی ردیف نے شرف قبولیت حاصل کیا۔ الفاظ نے مصرعوں اور مصرعوں نے غزل کی شکل اختیار کرنی شروع کی اور تھوڑی ہی دیر میں ہم ایک عدد غزل کے موجد ہو کر شاعروں کی صف میں آ گئے۔ غزل ہوئی تھی۔

لبانہ نزاکت کیا ادا کیا ناز کیا انداز ہے	تیری صورت پر ید قدرت کو کیا کیا ناز ہے
ہر نگاہ ناز گویا تیر بے آواز ہے	اس کی ناوک افگنی میں یہ غضب کا راز ہے
سمجھو اگر سمجھو تو بیشک دل ہے گھر اللہ کا	جو ندا اس کی ہے کوہ طور کی آواز ہے
حسن طالب عشق کا اور عشق طالب حسن کا	تم کو مجھ پر ناز ہے اور مجھ کو تم پر ناز ہے
بے نیازی اور تیرا ناز کچھ ہیں ایک سے	فرق اتنا ہے کہ اس میں سوز اس میں ساز ہے
ہر قدم پر ہوتی ہے سیل حوادث پائے بوس	یہ ہماری زندگی ہے جس پہ یہ کچھ ناز ہے
ہاں نہ پوچھ ان مے کشوں کے دل کی کیفیت نہ پوچھ	یہ وہ گنجینہ ہے جس میں دو جہاں کا راز ہے

اے حریصِ زندگی کیوں موت سے ڈرتا ہے تو زندگی دائمی کا موت ہی آغاز ہے

مجھ کو فرحت شاعری میں دخل تو ہرگز نہیں
ہاں میری غزلوں کا بیشک ایک نیا انداز ہے

مقطع میں تعلی کے علاوہ صریح جھوٹ بھی ہے۔ صرف ایک غزل لکھنے کے بعد کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ پڑھنے والوں کو یہ باور کرائے کہ میں بہت سی غزلوں کا مالک ہوں۔ اور وہ سب دنیا بھر سے نرالی ہیں۔ ارادہ ہوا تھا کہ "غزلوں" کی جگہ "شعروں" لکھ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح رعب کم ہو جائے گا۔ اس لئے جھوٹ کو بحال خود رکھنا ہی مناسب سمجھا گیا۔

جس طرح ماں اپنے اکلوتے بیٹے کو چاہتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی پہلی غزل پر لوٹ گیا اتنا پڑھا اتنا پڑھا کہ سارا راستہ اسی پڑھنے میں کٹ گیا۔ رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ تو نے کچھ دنوں پہلے سے شاعری کیوں شروع نہ کی۔ آج کو صاحبِ دیوان ہوتا۔ اور جب ابتدا کا یہ رنگ ہے تو نہ جانے انتہا کیا ہوتی۔ بہرحال گھر آئے۔ اور ایک غزل نہایت صاف خط میں لکھی ہوئی ساتھ لائے۔ ایسی نایاب غزل کا مشاعرہ میں نہ پڑھنا اپنے اوپر ظلم کرنا ہے۔ اور سب سے زیادہ پبلک پر ظلم کرنا ہے۔ اس لئے دیکھتا رہا کہ کہاں اس طرح میں مشاعرہ ہو اور کہاں میں یہ غزل پڑھوں۔ سچ ہے خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ طرح جامعہ عثمانیہ کے سالانہ جلسہ میں ہوئی اب کیا تھا۔ غزل سنبھالی اور مشاعرہ میں پہنچ گئے۔ بڑے شعرا غزل سے پہلے ایک آدھ رباعی یا قطعہ ضرور پڑھتے ہیں۔ آخر ہم ان سے کیوں پیچھے رہتے۔ ایک رباعی بھی گھڑ لی۔

اب رہا مشاعرہ میں غزل پڑھنا تو اس سے میں گھبرانے والی آسامی نہیں ہوں۔ برسوں خود میرے گھر پر مشاعرہ ہوا ہے۔ اور میں نے ہر مشاعرہ میں غزل پڑھی ہے۔ علیگڈھ میں حسرت موہانی نے مشاعرہ کیا ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شاعروں کو بلایا وہاں جا کر میں نے بڑے ٹھاٹھ سے دو غزلیں پڑھیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ غزلیں میری نہیں تھیں۔ البتہ تلبیس شخصی ضرور کی تھی۔ یعنی دوسروں سے لکھوا کر خود اپنی بنالی تھیں۔ الغرض پوری طرح سے

لیس ہوئے مشاعرہ میں پہونچ ہی گئے۔ جلسہ کے صدر عالیجناب مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت جی۔سی۔ائی۔ای۔ تھے مجھ کو پہلے جانتے تھے میرے مضامین پسند فرماتے تھے۔ انھوں نے جو۔ مجھے شاعروں کی صف میں دیکھا تو بڑا تعجب کیا۔ جب میرے پڑھنے کا نمبر آیا تو ان سے بھی نہ رہا گیا۔ اور پوچھ ہی بیٹھے کہ "اوہو آپ بھی شاعر ہیں" میں نے عرض کی کہ "شاعر تو نہیں ہوں البتہ شاعر بننا شروع ہوگیا ہوں۔ چنانچہ اپنے حسب حال رباعی عرض کی ہے۔

احباب یہ کہتے ہیں جناب فرحت ۔۔۔۔ اردو کا بس اب چھوڑ دیجیے پیچھا حضرت
کچھ نثر ہی میں تیر بڑا مارا تھا ۔۔۔۔ اب ہوگئے شاعر بھی خدا کی قدرت

اس کے بعد غزل پڑھی اور بڑے زور سے پڑھی۔ مہاراجہ بہادر نے بہت کچھ تعریف کی یار لوگوں نے بہت کچھ واہ واہ کا غل مچایا ہم نے سلاموں کی بہت کچھ بوچھاڑ کی اور غزل ختم کرکے گاؤ تکیہ سے کمر لگا اس طرح بیٹھ گئے کہ گویا پالا مار لیا۔ اس کے بعد غرور کا وہ چکر دماغ میں آیا کہ کسی دوسرے بھلے آدمی کی غزل پر واہ واہ کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ اور ہم اس طرح گھر واپس ہوئے جس طرح نپولین اٹلی کی فتح کے بعد پیرس واپس آیا تھا دوسرے دن سالانہ جلسہ ختم ہوا۔ صدارت کی اسپیچ میں مہاراجہ بہادر نے مناسب الفاظ میں ہماری تعریف بھی کی۔ اور ایک قیمتی قلم اور پنسل کا سٹ انعام میں دیا۔ چلو اچھے رہے۔ ایک ہی غزل میں خاصہ نقی فائدہ ہوگیا۔ ورنہ مضامین لکھنے میں تو کوئی کوڑی نہیں دیتا تھا۔ ہاں پرچوں کا ایک ڈھیر کا ڈھیر ہر مہینہ آجاتا۔ مگر اس سے کچھ حاصل۔ پرچہ پڑھا اور ردی ہوگیا۔ اب بھی ٹین کی الماریاں اسی ردی سے بھری پڑی ہیں۔ جگہ الگ رک گئی ہے اور چوہوں کا الگ زور ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں ہندوستانی چوہے سب سے زیادہ خطرناک چیز ہیں"۔

اس کے بعد میرا آنا جانا مہاراجہ بہادر کے "مشاعرہ خاص" کی مجلسوں میں ہوگیا۔ اور سچ پوچھو تو انہی مشاعروں کی وجہ سے مجھے شاعر بننا پڑا۔ اگر حکم دیتے تو قیامت تک میں ان کے کسی مشاعرہ میں نہ جاتا۔ مگر اس کو کیا کروں کہ ان کی عنایت اور محبت نے مجبور کر دیا تھا۔ ان کا محبت بھری

آواز میں یہ کہنا کہ "دیکھو ضرور آنا" انکار کا بالکلیہ سدباب کردیتا تھا۔ ہر مہینہ ایک مشاعرۂ خاص ہوتا۔ ہر مہینہ ایک غزل بھی پڑتی۔ میری ایک غزل کے متعلق مہاراجہ بہادر لکھتے ہیں۔

محب نغز شاد۔

"یہ بزم مشاعرہ آپ کے لیے تھا اور آپ مشاعرہ کے لئے۔ جو تضمین آپ نے کی تھی بے مثل تھی زبان و محاورہ کا لطف۔ بے اندازہ قابل تعریف تھا۔ برگ سبز است تحفۂ درویش اس تحفہ کو آپ قبول کریںگے تو میری مسرت کا باعث ہوگا۔ خدائے تعالیٰ آپ کو شاد و آباد رکھے اللہ کرے زور نظم اور زیادہ۔ شعر کے سلسلہ کو موقوف نہ کیجئے۔ انشاء اللہ مجھ سے جو ہوسکے گا مدد کروں گا۔

فقط کشن پرشاد"

۱۳۳۴ف میں میرا تبادلہ گلبرگہ شریف ہوگیا۔ اس وقت اس سلسلہ نے دوسرا رنگ اختیار کیا تاکید تھی کہ جب حیدرآباد آؤ تو مجھ سے ضرور ملو۔ اور ملو تو کوئی غزل یا نظم ضرور سناؤ۔ میں نے اس حکم کی تعمیل لفظاً لفظاً کی۔ یہاں تک کہ مہاراجہ بہادر بھی ختم ہوگئے اور میری شاعری کا خاتمہ بالخیر ہوگیا۔ سچ ہے۔

کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام

مرزا فرحت اللہ بیگ

شکریہ

"گذشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالیجناب ہز ایکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنت وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا بھی موقع ملا۔ ہز ایکسلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے وہ نقش میرے دل پر چھوڑا۔ وہ میرے لوح دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت لطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام منظوم سے بھی سرفراز فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آگئے انھیں زبان قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔"

اقبال

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشتِ خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پا کر خبر
محملِ پروازِ شب باندھا سرِ دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابدِ شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغِ آبدار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار

ہے تہِ دامان بادِ اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذان سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذان سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار

گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار

کھینچ کر سوئے گلستاں لیگیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستان کوئے یار

گل نے بلبل سے کہا اے ہمصفیر آیا ترا
کہتی تھی بلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار

اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھکو شکار

کس سے کہتے رازِ پنہا لالہ ہائے شعلہ پوش
کس پہ کہتے دردِ دل اپنا عنادل آشکار

پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب
ہوگیا غائب کہاں اپنے چمن کا رازدار

پھول فرقت میں تری سوزنِ پیراہن رہے
دیدۂ قمری میں تھا صحنِ گلستان خار زار

غنچۂ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں
ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار

کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لیگیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار

کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بوستان غیرت فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گذر

جس کے ذرّے دے عالمتاب کو سامانِ نور
جس کی طور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار

جس کے بلبل عندلیب عقل کل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رخسارِ حور آئینہ دار

خطۂ جنت فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستان کی یادگار

جس نے اسم اعظم محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار

نور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گذر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار

کی وزیر شاہ نے وہ عزت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے تھے نثار

مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار

لیلیٰ معنی کا محمل اس کی نثرِ دلپذیر
نظم اس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار

اس کے فیضِ پاک کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحر گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار

سلسلہ اس کی مروت کا یونہی لاانتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار

دلربا اس کا تکلم خلق اس کا عطرِ گل
غنچۂ دل کے لئے موجِ نفس بادِ بہار

ہو خطاکاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جس کی ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار

ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار

خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دستِ وقفِ کارفرمائی و دل مصروفِ یار

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار

شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

اقبال

مہاراجہ بہادر سے ملاقاتیں

پہلی ملاقات

سنہ ۱۹۱۱ء میں دلی کا دربار ہوا تھا۔ آنجہانی شہنشاہ جارج پنجم نے دلی میں آکر دربار کیا تھا۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بھی بحیثیت مدارالمہام موجودہ اعلیحضرت کے ساتھ تشریف لائے تھے اور اسی وقت میری اُن کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے پہلے سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن کے دربار کے موقع پر بھی مرحوم اعلیحضرت کے ساتھ مہاراجہ بہادر آئے تھے مگر اُس وقت میں نے اُن کو جلوس میں دیکھا تھا۔ ملاقات نہیں کی تھی۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی ملاقات کا تذکرہ پرلطف معلوم ہوتا ہے۔ کیپٹن پریم سنگھ صاحب۔ اے ڈی سی مہاراجہ بہادر نے اس ملاقات کا انتظام کیا تھا۔ کیپٹن پریم سنگھ سابق مہاراجہ نابھ کے خسر تھے اور کسمنڈی کے نواب عبداللہ خاں صاحب نے ملاقات کے وقت تقریب وتعارف کا فرض انجام دیا تھا۔ میرے پاس اس زمانہ میں سواری نہ تھی اور دربار کے سبب دلی میں سواریاں اتنی مہنگی تھیں کہ میں کئی میل پیدل چلکر کشمیری دروازے کے باہر مہاراجہ بہادر کے پاس پہنچا تھا۔ اُس وقت نواب وقارالملک مرحوم سکریٹری علی گڑھ کالج حیدرآبادی زرین بگلوس باندھے مہاراجہ بہادر سے ملنے آئے تھے۔ اور سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے مہاراجہ بہادر نے اپنے برابر کوچ پر بٹھایا۔ میری جوتیوں پر پیدل چلنے سے گرد جمی ہوئی تھی مہاراجہ بہادر نے پوچھا لال قلعہ کے نیچے شاہی میلے میں بہت سے علماء و مشائخ شہنشاہ کے سلام کے لیے گئے تھے۔ آپ کو بھی بلایا گیا تھا یا نہیں؟ میں نے کہا۔ مجھے بلایا تو گیا تھا لیکن میں نہ مشائخ میں ہوں نہ علماء میں۔ اس واسطے میں اس میلے

میں نہیں گیا۔ یہ سنکر مہاراجہ بہادر نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے تعلق کا ذکر کرکے کہا آپ پیرزادے بھی ہیں اور مشائخ بھی ہیں۔ میں نے جواب دیا کتاب فروشی کرتا ہوں۔ سرپر تین سیر کتابوں کا بوجھ اُٹھاکر پھیری لگاتا ہوں۔ اس کے سوا اور کوئی عمل مشائخ اور پیرزادوں کا مجھ میں نہیں ہے یہ سنکر مہاراجہ بہادر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ دوسری باتیں کرنے لگے۔ جو مجھے یاد نہیں ہیں۔ چلتے وقت دو لمبی لمبی عطر سے بھری ہوئی شیشیاں مجھے دیں۔

دوسری ملاقات

۱۹۱۳ئہ میں سر اکبر حیدری صاحب ہوم سکرٹری حیدرآباد نے مجھے حیدرآباد میں بلایا اور اپنا مہمان بنایا میں نے مہاراجہ بہادر سے ملنے کے لئے نواب سالار جنگ بہادر مدار المہام وقت سے کہا۔ اور اُنہوں نے فوراً اپنی گاڑی میں مجھے مہاراجہ بہادر کے مکان پر بھیجدیا مہاراجہ بہادر مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے کہا دنیا کا عجب حال ہے۔ اب تو میرے ہاں چھوٹی کی نیاز میں مشائخ بھی نہیں آتے۔ بات چیت کے بعد مہاراجہ بہادر نے کہا میں قادریہ سلسلے میں حضرت چندا شاہ صاحب سے بیعت کرچکا ہوں۔ اب آپ کے ہاتھ پر چشتیہ سلسلے میں بیعت کرنی چاہتا ہوں میں نے جواب دیا آپ کی نسبت مشہور ہے کہ آپ فقیر اور تصویر کو خوب پہچانتے ہیں۔ پھر تعجب ہے کہ ایک ایسے شخص سے بیعت ہونا چاہتے ہیں جس میں سوائے فقیری نسبت کے فقیری کی اور کوئی بات نہیں ہے۔ بہر حال تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے مہاراجہ بہادر کی بیعت قبول کرلی۔ تب انہوں نے کہا کہ یہ چیز ابھی مخفی رہنی چاہئیے ورنہ لوگ کہیں گے کہ وزارت حاصل کرنے کے لئے بیعت کی ہے۔

چند قصے

میں جب حیدرآباد جاتا تھا تو پہلے سکندرآباد میں ٹھیرتا تھا۔ پھر چند روز مہاراجہ کے ہاں

مہمان رہتا تھا۔ اور اس کے بعد سید عبدالرحمن مرحوم گتہ دار کے مکان پر آجاتا تھا۔ مہاراجہ بہادر روزانہ سکندرآباد اور عبداللہ کے رسالے میں مجھ سے ملنے آیا کرتے تھے۔ دنیا کچھ ہی کہے میں نے ان کو ریاکار نہیں پایا۔ ان کا ظاہر و باطن مجھے تو ایک ہی معلوم ہوا۔ اور اعلیحضرت سے تو ان کو اتنی محبت تھی کہ ہمیشہ تخلیے کی باتوں میں بھی وہ اعلیحضرت کا نام بہت ہی ادب و احترام سے لیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایسا بیدار مغز رئیس اس وقت ہندوستان میں کوئی نہیں ہے

ایک دن شام کو بارش ہو رہی تھی۔ اور اُن کے ملازم شاعروں میں سے ایک بڑھے شاعر صاحب مغموم بیٹھے تھے۔ مہاراجہ نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ شاعر صاحب کھڑے ہوگئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا " خداوند نعمت کو معلوم ہے فدوی نے سولہ برس کی ایک لڑکی سے پرسوں نکاح کیا ہے۔ مکان کھپریل کا ہے۔ اور بارش میں ٹپکتا ہے۔ آج آفت جان بیوی نے میرا کان پکڑ کے کہا اگر اچھا مکان میسر نہ تھا تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔ گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں کپڑے رکھوں۔ ہر جگہ سے گھر ٹپک رہا ہے۔ بیوی سے کان چھڑا کر میں فوراً یہاں حاضر ہوگیا۔ اب اس غم میں بیٹھا ہوں کہ بارش لگاتار ہو رہی ہے۔ خبر نہیں بیوی پر کیا گزر رہی ہوگی "

مہاراج نے تبسم کیا اور ایک پرچہ لکھکر پیشی کے کسی شخص کو دیدیا۔ کچھ دیر کے بعد شاعر صاحب سے کہا جائیے فلاں مکان ضروری سامان سے آراستہ کرادیا گیا ہے وہاں اپنی بیوی کو لے جائیے۔ شاعر صاحب کی خوشی کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ مگر میری آنکھوں میں بھی پرانے زمانے کی فیاضیوں کا ایک منظر آگیا اور مجھ پر اس واقعہ کا جدید اثر ہوا۔

دوسرا قصہ

ایک دفعہ میں مہاراجہ بہادر کا مہمان تھا۔ اور میرا ذاتی نوکر میرزا صاحب شاہ میرے ساتھ تھا جو مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد میرزا دارا بخت کا پوتا ہے

اور جو اپنے بچپن سے میرے ہاں خدمت گاری کرتا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے میری دعوت کی جس میں چند امرا اور مشائخ کو بھی بلایا۔ اس وقت وہ باب حکومت کے صدر اعظم تھے میں نے دستر خوان پر میرزا کو اپنے برابر بٹھا لیا۔ حاضرین دستر خوان کی نظریں اٹھیں اور اشارے کنائے ہونے لگے کہ نوکر کو برابر بٹھا لیا ہے۔ مہاراجہ بہادر نے بھی اس کو محسوس کیا۔ وہ میرے برابر بیٹھے تھے۔ میرے کان میں کہا یہ کون صاحب آپ کے برابر بیٹھے ہیں؟ میں نے کہا میرا نوکر ہے۔ یہ جواب دے کر میں خاموش ہو گیا۔ اور وہ بھی خاموش ہو گئے کچھ دیر کے بعد مہاراجہ بہادر نے پھر آہستہ سے کہا غالباً کوئی وجہ اس نوکر کو برابر بٹھانے کی ہوگی؟ میں نے پھر ادھورا جواب دیا اور کہا جی ہاں۔ اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ مہاراجہ بھی کچھ دیر چپکے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کیا میں اس وجہ کو سن سکتا ہوں۔ میں نے کہا جی ہاں یہ وہ شخص ہے کہ اگر وقت مخالف نہ ہو جاتا تو یہ ہندوستان کا شہنشاہ ہوتا۔ کیونکہ بہادر شاہ کے پہلے ولی عہد کا بڑا پوتا ہے۔

مہاراجہ بہادر کے جسم میں ایک کپکپی ہوئی اور انہوں نے ایک جھرجھری لی۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے اعلیحضرت کی بارگاہ میں ایک معروضہ گزرانا اور بارگاہ خسروی سے میرزا سہراب شاہ کے نام بیس روپے ماہوار مقرر ہو گئے جو آج تک ملتے ہیں۔

القصہ مہاراجہ بہادر کی ساری زندگی مروت۔ فیاضی۔ خدمت خلق۔ ہمدردی۔ شاہ پرستی میں گزری اور لاکھوں واقعات ان کی زندگی کے اس قابل ہیں کہ وہ دوسروں کی تقلید کے لئے اور قدیمی تہذیب و تمدن کو برقرار رکھنے کے لئے قلمبند کئے جائیں۔ میں نے تو آنکھوں کی معذوری کے سبب صرف یہ مختصر مضمون لکھوا دیا۔

حسن نظامی

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

زمانہ بدل رہا ہے اور بدلتا رہے گا۔ اس کے ساتھ انسانی تہذیبیں تبدیل ہو رہی ہیں۔ اور انسانی شائستگی کے معیار بدل رہے ہیں۔ آج سے پچاس برس پہلے اگر کسی کو ہندوستان کے اکابر اور امرا کی صحبتیں نصیب ہوئی ہوں اور وہ آج انہی کی صحبتوں میں پھر بیٹھے تو محسوس کرے گا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں آگیا ہے یا دور کیوں جائے۔ گذشتہ ربع صدی میں حیدرآباد کی تہذیب کچھ اتنی بدل گئی ہے کہ آج پچیس برس پہلے کے واقعات افسانے کی طرح پڑھے جاسکتے ہیں۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کو ہندوستان اور دکن میں مشرقی اور مغربی تہذیب کا سنگم کہا جاسکتا ہے۔ راجہ نریندر آنجہانی کی آغوش تربیت نے ان میں وہ ساری صفات جمع کردی تھیں جو قدیم امرا ہند کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ خود بیان کرتے تھے کہ راجہ نریندر کبھی کبھی محبت میں ان کی نسبت اپنے مصاحبین سے کہتے کہ اس لڑکے کے بنانے میں میں نے تین لاکھ روپئے صرف کئے ہیں۔ ان کی اخلاقی تعمیر عجیب ہمہ گیر صفات کے مسالے سے ہوئی تھی۔ آج ہم کو ان کے مرتبہ رکھنے والوں کی صف میں ایک آدمی بھی ان صفات سے متصف نظر نہیں آتا۔ ان کی صحبت ایک دبستانِ علم و ادب تھی جہاں بیٹھکر ذوق علم رکھنے والے کا دل اٹھنا گوارا نہ کرتا تھا۔ اور کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جس میں وہ اپنی رائے نہ رکھتے ہوں۔ فلسفہ، تصوف، علم کلام، شعر و ادب ہر فن کے باکمال لوگ اگر کسی محفل میں یکجا دیکھے جاسکتے تھے تو وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کی محفل تھی۔ میں خود اپنی زندگی کی تعمیر میں ان کی اِن محفلوں کا بہت بڑا حصہ تصور کرتا ہوں اور اپنے قلب کو ان کے لئے

جذباتِ تشکر سے معمور پاتا ہوں۔ آج ایک بھی صحبت ایسی نہیں نظر آئی جہاں ایک عظیم المرتبت امیر ہونٹوں پہ کھیلتی ہوئی مسکراہٹ، چمکتی ہوئی پیشانی، انکسار و تواضع کے ساتھ جھکی ہوئی گردن اور ہر ایک دل پر اپنی محبت کا سکہ جما دینے والے اخلاق کے ساتھ صدرِ بزم ہو۔ اس کے اطراف ایک طرف شاعر دوسری طرف علما، تیسری طرف سیاست داں اور ماہرینِ قانون، اسی طرح بیٹھے ہوں جس طرح کوئی احباب کی بے تکلف صحبت میں بیٹھتا ہے اور ہر شخص اس محفل سے اٹھے تو اس یقین کے ساتھ اٹھے کہ مہاراجہ بہادر سب سے زیادہ مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی بزمِ علم و امارت میں میں ہی سب سے زیادہ مقبول ہوں۔

اس سارے انکسار و تواضع کے ساتھ امارت کا دبدبہ اور د. بار داری کی شان میں کبھی فرق نہ آیا۔ چوبدار کی للکار، نقیبوں کی گرج، دو سنار، دیگلوس لگائے ہوئے سکریٹریز کی چہل پہل ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی ایک نو وارد کو مرعوب کر دیتی۔ لیکن ان کی محفل میں پہونچکر اُن کے پر محبت دو جملے اس کے رعب کو انس و محبت سے بدل دیا کرتے۔

انھوں نے اپنے انتہائی مخالف اور دشمن کے ساتھ بھی حسن سلوک سے کبھی دریغ نہ کیا ان کا دستِ کرم اپنے اور غیر کو پہچاننے میں ہمیشہ عاجز رہا۔ بذل و نوال ایک بہتا ہوا دریا تھا جس سے ہر شخص بقدر ظرف سیراب ہو جاتا تھا۔ وضعداری میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ذات پر ختم ہوگئی۔ سخن سنج ان کے کلام کو پڑھ کر ان کے ادبی مذاق کا خود اندازہ کریں گے لیکن اس فن میں ان کی پختہ مشقی ان کے نزدیک بیٹھنے والوں کو حیران کر دیا کرتی تھی۔ محفل میں ہر شخص محوِ تکلم ہے گفتگو کا سلسلہ جاری ہے، سننے جا رہے ہیں اور موقع بہ موقع خود بھی کچھ کہہ رہے ہیں لیکن کسی کا کوئی مصرع پسند آگیا ہے اس پر غزل ہو رہی ہے۔ بار بار کاغذ اٹھاتے ہیں اور اس پر کچھ لکھ کر باز و رکھ دیتے ہیں محفل ختم ہونے لگتی ہے تو کسی خوش گلو شریکِ بزم کی طرف وہ کاغذ بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور سننے والے ان کی بدیہہ گوئی پر حیران رہ جاتے ہیں۔ مادہائے تاریخ نکالنے کا ان کو خاص ملکہ تھا۔ صرف اپنے ذہن کی تختی پر حساب کر لیتے اور فوراً مصرع لگا کر بیٹھنے والوں کو قطعہ سنا دیتے۔ جب مفتی نور الضیاء الدین

ضیا یار جنگ ہوئے تو ان کی خطاب یابی کی تاریخ "علامہ ضیا یار جنگ بہادر" خطاب یابی کی خبر پاکر برجستہ اور چند لمحوں میں کہی جو باعثِ حیرت تھی۔

حاجت مندوں کی حاجت روائی ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ اگر خود اس کا کام نہ نکال سکتے تو دوسروں سے سفارش کر دیتے تھے۔ اور کبھی ان کو خیال نہ آتا کہ ان کے مرتبہ کے لحاظ سے یہ سفارش موزوں بھی ہے یا نہیں۔ ان کے دل میں کدورت کے لئے کوئی جگہ ہی نہ تھی۔ رقیق القلب تھے اور شاید یہی رقتِ قلب ہر کدورت کو ان کے آئینۂ دل سے دھو دیا کرتی تھی۔ ان کی آنکھیں گنگا جمنا بہانے لگتیں جب وہ اپنے محبوب القلوب آقا اعلیٰحضرت آصف سادس مرحوم و مغفور کا ذکر کرنے لگتے۔ گھنٹوں ان واقعات کو ان سے سننے کے بعد بھی یہ محسوس ہوتا کہ آج وقت نے اپنی رفتار بھلا دی ہے اور گھنٹے منٹوں کی رفتار سے گزر رہے ہیں۔ مالک کے ساتھ عقیدت اور وفاداری ان کا مذہب تھا۔ ان کی محفل میں کسی کی مجال نہ ہوتی تھی کہ اشارۃً یا کنایۃً بھی بادشاہ کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالے۔ ہندو ہونے کے باوجود میری زنانہ اصلاحات کی کوششوں کو انھوں نے نہ صرف پسند کیا بلکہ ہمت افزائی کی اور اس میں صرف ایک جذبہ کام کر رہا تھا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ بادشاہ اور اس کے اقتدار کے تحفظ کے لئے کر رہا ہوں۔

خدا نے ان کی ساری خوش بختیوں میں اولاد کے رنج کی کسک رکھ دی تھی جس سے وہ بہت متاثر رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے قبرستان میں اپنے متوفی بچوں کی قبریں دکھاتے ہوئے اتنے متاثر ہوئے کہ اس محفل میں پھر کوئی بات نہیں کی۔ اسی نقصان نے ان کو اپنی موجودہ اولاد سے غیر معمولی محبت پیدا کر دی تھی۔ ان میں سے کوئی ذرا بھی بیمار ہوتا تو ان پر ایک دیوانگی کا عالم طاری ہو جاتا اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ اس رات کو میں کسی طرح نہیں بھلا سکتا جب کہ راجہ خواجہ پرشاد بہادر کی آنکھ میں ضرب آئی ہے۔ بلا مبالغہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ مہاراجہ کی دونوں آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ ان سے قریب رہنے والوں نے اولاد کی محبت کے بڑے عجیب عجیب منظر دیکھے ہیں۔ بعض دفعہ ان کی محفل میں بیٹھ کر ایک شخص اس مسلّمہ حقیقت کو بھلانے پر آمادہ ہو جاتا تھا کہ باپ کی محبت ماں سے کم ہوتی ہے۔ اس خاص مسئلہ میں وہ نفسیات کے طالب علموں کے لئے بہت اچھی مثال تھے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز ان کی زندگی کا مذہبی پہلو تھا۔ دسہرہ و دیوالی میں ہندو پنڈت پھول اور میوے کی تھالیوں کے ساتھ آتے ان کی پیشانی پر قشقہ لگاتے اور اپنے مذہبی اشلوک پڑھ کر ان پر دم کرتے۔ اور وہ ایک سچے بھگت کی حیثیت میں نہایت احترام سے اس کو قبول بھی کرتے۔ ابھی چند لمحے نہیں گزرنے پاتے کہ ان کی زبان سے قرآن مجید کی آیتیں پھول کی طرح جھڑنے لگتیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مسلمان کے سوا کچھ اور ہیں۔ دیکھنے والا ان متضاد کیفیات سے بھی حیران ہی ہوتا کہ شاگرد پیشہ بڑے ادب سے بناشہ کی ایک پڑیا ان کی خدمت میں پیش کرتا اور وہ فوراً اس پر کچھ دم کرنے لگتے۔ حزب البحر سے ان کو عشق تھا۔ اور اس عمل سے متعلق اپنے معجزے بار بار بیان کرتے تھے۔ خواجہ سلطان الہند غریب نواز کا ان سے بڑھ کر معتقد میری نظر سے نہیں گزرا۔ ہر مہینہ کی چھٹی تاریخ خواجہ صاحب کی نیاز ہوتی۔ اور مجلس سماع میں خود شرکت کرتے۔ آخری زمانہ میں حیدرآباد کا محرم اگر اپنی سابقہ شان میں کہیں دیکھا جا سکتا تھا تو وہ مہاراجہ بہادر کی دیوڑھی تھی۔ سارا جلوخانہ آئینہ خانہ بن جاتا تھا۔ علم بٹھائے جاتے۔ منقبت شہدائین ان کے تازہ قطعات دیوڑھی کے کنگروں پر آویزاں کئے جاتے۔ ذکر شہدا سے ان کی محفل گرم ہوتی۔ دریاد شہداء میں ان کی آنکھوں کے آنسو نہ سوکھتے تھے۔ ان کی محفل کا سب سے بڑا مبلغ اسلام شاید میں رہا ہوں اور اسوہ حسنہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی پاک اور بے نفس زندگی، اور قرن اول کے دل ہلادینے والے واقعات اولیاء کرام کے تذکرے تصفیۂ نفس و تصفیۂ قلوب بیان کر کر کے میں نے ان کو بار بار رلایا ہے۔ اور کبھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں ایک غیر مسلم سے یہ چیزیں بیان کر رہا ہوں۔

مہاراجہ بہادر کی زندگی ایک ایسا گلدستہ تھی جس کے ہر پھول کی رنگینی اور ہر کلی کی بو دیکھنے اور سونگھنے والے کو اپنا کر لیتی تھی۔ آہ وہ گلدستہ مرجھا گیا! اب حیدرآباد میں کوئی ایسی محفل نہ رہی جہاں بیٹھ کر بیک وقت کوئی اپنے آپ کو دربار امیر اور محفل علماء میں محسوس کرتا! مہاراجہ نے حیدرآباد کی امارت کا آخری چراغ گل کر دیا! آہ کسی نے سچ کہا ہے

کہ ان کی موت وضعداری کا جنازہ تھی" اور میں کہتا ہوں کہ ان کی وفات دکن کی قدیم تہذیب و شائستگی کی موت تھی، جس کو آنکھیں ترستی رہیں گی اور کان افسانہ کی طرح سنیں گے!!

بہادر یار جنگ

صوفی شاد

دیر و حرم کے فرق سے دل دور تھا ترا
یعنی ولائے ذات سے دل چور تھا ترا
گم ہو گیا تھا جلوۂ معنی میں اس قدر
ظلمت گہ مجاز میں دل نور تھا ترا

مرزا متین احمد بیگ سرور

چند باشی بسوئے خود نگران پند گیر از گزشتن دگران
واعلت مرگ ہم نشینان میں اوستادت فراقِ اینان بس

مرثیہ

ایک مرتبہ میرے ایک کرم فرما نظیری نیشاپوری علیہ الرحمہ کی ایک غزل کا یہ مصرعہ لے کر آئے۔

"حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم"

اور اس پر غزل لکھنے کی فرمایش کی۔ میں نے کہا کہ ایسے استاد کی ایسی غزل پر غزل لکھنا اپنے آپ کو ہنسوانا اور رسوا کرنا ہے مگر وہ برابر اصرار کرتے رہے مجبوراً غزل لکھنی پڑی۔ یہ غزل سرمہاراجہ یمین السلطنت کی کئی صحبتوں میں پڑھی گئی۔ ایک مرتبہ ایک قوال نے اسے گا کر سنایا۔ وقت کی بات تھی اس غزل کے ذیل کے اشعار سے سرمہاراجہ بے حد متاثر ہوئے۔

میانِ پختہ کاراں بود بحثِ خویشتن داری
نہ او ترکِ جفا کرد و نہ من ترکِ وفا کردم
شنیدم نالہائے بے نوایاں زود می شنود
دہن را بستم و نائے گلو را بے نوا کردم
مذاقِ دل نمی شد آشنائے تلخیٔ دوراں
باین داروئے تلخش رفتہ رفتہ آشنا کردم

اور جب قوال اس مقطع پر پہونچا۔

بصحرائے عدم آباد بر ہر نقش پا محوی
بیاد کارواں ہائے گزشتہ نالہا کردم

تو مہاراجہ پر بہت رقت طاری ہوئی اور صحبت میں سناٹا سا چھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ محوی صاحب آپ کا مقطع کیا ہے ایک پورا اور موثر مرثیہ ہے۔ گزشتہ عزیزوں دوستوں اور ملنے والوں کی صحبتیں اور جلسے یاد آگئے اور دل بے قابو ہو گیا۔ آپ نے یہ شعر کس وقت لکھا ہوگا اور یہ اثر کس طرح پیدا کیا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے جو اثر ہوا وہ جناب والا کے حساس اور پُر درد دل کا کرشمہ تھا۔ اس پر مراثی کے متعلق گفتگو ہونے لگی اسی ضمن میں میں نے عرض کیا کہ مرثیہ گوئی میں اہل عرب اہل عجم سے بہت بڑھے ہوئے ہیں اور ان کے بعض مرثیوں کے دو ایک شعر سنائے جو اس وقت مجھے یاد آئے۔ اور عرض کیا کہ فارسی ادب بڑی حد تک شخصی مراثی سے خالی ہے۔ جناب والا کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہندوستان کے فرماں روا خاندانوں شملاً غزنویوں، غوریوں، خلجیوں، تغلقوں، لودھیوں مغلوں میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ اور ایسے امراء گزرے ہیں جنھوں نے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں شاعروں کی نہایت دریا دلی اور فیاضی کے ساتھ پرورش اور سرپرستی کی تھی اور جن کی تعریف اور مدح میں ان کے سینکڑوں قصیدے موجود ہیں مگر ان کے مرنے پر کسی ایک شخص کے مرثیہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ سلطان محمود غزنوی کے درباری شعرا کی تعداد دو سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے مگر اس کے مرنے پر فرخی کے ایک مرثیہ کے سوائے کسی شخص کا مرثیہ نہیں ہے۔ مہاراجہ نے دریافت فرمایا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ میں نے بہ تفصیل وجوہ بیان کئے جو بخوف

طوالت بطور اختصار یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

اول :- یہ کہ قدیم شعرا اور خصوصاً وہ شعرا جو دوسرے ممالک سے آکر درباروں میں داخل ہوتے تھے پیشہ ور شعرا ہوتے تھے یعنی ان کی معاش کا ذریعہ شاعری ہوتا تھا۔ مدح میں خوشنودی اور صلے کی امید ہوتی تھی اور اسی طرح بیں وہ لکھے جاتے تھے۔ مردہ شخص سے اس کی کیا توقع ہوسکتی تھی۔

دوسرے :- یہ کہ امرا اور خصوصاً بادشاہوں میں باپ بیٹوں میں عموماً صفائی نہ ہوتی تھی اس لئے شعرا گزشتہ بادشاہوں کا مرثیہ لکھنے میں پس و پیش کرتے تھے۔

تیسرے :- یہ کہ مرثیہ بغیر دلی خلوص محبت اور بے لمعی کے نہیں لکھا جاسکتا اور یہ ظاہر ہے کہ کتنے آدمیوں میں یہ اوصاف پائے جاتے ہیں۔

رہبار اجہ یہ سن کر بے اختیار بول اٹھے کہ ایسی حالت میں ہم جیسے لوگ کس شمار میں ہیں اور ہمیں کیا امید ہوسکتی ہے کہ ہمارے بعد ہمیں کوئی یاد کریگا میں نے عرض کیا کہ جناب والا کی ہر دلعزیزی اور شعرا نوازی ایسی نہیں ہے کہ کوئی شخص خصوصاً طبقۂ شعرا آپ کو بھول جائے۔ فرمایا کہ آپ اپنی ذات سے اس کا وعدہ کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا اس شرط سے کہ آپ بھی اسکا وعدہ فرمائیں۔ فرمایا اگر میں آپ کے بعد زندہ رہا جس کی کوئی امید نہیں ہوسکتی، تو میں بھی جیسا مجھ سے ہوسکا اپنا وعدہ وفا کروں گا۔ ہمارے باہمی وعدوں کی مختصر تاریخ یہ ہے۔ اس قرار داد کے مطابق جو مرثیہ مابین لکھا گیا ہے وہ نذر ناظرین کیا جاتا ہے۔

مسعود علی محوی

بند اوّل

بیک گردش تہ و بالا جہانست — زمین گردندہ تر از آسمانست
بہ ہر خانہ ست برپا شور ماتم — بہ ہر جا زورِ مرگ ناگہانست
نہ در امن ست زو درویش مسکین — نہ از وے بے خطر شاہ شہانست
برابر میکند شاہ و گدا را — یکے پیشش قوی و ناتوانست
چہ جوئی رازِ مرگ و زندگانی — کہ آن بالاتر از وہم و گمانست
ہزاران موج و گرداب بلاہا — بہ پیشِ کشتیِ عمرِ روانست
نہ دنیا ہست منزل گاہ مقصود — نہ آن جائے قیام جاودانست
چو از خاک ست باید خاک گشتن — ہر انسان را کہ در این خاکدانست
چہ گویم با تو دل آزاری مرگ — کہ شب کوتہ دراز این داستانست
ز آزارش دل ناداں چہ نالی — کہ آن حکمِ خدائے انس و جانست
بہ حکم او سرِ طاعت نہادن — وجوبِ عام و فرضِ خاصگانست
چہ جائے سرزنش گر آشنائے — بہ ہجرِ آشنائے نوحہ خوانست
مگو آن مرد کافر این مسلمان — کہ این علمِ خدائے غیب دانست
در دیر و کلیسا و حرم را — چو نیکو بنگری یک آستانست

مشو منکر کہ قولِ صادقانست
کہ بعد این جہاں ہم یک جہانست

بند دوم

مہاراجہ چو عزم آن جہاں کرد — جہانے در غش آہ و فغان کرد

گلستان بود از وے منزلِ شاد　　　خزاں از رفتنش آں گلستان کرد
بسے رخسارۂ گلگوں و شاداب　　　غم او زرد تر از زعفران کرد
مژہ در چشم نوکِ نیشتر شد　　　نفس اندر گلو کارِ سناں کرد
مدام اندر سفر یک کارواں داشت　　　چگونہ ایں سفر بے کارواں کرد
ہمیشہ در حضر با دوستاں بود　　　ندانم چوں کنارہ از دوستاں کرد
بہ اندازِ وفاداراں دل و جاں　　　نثارِ خدمتِ شاہ زماں کرد
ز فطرت مایلِ بذل و سخا بود　　　بوسعِ خویش بذلِ بے کراں کرد
چو سرمستِ تصوف بود شبہا　　　بخلوت میکشی با میکشاں کرد
بہارے بود بزمِ اہلِ فن را　　　چو او بگزشت ایں گلشن خزاں کرد
ہزاراں نونہالانِ دکن را　　　دبیر و شاعرِ شیریں زباں کرد
بہ ہر ملک ست شورِ نوحۂ او　　　نہ تنہا ماتمش ہندوستاں کرد
مومن بود و از یزداں عجب نیست　　　اگر آتش براو باغِ جناں کرد
چو در دل دہشتِ روزِ جزا داشت　　　دعائے بخششِ او می تواں کرد

دعائے دردمنداں مستجابست
نزولِ رحمتِ حق بے حسابست

(بند سوم)

چہ می پرسی مہاراجہ چہا داشت　　　نشانِ مجد و آثارِ علا داشت
بجاں ہمدرد ہر ایک آشنا بود　　　چو در پہلو دلِ درد آشنا داشت
بایں دریا دلی بذل و سخاوت　　　ز دوست کوتہ خود نالہ ہا داشت
نمی داد از بقدرِ ہمت خود　　　ز روئے سائلِ مسکیں حیا داشت

عطایش پرده پوش هر خطا بود — پئے هر یک خطا چندیں عطا داشت
اگر خواهم، به پس از بے نوایاں — که چوں دستِ کرم بر بے نوا داشت
سخن را مه پرست و قدرداں بود — نگاهِ نکته بین، فکر رسا داشت
فدائے علم و شیدائے هنر بود — مذاقِ شعر از عهد صبا داشت
اگر از راں نه و هندِ خدا بود — چه ساں الفت به مرداں خدا داشت
به شکرِ نعمتِ الطافِ شاهی — زبان وقف دعائے پادشا داشت
ربودی برد هم راهن دلاں را — مگر خاصیتِ آهن ربا داشت
بسے چوں قمری آشفته خاطر — بهی خواه و محبِ بے ریا داشت
سپرهاے دعائے دردمنداں — به هر مشکل پئے ردِ بلا داشت
ولے در جنگ مرگ و زندگانی — نه پرزا من از تیر قضا داشت

زنیکی در جهاں نام و نشان یافت
پس از مردن حیات جاویداں یافت

(بند چهارم)

به هر نوعیکه ممتاز و متین بود — مهاراجه در آں کرسی نشیں بود
مدیحِ مصطفیٰ مدحِ خدا کرد — گمانم ایں که از اهل یقین بود
به آئین قدیم شه پرستی — بعزم راسخ و رائے رزیں بود
مروت بود گر شخص مجسم — یمین السلطنة دست یمیں بود
دلِ بیمار ز وی می‌یافت تسکیں — بگفتارش شفائے انگبیں بود
به مهماں داری و بیکس نوازی — امیر بے مثال و بے قریں بود
قبول دعوتش از هر که دمه — سزاوار هزاراں آفریں بود

خموشی، سرگرانی، کج ادائی　　چو خوباں ہر ادایش دل نشین بود
بروئیکش چو بر خلق است روشن　　چہ گویم آں چناں و ایں چنیں بود
بقول شہ بساطِ اولین را　　یکے از مہرہ ہائے آخرین بود
رداے کہ در بیاں کندنی است　　دم آخر نگاہ واپسین بود
زمیں می خواست گیرد در کنارش　　فلک در فکر عمل آتشین بود
زمیں مغلوب گشت و چرخ غالب　　چو برتر از زمین چرخ برین بود
پئے ہر بادہ کش تا بود ساقی　　شراب خوش دلی در ساتگین بود

نہ آں بادہ ست در میخانہ ساقیست
اگر باقیست درد کز خمے باقیست

ماخوذ از سب رس (جولائی ۱۹۵۲ء)

مہاراجہ کی سیرت
کے
بعض پہلو

ہر قوم کی تہذیب و شائستگی کے حوالے اور ثبوت افراد قوم کے انسانی اور اعلیٰ خصائل میں ملتے ہیں۔

دنیا کے دور تسلسل میں قومی ترقی و تنزل کے اسباب بہی خواہان ملک کے ایثار اور جذبہ وطنیت اور بد سگالان قوم کی خود غرضیوں اور کج رویوں سے وابستہ رہے ہیں۔

اچھی سیرتوں کی نسبت اہل ملک کے مذاق کو درست معیار پر قایم رکھنا ضروری ہے۔ ان افراد قوم کی جو اپنی زندگی کے دن نفس کی شرافت کے ساتھ ملک سے محبت کا حق ادا کرنے میں پورا کئے ہوں، سیرتوں کے نقوش قومی سرمایہ ہوتے ہیں۔

نیک سیرتوں کے اصلی نمونے اہل عمل کے لئے چراغ ہدایت ہیں جو بصیرت بخشتے ہیں اور مکروہات زمانہ کے ساختہ پرداختہ غلط نمونے قومی تخیلات میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ سچے اکابر قوم کی تعظیم ان کی یاد کا احترام ان کے مثال کی تمثیل قوم کی زندگی پر اور ان سے انحراف اور بے پروائی قوم کی موت پر دلالت کرتے ہیں۔

سلطنت آصفیہ دکن صانہا اللہ عن الشر والفتن ہندوستان کی اپنی قومی حکومت کی باقیات الصالحات ہے۔ اس سلطنت کا وجود کسی اتفاقی سیاسی گردش کی بنا پر نہیں بلکہ بطور بقائے اصلح



[illegible]

AZAM STEAM PRESS

اس ریاست کو بنانے اور بڑھانے والوں کی جان توڑ کوششوں قربانیوں اعلیٰ ہمتوں اور عادلانہ عمل کا نتیجہ ہے ۔ اس ریاست کی مزید ترقی بھی انہی روایات کی بقاء اور ارتقاء پر منحصر ہے ۔

حیدرآباد کے سوراج نے امیروں غریبوں سپاہیوں عہدہ داروں منصبداروں تاجروں ساہوکاروں جمعداروں جاگیرداروں میں ایسے کئی افراد پیدا کئے جو مروت محبت رواداری ایثار جرات اور بہادری کے قابل ذکر اعلیٰ صفات رکھتے تھے ۔

آصفجاہی درباروں کے امیر امارت کی شان و شوکت اور بذل وعطا میں مشہور رہے اور ہر دور میں امیرانہ صفات کے ایسے امیر گذرے ہیں جن کے سوانح حیات دکن کی تاریخ کے مستقل باب رہیں گے ۔

راجہ راجایان مہاراجہ بہادر سرکشن پرشاد یمین السلطنتہ آنجہانی راجہ ٹوڈرمل اور مہاراجہ چندولال کی آل سے تھے ۔ سلطنت آصفیہ میں بڑی عزتوں کے حامل رہے نواب سالار جنگ اول مختار الملک مرحوم ومغفور نے مہاراجہ آنجہانی کی تربیت میں دلچسپی لی تھی ۔ غفران مکان حضرت میر محبوب علی خان آصف سادس نے مہاراجہ کو پیشکار وزیر فوج اور مدار المہام بنایا اور اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خان مدظلہ العالی نے گیارہ سال تک نہ صرف صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی مقرر فرمایا بلکہ ایسے مراحم خسروانہ مبذول فرماتے رہے کہ مہاراجہ آنجہانی جو سلطنت آصفیہ کے دل سے جان نثار اور خیر خواہ تھے اعلیٰحضرت کے ساتھ اطاعت کیش عشق رکھتے تھے ۔

اس مضمون کو صرف مہاراجہ کی سیرت کی حد تک محدود رکھا جاتا ہے اولاً ان کی پبلک خدمات کا تذکرہ اس کے خطوط سے باہر ہے دوسرے یہ کہ مہاراجہ کی بصیرت افروز سرکاری خدمات کے تذکرہ کو مکمل کرنے کے لئے محکمہ جات سرکار عالی کے ریکارڈس کے استعمال اور ان کی اشاعت کی اجازت درکار ہوگی جس کے بغیر اس رخ پر قلم اٹھانا مناسب نہیں ۔ مہاراجہ کی خوبیوں پر اسی وقت بہتر روشنی پڑسکتی ہے کہ ان کے جس قدر ملنے والے باقی ہیں وہ مہاراجہ کے تعلق میں آپ بیتی قلمبند کریں یا ایسی آپ بیتیوں کا مجموعہ ترتیب دیا جائے تو وہ ایک دکھنی امیر کے خصوصیات کا آئینہ دار ہوگا ۔

مہاراجہ نے تقریباً اسی سال کی عمر پائی اس طویل مدت میں جن حالات اور صحبتوں سے وہ گذرے اُن کی دلچسپیوں کے تناسب سے مہاراجہ مقبولیت عام کے مد نظر یگانہ فرد تھے مہاراجہ کی خوبیاں جب سے ہوش سنبھالا ہے سنتا رہا جب ان کی خدمت میں کام کرنے کا موقعہ ملا تو جو سنا تھا اس سے کہیں زیادہ ان کی شرافت اور انسانیت کے تجربے حاصل ہوے۔

مہاراجہ بکنیٹہ باشی کی شخصیت بڑی جاذب تھی ان سے جو کوئی ملتا تھا خوش ہوتا تھا۔ خواہ وہ بچہ ہوا، جوان ہوا، بڈھا ہوا، تاجر ہوا، سیاح ہوا، سیاس ہوا، حکیم ہوا، شاعر ہوا، چھوٹے سے چھوٹا یا بڑے سے بڑا، شرقی ہو یا مغربی ہو ان کا مدح سرا ہوا۔ ہر شخص ان کی تعریف میں کوئی نئی بات سناتا۔ کوئی ان کے سلام کے طریقہ سے خوش ہوتا تو کوئی ان کی مزاج پرسی کے طرز سے مسرور ہوتا کوئی ان کے تبسم میں ہمہ گیر محبت کی جھلک دیکھتا تو کوئی ان کی گفتگو میں مستحکم خلوص کی صدا سنتا۔ کوئی ان کو حاتم کہتا تو کوئی عہد مغلیہ کی آخری یادگار۔

مہاراجہ کے سلام کے مختلف مدارج ہوتے تھے۔ سلام کے جوابوں کے مختلف معیار تھے ایک ہی صحبت میں مختلف حیثیتوں کے حاضرین سے الگ الگ انداز تخاطب ہوتا امراء کے چھوٹے بچوں کو مہاراجہ ایسی تعظیم دیتے کہ گویا وہ مہاراجہ کے برابر کے تھے مہاراجہ سے پوچھا گیا کہ بچوں کو اتنی زیادہ تعظیم کیوں دی جائے تو فرمایا کہ نواب سالار جنگ اول کی تعلیم ہے۔ تہذیب و سنجیدگی مہاراجہ مرحوم کی صحبتوں کے خاص امتیاز تھے کوئی حد سے بڑھتا بھی تو محفل کے رنگ اور مہاراجہ کے تیور سے فوراً ہی سہم جاتا۔

صبح کی ملاقات عام میں عجیب عجیب لوگ جمع ہوتے تھے ان میں بعض غیر مخلص بھی ہوتے تھے۔ مہاراجہ خوب جانتے تھے کہ اُن کی شرکت کی کیا غرض ہے لیکن کبھی یہ ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے کہ ان کی نظر میں کوئی گرا ہوا ہے۔ دوسرے کے عیب کو چھپانے کی مہاراجہ میں خاص صفت تھی اس صفت کی وجہ سے بہت سے اشخاص دنیا کی ملامت سے محفوظ رہے۔

مہاراجہ کی وفات کے روز شام کے پانچ بجے سے صبح کے پانچ بجے تک ان کی ڈیوڑھی پر

اور دیوڑھی سے پُرانے پل تک لاکھوں اشخاص کا مجمع تھا مفتی، ملاّ، برہمن، سکھ، مہنت، پادری، بدستور سب جمع تھے اور ہر ایک یہ محسوس کرتا تھا کہ ان کا بڑا دوست جُدا ہوگیا۔ عام مجمع میں ہر شخص کی زبان پر کوئی نہ کوئی کلمۂ خیر تھا۔ جب ارتی گذرتی تھی، راستہ پر عورتیں پکارتی تھیں "کشن پرشاد مرگئے" اور بچے چلاتے تھے "بچے والے راجہ" عجیب سماں تھا جس سے مہاراجہ کی نیکیوں کے غیر معمولی پھیلاؤ کا ثبوت ملتا ہے۔

عموماً مہاراجہ عادتاً صبح چار بجے بیدار ہوتے تھے۔ بیداری کے بعد سانس بند کرنے کی مختلف ریاضتوں سے فارغ ہوکر مراقبہ کیا کرتے تھے۔ صبح چھ بجے کے قریب برآمد ہوتے تھے۔ حاشیہ کے لوگوں سے بات چیت کے بعد خطوط لکھتے تھے یا پینٹنگ کرتے یا شعر لکھتے تھے۔ سات بجے سے مقررہ ملاقاتی حاضر ہوجاتے ان کے ساتھ چائے پیتے اور چائے کے بعد باہر جانے کو تیار ہوتے باہر جانے سے قبل پیشی کی تجوری کا معائنہ کرتے اور یہ اطمینان کرلیتے کہ اس دن کی خیرات کے لئے تجوری کے مختلف خانے جو مختلف سکوں اور کرنسی نوٹوں کے لئے مقرر تھے بھر دئے گئے ہیں اگر تجوری خاطر خواہ معمور نہ ہوتی ناخوش ہوتے۔ معمور ہوتی تو مطمئن ہوکر حاجتمندوں کا انتظار شروع کرتے۔ اس موقعہ پر ایک نفسیاتی نکتہ قابل ذکر ہے۔ مہاراجہ کی طبیعت میں خیرات دینے کی ایک طلب سی تھی کسی روز کم خیرات ہوتی تو وہ بے چین رہتے تھے۔ قلمدان اور تجوری خالی ہوجائے تو بہت خوش نظر آتے تھے۔ اور پھر یہ فکر رہتی تھی کہ جلد سے جلد تجوری بھر دی جائے کہ پھر ہاتھ چلنے لگے۔

باہر جاتے تو سواری میں ان کے بازو ایک تھیلی رکھ دی جاتی جس میں دھیلیاں، پاولیاں، دوانیاں اور اکانیاں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ سواری کی تجوری ہوتی تھی جس میں کچھ اشرفیاں کچھ نوٹ اور کچھ روپیہ ہوتے تھے چلتی سواری میں تھیلی کا منہ کھلتا تھا کہیں ٹھہر جائیں تو تجوری کھلتی تھی راستے کی خیرات مانگنے والوں کو خیرات اور نہ مانگنے والوں کو خیرات غرض داد و دہش کے لئے ہر وقت کوئی نیا حیلہ ڈھونڈ لیا جاتا۔

پبلک فرائض سے فارغ ہونے کے بعد جب کبھی مکان پر ہوتے تو اوقات مقررہ میں صوفی، شاستری، شعرا، علما، اطبا کا مجمع رہتا، علمی مباحث شعر و سخن فنون لطیفہ تشخیص امراض تجویز ادویہ پر بہ رنگی باتیں ہوتیں۔ تناسخ، تصوف فقرا کے تذکرے اور مغلیہ تاریخ کے وہ واقعات جن میں ہندو مسلم باہمی محبت و سلوک سے متعلق ہوتے بڑی دلچسپی کے ساتھ زیر بحث رہتے۔

مہاراجہ کو سلاطین دکن کے کارناموں کو سنانے میں بڑا لطف آتا تھا۔ نواب سالار جنگ (اول مرحوم) اور وہ امراء پائیگاہ جن کے حالات کو مہاراجہ نے اپنی کمسنی میں دیکھا تھا خاص طور پر ذکر فرماتے تھے۔ مثلاً نواب خورشید جاہ مرحوم ناگ پنچمی کی تقریب میں کس طرح دلچسپی لیتے کیسی خیرات کرتے اور کس شان کی دعوت کرتے تھے ــــــ نواب آسمانجاہ مرحوم کس طرح بسنتی جوڑے اور بسنتی جواہرات پہنتے۔ جملہ ملازمین اور مصاحبین کے ساتھ جو بسنتی جوڑوں میں ہوتے بسنت پنچمی کی تقریب مناتے تھے ــــــ سالار جنگ اول ہولی کی تقریب میں کس شگفتگی سے شریک ہوتے اور خوشی خوشی ہر سال اپنے کپڑوں پر کس طرح گلال ڈلواتے تھے ــــــ چومحلہ میں نواب خورشید جاہ مرحوم کی موجودگی کو مسٹر بلوڈن کا محسوس نہ کرکے آگے بڑھ جانا اور اس کے بعد کے واقعات کہ مسٹر بلوڈن کو نواب خورشید جاہ مرحوم کا وہاں موجود رہنا کس طرح محسوس کرایا گیا ــــــ سالار جنگ اول مرحوم اور رزیڈنٹ کا چوکڑے میں فلک نما کیجانب سیر کے لئے نکلنا اور جہاں نما میں نواب رشید الدین خان مرحوم کی جانب سے منعقدہ وقت مجلس موسیقی میں طلب کیا جانا ــــــ سر رچرڈ میڈ کے زمانہ میں سالار جنگ اوّل اور امیر کبیر میں اختلاف کا رونما ہونا اور امیر کبیر کو یہ محسوس ہونے کے ساتھ ہی کہ باہمی اختلاف میں ریاست کو نقصان پہونچنے کا احتمال ہے ایسی محبت و مودت کا ظاہر ہونا کہ جس کی مثال تاریخ دکن میں زندہ رہیگی۔

یہ چند تذکرے جو اس وقت خیال میں آ گئے اشارتاً لکھدئے گئے۔ مہاراجہ مرحوم ایسے صدہا واقعات کو ایسی تفصیل سے بیان فرماتے تھے کہ گزرے ہوئے واقعات کی پوری پوری تصویر

سننے والوں کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔

مہاراجہ کا مذہب انسانیت اور پریم ان کا مسلک تھا۔ بادشاہ کے ساتھ وفاداری ان کے مسلک میں داخل تھی۔

داد و دہش سے ان کے عقائد کی توضیح ہوتی تھی کہ جس شخص کا مذہب انسانیت ہو وہ کس طرح حاجتمندوں کی مدد کرتا ہے۔

مہاراجہ کی خفی خیرات کی یہ حالت تھی کہ ان کے دین کا کسی کو علم نہ ہو سکتا تھا۔ کسی کو وہ کچھ دیتے تو اس کا خیال رکھتے کہ دوسرے کو علم نہ ہو۔ اکثر خود ہی اپنے ہاتھ سے دیا کرتے تھے اور دیتے وقت ان کی آنکھ نیچی ہوتی تھی کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر سائل شریف الخاندان ہو تو ہمارا آبدیدہ ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ وہ بمبئی سے حیدرآباد کے لئے روانہ ہونے کو تھے اور ان کی جیب خاص میں صرف گیارہ سو کلدار رہ گئے تھے۔ شرقی فریبہ سے ایک غریب الوطن شہزادہ نے مہاراجہ سے ملاقات کی اور اپنی مالی مشکلات کا ذکر کیا تھا۔ ان کے پاس جو کچھ تھا یعنی گیارہ سو کلدار لفافہ میں بند کر کے ان کے حوالے کر دیئے اور خود خالی ہاتھ ہو گئے۔

مہاراجہ اسی غیر معمولی سخاوت کی وجہ سے ہر وقت تنگدست رہتے تھے۔ کثر اوقات روزانہ کے مقررہ موازنہ سے بڑھ کر دیتے تھے اور خود بڑی تکلیف میں مبتلا ہو جاتے۔ ان کو بڑی تکلیف اس وقت ہوتی تھی جب کسی سائل کا سوال ان سے پورا نہ ہو سکے۔ مہاراجہ ایک سفر سے واپس ہو رہے تھے اور جو کچھ پیسہ پاس تھا خرچ ہو چکا تھا۔ حیدرآباد سے قریب کے ایک ریلوے اسٹیشن پر ایک شریف صورت سائل نے سوال کیا مہاراجہ کو معلوم تھا کہ ان کے پاس بہت کم رہ گیا ہے غرض تجوری خالی کر دی اور سائل کا دامن بھر دیا تجوری کی اس تلپٹ کی مقدار بھی پانچ سو روپیہ سے کم نہ تھی۔ مہاراجہ بہادر کے ایک دورہ میں ایک غریب عورت نے اپنی یتیم لڑکی کو ان کے قدموں پر ڈال کر کہا کہ اس بچی کا باپ ایک سپاہی تھا اس بچی کو مہاراجہ اپنی بچی سمجھ کر اس کی شادی کرا دیں

مہاراجہ نے بچی کے سر پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ گئے۔ ساتھیوں سے کہدیا کہ اس عورت کا پتہ اور نام لکھ لیں۔ حیدرآباد واپس ہوئے تو اپنی جیب سے تعلقدار ضلع کی معرفت اچھے پیمانہ پر اس بچی کی شادی کا انتظام کرایا کئی جوڑے کچھ زیور اور شادی کے لئے نقد رقم روانہ کی اور بچی کے نام تاحیات وظیفہ مقرر کردیا اور تعلقدار کو لکھا کہ مرسلہ سامان اور رقم سے "میری بچی کی شادی کرادیجئے" نہ معلوم مہاراجہ مرحوم کی امداد سے کتنی تصنیفیں ہوں گی کہ طبع ہوسکیں کسی اچھی کتاب کو طبع کرانے کی درخواست کبھی رد نہیں ہوئی اور جیب خاص سے ہمیشہ ہزار پانچ سو کی امداد بے تکلف دیجاتی رہی۔

مہاراجہ مغفور کے اسٹیٹ سے کثیر تعداد میں وظائف رعایتی دئے جاتے تھے اگر میں غلطی نہیں کرتا ہوں تو ایک وقت ان کی تعداد سالانہ ساٹھ ہزار کے قریب تھی مہاراجہ سے ہر سال یہ عرض کیا جاتا تھا کہ جدید ماہواروں کی اجرائی کے لئے اسٹیٹ کے موازنہ میں گنجایش نہیں ہوتی ہے جدید اجرائیوں کو گنجایش کے نکلنے تک روکدینا مناسب ہوگا مہاراجہ خاموش ہوجاتے تھے اور جدید اجرائیوں کا سلسلہ جیب خاص سے برابر قایم رکھتے۔ جیب خاص کی گنجایش محدود تھی وہ بھی ختم ہوجاتی تو بچار وناچار جیب خاص سے جاری کردہ ماہواریں اسٹیٹ میں منتقل ہوجاتیں۔

مفید تحریکات میں مہاراجہ کو بھی دلچسپی تھی ممالک محروسہ کے اندر اور باہر بیسیوں تعلیمی اور سماجی تحریکیں مہاراجہ کی مالی امداد کی مرہون منت تھیں، تحریک انسداد گداگری کے سلسلہ میں مہاراجہ چندولال کی تاریخی اور عالی شان عمارت کو میرے سوال پر فوری بلا پیہ کے حوالہ کرنے کا حکم صادر فرمایا اور انسداد گداگری میں دلچسپی کا عملی ثبوت دیا۔

مہاراجہ کو بچوں سے خاص محبت تھی کوئی چھوٹا بچہ ان کے قریب سے نہ گذرا ہوگا کہ اس پر مہاراجہ نے شفقت نہ کی ہو۔

غریبوں کے میلے کچیلے بچوں کو گود میں لینا اور ان کو پیار کرنا مہاراجہ کی معمولی عادتوں میں داخل تھا اس سلسلہ میں ایک دلچسپ قصہ قابل ذکر ہے مہاراجہ مرحوم بنگلور سے حیدرآباد آرہے تھے راستہ میں ایک غریب عورت کا بچہ چلتی ریل سے باہر گر پڑا ریل کی رفتار تیز نہ تھی پھر بھی بچہ بُری طرح زخمی ہوا

ریل رکی۔ رکنے کی وجہ معلوم ہوئی تو مہاراجہ باوصف کبرسنی ریل سے فوراً اتر پڑے بچہ کے پاس پہونچے۔ بیقرار ماں کو تسلی دی بچے کو خود اٹھالیا اور اپنے سیلون میں لے آئے بچے کے خون سے مہاراجہ کے کپڑے رنگین ہوگئے تھے۔ اسٹاف کے ڈاکٹر کو طلب کیا بچے کی مرہم پٹی کرائی اور دوسرے اسٹیشن پر بچہ کی ماں کو انعام اکرام دے کر بچہ کے ساتھ رخصت کیا۔

مہاراجہ مرحوم کی عادت تھی کہ ہر سال الوال کی جاترا کے موقع پر برآمدہ میں بیٹھتے اور جاترائیوں کا تماشہ بھی دیکھتے اور کام کے سلسلہ کو جاری رکھتے اتفاقاً ایک بچے کے رونے کی آواز آئی شاگرد پیشہ سے کہا کہ اس کے رونے کی وجہ معلوم کی جائے شاگرد پیشہ نے اطلاع دی کہ بچہ ضد کر رہا تھا تو اس کی ماں نے بچہ کو مارا اس لئے بچہ رو رہا تھا مہاراجہ کو بچہ کے رونے پر ملال ہوا اور ماں پر اظہار ملامت فرمایا۔

میں نے کہا کہ ماں مجبور تھی کہ بچے کو مارتی اس کے مارنے کی وجہ یہ ہوگی کہ اس کی گرہ میں پیسہ نہ ہوگا دل بہلانے کو بچہ کے ساتھ جاترا میں آگئی بچہ مٹھائی اور کھلونے کی دکانوں کو دیکھ کر مچلا ہوگا وہ عورت یہ تو نہیں سمجھا سکتی تھی کہ بچہ کی خوشی کو پورا کرنے سے وہ عاجز ہے ماں کے لئے آسان یہی تھا کہ بچے کو مارتی اس کو رلاتی اور اس کی توجہ کو پلٹ دیتی میلوں میں غریبوں کے افلاس اور مجبوری کے اکثر ایسے مشاہدے ہوسکتے ہیں اس جواب سے مہاراجہ کے چہرہ کا رنگ بدل گیا آنکھ میں آنسو بھر گئے جلدی میں برخاست کیا اور بچوں میں تقسیم کرنے کے لئے معتدبہ رقم روانہ کی اور اس بچہ کو خاص طور پر خوش فرمایا اور مجھ سے فرمایا کہ آپ نے ملک کے افلاس کی ایسی موثر تصویر پیش کی کہ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔

مہاراجہ بجائی مروت کے پتلے تھے اگر ان کو یہ خیال ہوجاتا تھا کہ ان کی طرف سے کسی کی دل شکنی ہوئی ہے تو باوجودیکہ اس شخص کی غلطی مسلم ہو مہاراجہ کی صورت سے شرمندگی ظاہر ہوتی تھی۔

ایک صاحب نے مہاراجہ مرحوم سے ایک ایسی خواہش کی کہ جس کو مرحوم پورا نہ کرسکتے تھے یہ صاحب بڑے چالاک تھے مہاراجہ مرحوم کو تحریر کیا کہ مہاراجہ کے دل میں شاید ان سے کوئی دشمنی ہے کہ

ان کی حاجت باری نہیں کی مہاراجہ مرحوم اس تحریر سے بہت متاثر ہوئے بجائے اس کے کہ ان صاحب کی چشم نمائی کی جاتی ان کی خواہش کو پورا کردیا باوجودیکہ مہاراجہ مرحوم مروت کے مجسمہ تھے لیکن سرکاری معاملات اور ملک کے مسائل میں ان کی رائے نہایت سخت ہوتی تھی کوئی اثر کوئی حیلہ اور کوئی خوف ان کو متاثر نہیں کرسکتا تھا۔

مہاراجہ آنجہانی کے تفریحی مشاغل میں عطروں کا تیار کرنا' ادویہ کا بنانا' جلد سازی' نقاشی' عکاسی' خطاطی' ناخن سے تحریر اور نقش و نگار' موم اور پلاسٹر سے مجسموں کا بنانا داخل تھے۔ ساٹھ برس کی عمر تک ٹینس' کشتی رانی' سواری اور بڑے شکار میں دلچسپی لیتے تھے آخری زمانہ میں بلیرڈ کھیلا کرتے تھے۔

مہاراجہ آنجہانی کو نیچرل زندگی بہت پسند تھی' آبشار کی آواز سے بہت خوش ہوتے تھے بارش کے موسم میں بارش کی آواز کے مزے لیتے تھے۔ جھاڑ کے زیر سایہ کام کرنے میں ان کو لطف آتا تھا۔ منڈوے کے نیچے دوپہر بسر کرنے میں بڑا سکون ہوتا تھا۔ کبھی بڑے درختوں کی شاخوں میں نشیمن کے طرز پر بنوائے ہوئے کمروں میں بسیرا فرماتے اور جسمانی پرواز کا حظ حاصل کرتے۔

صدارت عظمی کے زمانہ میں علاوہ اجلاس باب حکومت کے دفتری کام اکثر و بیشتر ایک پھوس کے چھپر تلے کرتے تھے۔

مہاراجہ اپنے قیامگاہوں پر بلا لحاظ موسم برآمدوں میں وقت بسر کرتے ان کے محلات کے آراستہ کمرے شاذ ہی استعمال ہوتے تھے۔

مہاراجہ آنجہانی کی ذات میں امارت کا دبدبہ اور اپنے پرائے کے حفظ مراتب کا بہت خیال تھا اس کے ساتھ ساتھ مدرجہ انکسار کسرنفسی اور شرافت نفس بھی موجود تھی۔ جھوٹی شان ان کو نہیں بھاتی تھی' انسانیت کا برتاؤ ان کی خمیر میں تھا۔ ایک موقعہ پر یہ دیکھا گیا کہ سرکارعالی کے ایک معمولی درجہ کے عہدہ دار کو مہاراجہ نے ایسی تعظیم دی کہ دیکھنے والوں کو غیر معمولی معلوم ہوا مہاراجہ سے عرض کیا گیا کہ سوائے امراءعظام کے آپ صدرالمہاموں کے لئے بھی اپنی کرسی سے آگے نہیں بڑھتے تو

ان عہدہ دار صاحب کی تکریم امرار عظام کے برابر کرنے کی کیا کوئی خاص وجہ ہے تو مہاراجہ نے نہایت شرافت اور سادگی سے فرمایا کہ ایک زمانہ ہوا کہ ان عہدہ دار صاحب کے دادا نے مہاراجہ کے دادا پر کوئی احسان کیا تھا جس کا مہاراجہ کے والد ذکر فرماتے تھے اس احسان کا سلسلہ تھا کہ مہاراجہ مذکورہ عہدہ دار صاحب کے خاندان والوں کی عزت کرتے تھے۔

مہاراجہ کو موسیقی سے خاص دلچسپی تھی اچھے گانوں اور خصوصاً ستار سے بہت اثر لیتے تھے۔ اچھے گانے والے ہمیشہ مرحوم کی سرپرستی سے مستفید ہوتے رہے قوالی کی صحبت بھی پسند تھی ہر مہینہ کی چھٹی تاریخ کو محفل سماع ایوان شاد میں مقرر ہوتی تھی۔

غرض مہاراجہ آنجہانی کی ہر ادا خاص ہر صفت ممتاز ان کے گھر کی معاشرت یگانہ روزگار ان کی سیرت اہل ملک کے لئے لائق تقلید مثال تھی۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو مہاراجہ کی زندگی کے نمونہ سے سبق حاصل کریں۔

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ مضمون مجلہ کی ضرورت کے لحاظ سے طولانی ہوگیا ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بالکل ناقص اور ادھورا ہے میں اس مضمون کو موزوں نہ بنا سکا۔ اور مہاراجہ مرحوم کی مدح سرائی کا حق ادا نہ کرسکا۔

اس مضمون کے ختم پر مہاراجہ آنجہانی کی وصیت نامہ کے ابتدائی انگلش فقرے مہاراجہ مرحوم کے صاحبزادے راجہ خواجہ پرشاد بہادر۔ نواب اسد اللہ خان بہادر، نواب نصر اللہ خان بہادر، نواب عظمت اللہ خان بہادر، نواب حشمت اللہ خان بہادر کی اجازت سے درج کرتا ہوں کہ قارئین کو مہاراجہ بلند پایہ ہستی کے اصلی خیالات کا اندازہ ہوجائے۔

نقل وصیت نامہ

نمبر ۱ ۔ میں سرکشن پرشاد یمین السلطنت کھتری مہرا یعنی سپاہی نژاد صاحب سیف اپنی وصیت کو خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو ایک ہے اور ایک ہی ہے جس کا کوئی شریک نہیں ۔ میرا اعتقاد ہے کہ کوئی خدا سوائے ایک خدا کے سزاوار حمد نہیں ہے ۔

نمبر ۲ ۔ میں تعصب اور نفرت کو بری نظر سے دیکھتا ہوں ہر مذہب اور قوم کی عزت کرتا ہوں ۔ انصاف راستی اور عدل کو انسان کے بہترین جوہر سمجھتا ہوں کیونکہ انصاف ہر متنفس اور حکومت کے لئے بہترین خصلت ہے میں اپنے اہل خاندان اور اولاد اور وارث کو ہدایت کرتا ہوں کہ خدا پر کامل بھروسہ رکھو ۔ ہر تکلیف کا جوانمردی سے مقابلہ کرنا اور ہر مصیبت کو صبر سے برداشت کرنا صرف خدا ہی سے مدد طلب کرنا اور ہمیشہ اس کی مشیت پر راضی برضا رہنا یہی وہ تعلیم ہے جو ہمارے بزرگوں سے ملتی چلی آئی ہے اور جس کی پیروی کرنا ایک کھتری اور ایک جوانمرد سپاہی کے لئے ضروری ہے ۔ میں بھی تم سب کو نیکو کارانہ زندگی گذارنے اور بوقت مایوسی خدا سے امداد طلب کرنے کی ہدایت کرتا ہوں ۔ خصوصاً مجھے اپنے فرزند اور جانشین اور وارث راجہ بہادر خواجہ پرشاد سے توقع ہے کہ وہ ان سب امور کو جو میں نے اپنے مذہبی اعتقاد کے متعلق اوپر بیان کئے ہیں اپنا نصب العین بنائیں گے ۔

نمبر ۳ ۔ خواجہ بابا جہاں تک ممکن ہو اپنے آبائی رسم و رواج کے جو اس خاندان میں رائج ہیں پابند رہو ۔ اس خیال سے کہ ایسے مراسم اسلامی اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ ان مراسم سے در پردہ نہ صرف مستحقین اور حاجتمندوں کی حاجت روائی مقصود ہے بلکہ یہ ہمارے خاندان کے وہ خصائل ہیں جو ہمیں وراثتاً پہونچے ہیں اس لئے ہر ایک عطار جوان کے متعلق ہو ہمیشہ جاری رکھی جائے ۔ سخاوت کے معنی ہی یہ ہیں کہ بغیر کسی معاوضہ کی امید کے کی جائے ۔

نمبر ۴ ۔ ہر مذہب و ملت کی عبادت گاہیں واجب الاحترام ہیں ۔

ف۵ ۔ زمانہ کا رخ بدل گیا ہے اس لئے میں تمھیں پابند کرتا ہوں کہ کبھی ایک سے زیادہ شادی نکرنا سوائے اس صورت کے کہ بیوی عقیمہ ہو یا لا علاج عضوی ۔ ناقابلیت کی وجہ سے خدمت گذاری کے قابل نہ رہی ہو

ف۶ ۔ یاد رکھنا کہ بیوی امن کی ایک مورتی اور آرام کا سرچشمہ ہے اس لئے عزت و محبت اس کا حق ہے ۔ اس سلسلہ میں کوئی ایسی جنبش نہ ہونی چاہئے جس کا نتیجہ احباب اور اہل خاندان میں رنج و نااتفاقی کا باعث ہو ۔

ف۷ ۔ اپنے ملک و مالک کے ہمیشہ وفادار رہو ۔ ہمارا خاندان شاہان آصفجاہی کے وابستگان قدیم میں شمار ہوتا ہے اور اس پر ہمیں فخر رہا ہے ۔ ہمارے آبا و اجداد اپنی وابستگی اور وارفتگی کا صلہ ہمیشہ دربار شاہی سے پاتے رہے ہیں ۔ چنانچہ میرے مرحوم آقا میر محبوب علیخان نے میری ذات کو ایک ذرہ سے آفتاب بنا دیا ۔ جو کچھ مرحوم نے میرے ساتھ کیا میرے موجودہ آقا میر عثمان علیخان سلطان دکن ادام اللہ اقبالہ نے نہ صرف ان اعزاز کو جو ان کے نامور والد نے عطا کیا تھا بجائے خود قایم رکھا بلکہ ان اعزاز میں ایسی نمایاں ترقی عطا فرمائی کہ میرا ہر تن مو عطائے خسروانہ کا سپاس گذار ہے اور عمر دولت کی دعا دل سے نکلتی ہے

ف۸ ۔ اپنا فرض منصبی سمجھکر گورنمنٹ برطانیہ کے بھی وفادار رہو ۔ صاحب عالیشان سے مخلصانہ تعلقات محبت موانست قایم رکھو کیونکہ برطانیہ کے ارباب حل وعقد سے اچھے تعلقات ہماری سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہیں ۔

ف۹ ۔ اپنے دشمنوں سے اچھا سلوک کرو اور اپنے دوستوں پر مہربان رہو کسی کی ایذا دہی کا خیال نہ کرو خواہ تم کو کتنی ہی تکلیف پہونچے دشمن سے مروت کرنا جوانمردی ہے اور بدلہ لینا بزدلی ہے ۔

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است ۔ با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

ف۱۰ ۔ ہمیشہ دوسروں کی عزت کرو ۔ تم خوش نصیبی سے سورج بنسی خاندان میں پیدا ہوئے ہو جس کے خاندان کا سلسلہ مہاراجہ دھیراج رام چندر جی سپاہی نژاد تک پہونچتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ

سورج بنسی خاندان سپاہی نژاد رہا ہے اور سخاوت و مروت کے لحاظ سے صداقت میں بھی عدیم المثال رہا ہے۔ اس خاندان کی روایات قدیم کا اقتضاء یہ ہے کہ تم کو دوسروں کی عزت کرنی چاہئے کسی جماعت کو نقصان پہونچانا خود اپنے کو اس جماعت کے سامنے حقیر کرلینا ہے۔

۱۱۔ سخاوت کرتے رہو کیونکہ یہ خصلت ہمیشہ مہاراجہ چندولال کے خاندان کا امتیاز ہے مہاراجہ چندولال نے اپنے بعد ایک ایسا نام چھوڑا ہے جو سخاوت اور نیک کاموں کے لئے یادگار رہے گا

۱۲۔ والدین کا مرتبہ بہت مقدس اور بلند ہے ان کو کبھی ناخوشی کا موقع نہ دینا خواہ وہ کسی حالت میں ہوں ان کی خوشی کے خواہاں اور ان کی دعائیں لیتے رہو۔

۱۳۔ بحالت موجودہ حیدرآباد کے تمام امراء تم سے عمر میں بڑے ہیں اس لئے تم کو چاہئے کہ ان سب کی عزت اور ان کا ادب کرو تاکہ دوسرے بھی تمہاری خاندانی عزت کا خیال رکھیں۔

۱۴۔ اپنی علمی لیاقت بڑھانے کی کوشش کرو کیونکہ یہی ذریعہ تمہاری زندگی کی خوشحالی اور ترقی کا ہوگا۔

۱۵۔ اپنے دوستوں کے انتخاب میں ہمیشہ احتیاط اور خبرداری سے کام لو۔ اچھی نصیحت کی قدر کرو۔ بری اور نالایق صحبت سے دور رہو کیونکہ ہر شخص اپنی اچھی یا بری صحبت سے پہچانا جاتا ہے کبھی غرور کا انداز نہ دکھاؤ ہمیشہ خلق کے ساتھ رہو اور ہر شخص سے خلوص کے ساتھ ملو۔ جب ایک مرتبہ تم کسی کو معتبر سمجھ لو تو پھر اس کی عزت کرتے رہو اور اس کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھو دوست ہمیشہ سچ کہے گا۔ کبھی خوشامد سے خوش نہ ہونا کبھی کسی کو اپنا دشمن نہ سمجھنا اور نہ اپنے دل میں کسی کی دشمنی کی پرورش کرنا۔ لیکن ہمیشہ اپنے سے غافل نہ رہنا کیونکہ اس دنیا میں گندم نما جو فروش بہت ہیں اور حقیقی دوست خیر خواہ بہت کم۔

۱۶۔ اپنے علاتی ماؤں کا ادب کرو کہ یہ تمہارا فرض ہے۔ تمہارے علاتی بھائی اور بہنیں بھی تمہاری خاص توجہ اور محبت کے سزاوار ہیں کوشش کرو سب باہم مل کر امن کے ساتھ رہیں خدا کرے کہ وہ بھی آپس میں ملکر رہنے کی قدر کریں۔

دفعہ ۱۷ ـ اپنے خداوندِ مجازی کے ساتھ کامل وفادار رہو کبھی ان کی مخالفت نہ کرو ہمیشہ ان کے فرمانبردار رہو اور ان کی مہربانی پر اترا کر اپنی حد سے آگے نہ بڑھو ۔

دفعہ ۱۸ ـ ہمیشہ اپنے چھوٹوں اور ملازمین کے خطاؤں سے درگذر کرو کیونکہ درگذر کی عادت صفات بزرگانہ میں پائی جاتی ہے ۔ ملازمین کو برخاست کرنے سے احتراز کرو ۔ جہاں تک ممکن ہو رحم اور عفو سے کام لو ۔ بدظنی کا خیال نہ کرو تاوقتیکہ تم کو ملازم کی بے وفائی کا کامل یقین نہ ہو ۔

دفعہ ۱۹ ـ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے اپنے بچوں کی طرح برتاؤ کرو ۔

دفعہ ۲۰ ـ کوشش کرکے سچے علماء اور سچے فقراء کی صحبت حاصل کرو کیونکہ ان کی صحبت ہمیشہ تمھارے لئے سودمند ہوگی ۔ سچے فقراء برکتوں کے سرچشمے ہیں (بناوٹی فقیر کی بھی باعتبار اس کے ظاہری صورت کے عزت کرو اور اس سے بھی حسن سلوک روا رکھو) ۔

دفعہ ۲۱ ـ اب میں ان امور کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو اسٹیٹ کے آئندہ انتظام سے متعلق ہیں اور نہایت اہم ہے تم پر تعمیل کے لئے زور دیتا ہوں ۔

مہدی نواز جنگ

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود　　(صائب)

سر مہاراجہ یمین السلطنتہ آنجہانی کی شاعری

فارسی کی ایک کہاوت ہے کہ "دیوار ہم گوش دارد" اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری اور سر مہاراجہ کشن پرشاد کا مکان ایسی دو عمارتیں ہیں جس کے در و دیوار کے کانوں نے جس قدر بلبلان ایران کے نغمے اور طوطیان ہند کے چہچہے سنے ہیں، حیدرآباد میں شاید ہی کسی دوسری عمارت کو سننے نصیب ہوئے ہوں مہاراجہ چندو لال نے شعر و سخن کی قدر دانی اور شعرا کی سرپرستی میں جو نام پیدا کیا تھا وہ محتاج اظہار نہیں۔ صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ ایک زمانہ میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران کے بڑے بڑے شہر بھی ان کی نام آوری کے آوازہ سے گونج رہے تھے۔ جن لوگوں کو انھوں نے اپنے گرد جمع کر لیا تھا وہ سب مستعد اور مستند شاعر تھے مثلاً ملا محمد فایض کاشانی، حاجی ملا محمد علی سامر، حسین علیخاں زیبا، حافظ تاج الدین مشتاق، ذوالفقار علیخاں صفا، خواجہ ہمت علیخاں ہمت، میرزا عابد بیگ ظہور، غلام ضامن اکرم، میر مفتوں، شیخ حفیظ وغیرہ وغیرہ، ان سب میں فارسی کہنے والوں میں میرزا محمد طاہر نیری اور ریختہ کہنے والوں میں شاہ نصیر دہلوی ممیز اور سر برآوردہ سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات ایسے تھے جن کو مہاراجہ چندو لال اپنی جیب خاص سے

ایک ایک ہزار روپیے ماہوار دیتے تھے جو اس زمانہ کے لحاظ سے غیر معمولی مقدار تھی چنانچہ شیخ حفیظ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ مہاراجہ چندو لال کی داد و دہش سے اُن کے تمول کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ ہر روز ایک نیا جوڑا لباس کا بدلتے تھے اور ایک بار کے سوا نے پھر اُسے استعمال نہ کرتے تھے۔ میرزا طاہر نیری شیراز کے رہنے والے تھے۔ ایک مدت کے بعد وطن گئے صاحب "مجمع الفصحا" لکھتے ہیں کہ فرمانروائے فارس نے بہت چاہا کہ وہ ہند جانے کا قصد نہ کریں مگر انھوں نے مہاراجہ چندو لال کی ملازمت اور صحبت کو ترک کرنا کسی طرح منظور نہ کیا۔ انہیں کے پر شوکت قصاید کا طفیل ہے کہ شعرائے ایران کے ممدوحوں میں مہاراجہ چندو لال کا نام روشن حرفوں میں چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

سر مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی شعر و سخن کا ذوق و شوق فطرۃً سے لیکر آئے تھے۔ مہاراجہ چندو لال کی سخن نوازی اور شعرا پروری کی حکایتوں نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ خدمت پیشکاری سے سرفرازی کے بعد ہی اُن کے یہاں شعر و شاعری کی صحبتیں شروع ہو گئیں۔ اگر صرف ایسے شعرا کے ناموں کی جو کبھی کبھی آتے اور اپنا کلام سناتے تھے ایک فہرست مرتب کی جائے تو ایک جز کی کتاب ہو جائے ان لوگوں میں سے صرف چند قابل ذکر لوگوں کا نام لیا جاتا ہے۔ مولانا ضیاء الملک سوختہ ہی۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی۔ سیتل پرشاد خورم، مولوی فضل رب عرشی مولوی عبدالعلی والہ، مولوی محمد امیر اللہ آمیر، مولوی عبدالجبار خاں آصفی۔ طلمی، مولوی محمد جعفر زبری، ترک علیشاہ ترکی، مولوی غلام قادر گرامی وغیرہ۔ گزشتہ پچاس سال کی مدت میں حیدرآباد باہر کا کوئی ایسا شاعر نہ ہوگا جو حیدرآباد آیا ہو اور اس نے مہاراجہ بہادر کی دعوت پر یا بطور خود آکر اپنا کلام نہ سنایا ہو۔ شاد منزل کے در و دیوار جنھیں آپ چند روز سے افسردہ خاموش اور سوگوار دیکھ رہے ہیں، بڑے بڑے ادبی معرکے دیکھ چکے اور شعرا کے بڑے بڑے دلکش ترانے سن چکے ہیں۔

یوں تو ہر وقت جب سر مہاراجہ بہادر اپنے سرکاری اور خانگی کاموں سے فارغ ہو کر

باہر آکر بیٹھتے تھے تو اُن کی وہ صحبت ایک اچھا خاصہ مشاعرہ ہو جاتی تھی۔ مہاراجہ موصوف کی عادت تھی کہ جب کسی ... شخص کو دیکھتے تھے جس کا کلام اُن کو پسند تھا اس سے لازمی طور سے تازہ فکر کی فرمائش کرتے تھے ... اس کے پڑھنے کے بعد دوسرے لوگ اپنا کلام سنانے کی خود اجازت ... تے تھے یا ان کو کوئی دوست تحریک کر دیتا تھا، سر مہاراجہ جو ہمہ تن مروت اور تہذیب تھے کسی کی دل شکنی یا ... نہیں کہتے تھے، فوراً اجازت دیتے تھے اور یہ سلسلہ اسی طرح دیر تک چلا رہتا تھا۔ اس طور سے اُن کی ہر صحبت میں ایک مشاعرہ کا مزہ آجاتا تھا۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے باضابطہ مشاعرہ کا پہلا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جبکہ وہ صرف پیشکار تھے ... شریک ہونے والوں میں قابلِ ذکر لوگ نواب ضیاء یار جنگ بہادر ضیاء، ترک ... ترکی، ... صاحب اخگر، ... فہیم، مؤید الشعراء ایرانی، استاد ظہیر، مولوی غلام ... زمان ... لشیر اور اخیر زمانہ میں نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل اور نواب ... وغیرہ تھے۔ یہ ایک مختصر اور مخصوص جماعت تھی جو لوگ اس میں شریک تھے وہ سب بیان نواب ضیاء یار جنگ بہادر مہینے میں ایک یا دو مرتبہ عموماً سرکاری تعطیلوں کے دنوں میں جمع ہوتے تھے، تمام دن یہ صحبت رہتی تھی۔ صبح کا ناشتہ دوپہر کا کھانا نہایت تکلف اور اہتمام کے ساتھ مہاراجہ کے ساتھ ہوتا تھا۔ آنے والوں کا دو طرفہ کرایہ سر مہاراجہ کی طرف سے ادا کیا جاتا تھا۔ سہ پہر کی چاء پیکر لوگ رخصت ہوتے تھے آئندہ مشاعرہ کے لئے مصرعہ طرح کوئی ... شخص ... دیتا تھا فارسی اور اردو کا کوئی دیوان اٹھا کر کھولا جاتا تھا اور جو غزل نکل آئے وہ طرح قرار پاتی تھی۔ جب سب لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ چکتے تھے تو اصل طرح کی غزل پڑھی جاتی تھی اور دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں جس سے حاضرین کی علمی معلومات اور فنی بصیرت میں بہت کچھ ... مطبع پیشکاری سے جو رسالہ نکلتا تھا اس میں مشاعرہ کے غزلیں بھی طبع ہوتی تھیں۔

سر مہاراجہ کے مدار المہام ہو جانے کے بعد سرکاری فرائض کی مشغولیت وغیرہ کی ... یہ مشاعرے موقوف ہو گئے۔ مگر اس مشغولیت کے زمانہ میں بھی سر مہاراجہ اپنے فطری ذ...

وشوق کو قطعی طور سے چھوڑ نہ سکے۔ اتوار کا دن شعرا سے ملاقات کا قرار دیا گیا تھا۔ اس دن بھی اکثر سخن فہم اور سخن سنج لوگ جمع ہو جاتے تھے اور سر مہاراجہ سے داد سخن پاتے تھے۔

دار المہامی سے سبکدوشی کے بعد کا زمانہ سر مہاراجہ کے لئے سخت مصیبت اور تکلیف کا زمانہ تھا۔ ہر شخص ان کے پاس جانے سے ڈرتا تھا۔ اس زمانہ میں شعرا اور مداحین کا کیا پوچھنا بقول سر مہاراجہ کے اُن کے قریب کے رشتہ داروں اور دامادوں نے بھی ان سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ ان کے پاس آنے جانے والوں میں اُن کے ذاتی ملازم اور معدودے چند ایسے لوگ رہ گئے تھے جو وضع کی پابندی اور اخلاق مندی کے لحاظ سے ایسے وقت میں ان سے ملنا ترک کرنا ایک اخلاقی کمزوری اور ایک تمدنی جرم سمجھتے تھے۔ سر مہاراجہ شام کے وقت باہر نکل کر بیٹھتے تھے اور بمشکل چار پانچ آدمی جمع ہو جاتے تھے اور کچھ شعر و شاعری کا چرچا ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں سر مہاراجہ کا شوق شاعری ایک حد تک مولوی نظم حسین صاحب نجا سے پورا ہوتا تھا جو سر مہاراجہ کے بچوں کے اُستاد تھے۔ باقی وقت سر مہاراجہ خوش الحانی، تصویر کشی اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل میں صرف کرتے تھے۔ اُن کے لکھے ہوئے قطعات اور ان کی کھنچی ہوئی تصویریں موجود ہیں۔ اسی زمانہ کا یہ اثر ہے کہ زمانہ کسی حالت کو خواہ اچھی ہو یا بری بغیر تغیر و تبدل کے نہیں چھوڑتا۔ دو سال میں رفتہ رفتہ کر کے لوگوں کے دلوں سے خوف کم ہوتا گیا اور کچھ کچھ آمد و رفت پھر شروع ہوئی اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ لوگ زیادہ تر جمعہ کے دن آتے تھے اور سر مہاراجہ اپنی عادت کے مطابق تازہ افکار کی فرمایش کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز کے بعد جمعہ کے دن شام کے وقت شعرا کا اچھا خاصہ مجمع ہونے لگا، جب لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور جس مقام پر نشست ہوتی تھی وہاں گنجائش نہیں رہی اُس وقت نواب ضیا یار جنگ بہادر کی تجویز اور دوسرے احباب کی تائید سے یہ قرار پایا کہ یہ صحبت بجائے ہفتہ وار کے بہ تقرر وقت و طرح ماہوار کر دی جائے۔ سنہ ۱۳۳۰ف سے کے مشاعروں کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا۔ ان مشاعروں میں شریک ہونے والوں میں خاص خاص لوگ یہ تھے۔ نواب ضیا یار جنگ بہادر، نواب حیدر یار جنگ مرحوم طباطبائی،

نواب نراب یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، نواب اختر یار جنگ مرحوم، نواب اکرم الدین خاں صاحب اکرم، نواب وحید الدین خاں صاحب وحید، جوش ملیح آبادی، شوکت علی خاں صاحب فانی، ضامن کنتوری، ماہر القادری، آزاد انصاری، حیرت بدایونی، میرزا فرحت اللہ بیگ صاحب ....، کاظم علی صاحب باغ، غلام پنجتن صاحب، غلام مصطفٰے صاحب رسا، اجلال صاحب، عابد علی صاحب بیگم، منتہٰی شیرازی، طلعت یزدی، لبیب صاحب دہلوی، مسعود علی صاحب محوی، پروفیسر محمد علی صاحب داعی الاسلام، راجہ نرسنگراج عالی، اور حافظ محمد عبد المجید صاحب مجید جن کے نام سے اطلاعی رقعے تقسیم ہوتے تھے۔ مشاعرہ کے لئے عام طور سے شام کا وقت مقرر کیا جاتا تھا۔ اس اطلاع پر کہ لوگ جمع ہو گئے ہیں سرمہاراجہ تشریف لاتے تھے اور سلام اور مزاج پرسی اور تھوڑی دیر بات چیت ہونے کے بعد مشاعرہ شروع ہو جاتا تھا۔ پہلا دور فارسی کہنے والے شعراء کا ہوتا تھا جسے داعی الاسلام شروع اور نواب ضیا یار جنگ بہادر ختم کرتے تھے۔ اس کے بعد اردو کہنے والوں کی باری آتی تھی ان میں جہاں تک خیال ہے کوئی خاص ترتیب نہ تھی جسے سرمہاراجہ یا مہتمم مشاعرہ اشارہ کرتا تھا وہ پڑھتا تھا۔ جب تقریباً آدھے لوگ پڑھ چکتے تھے اس وقت چاء کا دور چلتا تھا جس کے ساتھ کیک، بسکٹ سبھی کچھ ہوتا تھا۔ لوگ تازہ دم ہو کر پھر پڑھنا شروع کرتے تھے جلسہ عام طور سے دس گیارہ بجے شب تک برخاست ہو جاتا تھا۔ تقریباً دو سال تک گرتے پڑتے ان مشاعروں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس طرح نواب ضیا یار جنگ بہادر اس سلسلہ کے مشاعروں کے دانستہ محرک اور بانی ہوئے تھے اسیطرح نادانستہ اس کی بربادی اور موقوفی کے بھی وہی سبب ہوئے قصہ طویل۔ مگر مختصر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایک آوارہ شخص جو ایک جعلی سند کی بنا پر ایک مدت تک مولانا بنا رہا دفعتہً شاعر ہو گیا اور نواب ضیا یار جنگ بہادر کی خدمت میں حاضر ہو کر تلمذ کی استدعا کی نواب صاحب کو ان ذات شریف کے حالات کیا معلوم تھے انھوں نے اسے بخوشی منظور کر لیا اور ... ساتھ ان مشاعروں میں لانے لگے۔ آپ کے آتے ہی مشاعرہ میں فرقہ بندی اور دراندازی اور ... قسم کی دوسری شرارتیں شروع ہو گئیں جن کی وجہ سے بعض شعرا نے مشاعرہ میں آنا چھوڑ دیا

بعض لوگوں نے جو اس شخص کی بدچلنیوں سے واقف تھے نواب صاحب کو متنبہ بھی کیا مگر نواب صاحب نے کچھ اس کی طرف توجہ نہ فرمائی، ہاں چند روز کے بعد ان کو خود اس کی تمام کارستانیوں کا تجربہ ہوگیا۔ نواب صاحب کے مسودہ غزلیات کے بیسیوں صفحے غائب کردیے گئے، اور ان کی غزلیں، قصاید اور قطعات اپنے نام سے پڑھے گئے، اسی پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ ایسے شفیق اُستاد و سرپرست کی ہجو لکھی گئی یہی شخص تھا جس کی ایک ناشایستہ حرکت ہی سے، جس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا سرمہاراجہ کے مشاعرے بالکل بند ہوگئے۔ اور ایسے بند ہوئے کہ سرمہاراجہ اپنی دلی خواہش کے اس کے جاری کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔

علاوہ ان مشاعروں کے جن کا ذکر اوپر ہوا سرمہاراجہ اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی مدظلہ العالی کی سالگرہ مبارک یا ہندوستان یا غیر ملک کے کسی مشہور معروف شاعر یا سخن سنج کے وارد حیدرآباد ہونے کے مواقع پر بڑے اہتمام سے اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرے کیا کرتے تھے۔ مسٹر دتاتری کیفی دہلوی کی تشریف آوری پر جو بڑی دھوم دھام کا مشاعرہ ہوا وہ مع اردو اور فارسی غزلوں کے طبع ہو چکا ہے۔ سر اقبال مرحوم کی تشریف آوری کے موقع پر جو مشاعرہ ہوا وہ بھی عجیب مشاعرہ تھا۔ سرمہاراجہ نے اعلیٰ پیمانہ پر دعوت اور مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ حیدرآباد کے تمام مشہور فارسی اور اردو کہنے والے شعرا مدعو تھے، چونکہ کوئی خاص طرح مقرر نہ تھی اس لیے حیدر یار جنگ طباطبائی مرحوم، نواب ضیا یار جنگ بہادر، نواب عزیز یار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی، باغ، لبیب، سے مستعد اور مستند شعرا نے اپنے خیال میں اپنا بہترین کلام سنایا مگر سر اقبال ٹس سے مس تک نہ ہوئے، صرف محوی صاحب کے اس شعر پر

نگاہ کردن دزدیدہ ام بہ بزم بدید
میان چیدن گل باغبان گرفت مرا

اتنا ارشاد ہوا کہ پھر پڑھیئے۔ خدا جانے کسی نقص کی بنا پر تھا یا بطور قدردانی کے۔ جب خود ان سے کچھ پڑھنے کی فرمایش کی گئی تو بڑے اصرار کے بعد چار پانچ شعر ارشاد فرمائے

بعضوں نے انہی کی پیش کردہ مثال پر عمل کیا۔ اس کے بعد سر مہاراجہ کی ایک غزل پڑھی گئی اور ہر طرف سے خوب داد ملی۔ یہ مجمع اور جلسے کے خاص خاص آداب ہیں اور جب وہ ترک کر دئے جاتے ہیں تو وہ مجمع اور جلسہ بے لطف ہو جاتا ہے۔

سر مہاراجہ کہنہ مشق، وسیع النظر اور پرگو شاعر تھے، جس قدر جلد اور روانی کے ساتھ وہ نظم لکھ سکتے تھے بہت کم لوگ کہہ سکتے ہیں۔ بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ بعض احباب نے ان کو نظم میں خط لکھا اور جو آدمی خط لیکر گیا تھا وہ نظم ہی میں جواب لیکر آیا۔ ان کا سب سے بڑا جوہر سخن فہمی اور سخن شناسی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ خود اپنے کلام کے حسن و قبح سے پوری طرح واقف تھے، اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی واقع ہوتی ہے اور بیشتر شعرا تمام عمر اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ سر مہاراجہ اپنی خانگی صحبتوں میں بعض اوقات نواب فصیا یار جنگ یا محوی صاحب کی غزلیں کسی خوش آواز شخص یا کسی قوال سے پڑھوا کر سنا کرتے تھے، اس کے بعد اگر کوئی شخص خود ان کے اشعار کے پڑھے جانے کی فرمائش کرتا تو ہمیشہ یہی فرماتے تھے کہ ان لوگوں کے کلام کے بعد میرے کلام کے پڑھے جانے کا کیا موقع ہے اور کبھی بخوشی اس کی اجازت دیتے تھے۔ انتقال سے تھوڑی ہی مدت قبل کا واقعہ ہے کہ سر مہاراجہ نے سید محمد یوسف صاحب نعت خواں سے جن سے وہ اخیر زمانہ میں بیحد مانوس ہو گئے تھے کچھ پڑھنے کی فرمائش کی انھوں نے ایک غزل خود مہاراجہ کی اور ایک غزل محوی صاحب کی جو انہیں یاد تھی سنائی اسے سنکر حسب معمول بہت محظوظ ہوئے اور بہت تعریف کی۔ اس صحبت میں ایک صاحب نے فرمایا کہ اس میں شک نہیں جیسا کہ جناب والا نے فرمایا۔ محوی صاحب کی فارسی بہت صاف اور دلنشین ہوتی ہے مگر جناب والا کی زبان بھی کچھ ان سے کم نہیں۔ یہ سنکر سر مہاراجہ نے ان صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ آپ مجھے بناتے ہیں یا یہ نہ کرتے ہیں کہ میں اچھے اور برے کلام میں تمیز نہیں کر سکتا۔

ان واقعات سے کیا یہ نہیں ثابت ہوتا کہ سر مہاراجہ ایک سخن سنج، سخن

سخن داں اور قدرداں امیر تھے، اور طبقۂ اُمرا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ اُن کے اُٹھ جانے سے اِس قسم کی علمی اور ادبی صحبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔ خداوند تعالیٰ اعلیٰحضرت بندگانعالی متعالی نواب میر عثمان علیخاں مدظلہ العالی "اجادہ" دکن کو دیرگاہ سلامت باکرامت رکھے جن کے دم سے حیدرآباد کی علم دوستی سخن سنجی اور شعرانوازی کی قدیم روایتیں ہنوز زندہ ہیں۔

"یم ۔ اے۔

جمشید رفت و جام نرفت

کدام جلوۂ خورشید در ظلام نرفت
کدام قبضۂ شمشیر در نیام نرفت

کدام برق درخشاں نہاں زدیدہ نشد — کدام صبح سعادت بعہد شام نرفت
بہر کجا نگرم فیض شاد می بینم — مثل زنند کہ جمشید رفت و جام نرفت
بکام سلطنت افروخت روی ناموری — یمین سلطنت از کام رفت و نام نرفت
بکامیابی درویش عرض حال نبود — روائے کار شد و درمیاں کلام نرفت
نظام سلطنت از رائ روشنش محکم — کہ جز براہ نکو خواہیِ نظام نرفت
جہاں گرفتہ باخلاص جود و صدق کرم — براہ خدعہ و تزویر ہیچ گام نرفت

خوشا حریم در شاد آسمانِ وفا
بجز درش قدم آسمان خرام نرفت

عبداللہ عمادی

تاثرات

حضرت شاد کی خدمت میں ذاتی حصول نیاز کا موقع تو ایک ہی بار ملا لیکن وہ ایک ملاقات بھی بھولنے والی نہیں۔ شرافت، ذرہ نوازی، بندہ نوازی، لطف و مرحمت، مشرقی اخلاق و تہذیب کی ایک جیتی جاگتی تصویر سامنے تھی اور چشم تصور کے سامنے آج تک ہے۔

"ہندو مسلم اتحاد" اگر کوئی معنی رکھتا ہے تو اس خواب کی زندہ تعبیر مہاراجہ بہادر کی ذات تھی۔

مراسلت کی دولت سالہا سال تک میسر رہی۔ ہر مکتوب ایک نعمت ہوتا تھا نعمت ادبی حیثیت سے بلند پایہ، اکثر صوفیانہ و اخلاقی مضامین سے معمور۔ بارہا کلام شاد سے سرفرازی ہوئی۔ پتہ کہیں سے نہ چلنے پاتا کہ کوئی بڑا آدمی کسی معمولی حیثیت والے کو مخاطب کر رہا ہے!

بہت زمانہ کی بات ہے۔ غالباً ۱۹۱۶ء کی۔ میرا ایک ڈرامہ "گمنام" اردو میں شائع ہوا تھا چھوٹی سی کتاب، نوشقی کی مثال۔ اب اسے اپنی جانب منسوب کرتے بھی شرم آتی ہے۔ ایک کرم فرما کے توسط سے دو نسخے مہاراجہ بہادر کی خدمت میں بھیجے۔ قیمت کل ۸؍ اس کے بجائے دو اشرفیاں (پچیس پچیس روپیہ والی) عنایت ہوئیں! اس قدر افزائی کا گمان تک نہ تھا۔ دنگ رہ گیا!

ایک بار ایک دوست کے ایک ماہانہ رسالہ کی سفارش میں خط لکھا۔ پہلی ڈاک سے کئی [illegible] مرحمت ہوگئی۔

فیاضیوں، قدر دانیوں، سرپرستیوں کی مثالیں ان گنت ہیں۔

دل عجیب وغریب پایا تھا۔ ایسے دل پر سیکڑوں دماغ قربان۔ اردو زبان و ادب پر استادانہ نظر رکھتے تھے۔ جس ڈراما کا ذکر ابھی آچکا ہے، اُس کا ایک نسخہ واپس فرمایا۔ ایک تو مہاراجہ بہادر کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی سے محشیٰ۔ ہر حاشیہ، ادبی حیثیت سے آنکھوں سے لگانے کے قابل۔ قابلِ مبارکباد ہے دکن کی سرزمین، جس نے اس دل اور اس دماغ کی شخصیت پیدا کی۔

عبدالماجد دریابادی

اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ تغیر ہی وہ چیز ہے جسے لا یتغیر کہہ سکتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ بادشاہ محمد تغلق کے حکم سے دلی والے چل چل کر اور حکم عدولی میں جان کے خوف سے دکن کو گئے تھے۔ تاریخ میں اس واقعہ کے مفصل کوائف محفوظ ہیں۔ پھر چند صدیوں بعد وہ زمانہ آیا کہ ناگزیر حالات سے تنگ اور مجبور ہو کر ارباب ادب اور ہر قسم کے اہل کمال و ماہر فن دکن میں جا کر پناہ گزین ہوئے۔ جہاں تک ادب کا تعلق ہے مہاراجہ چندو لال مرحوم کا نام نامی ادب نوازی اور شاعر پروری میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ شاہ نصیر انہی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ حضرات ناسخ، ذوق و غالب کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے مگر وہ بوجوہ اس سے استفادہ نہ کر سکے۔

یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر اسی معدن کے گوہر شاہوار تھے۔ کیوں نہ وہ بھی ادب اور شعر کی سرپرستی میں سرگرمی اور دریا دلی دکھاتے۔ ایک شاد، ظہیر، راسخ وغیرہ ہم پر کیا منحصر ہے کون اہل ادب اور سخن سنج ہے جو حیدر آباد گیا اور آپ کی ادب نوازی سے فیضیاب اور سرفراز نہ ہوا؟

یہ تو ہوئی ایک بات۔ پچھلے چالیس پچاس برس سے جو چال زمانہ چل رہا ہے سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ پرانے ادارے معاشرت کے مٹ رہے ہیں۔ قدیم روایات اور اجتماعی اخلاق رخصت ہو رہے ہیں۔ پرانی تہذیب اور کلچر دم توڑ رہی۔ اور وہ مروت اور رواداری جو ہمارے ہندو مسلم اتحاد کا مولود تھیں سوکھے کے عارضے میں مبتلا ہیں۔

ان عوارض نامسعود میں مہاراجہ بہادر کی مبارک ہستی ریگستان میں مرغزار کا حکم رکھتی تھی۔ آپ کی ذات والا صفات میں وہ وہ جوہر تھے جو ہمارے ملک کے امراء و عمائدین اب کم اور کم ہوتے

جارہے ہیں ۔ جنبہ داری و تنگ نظری اور ملی و قومی عصبیت سے آپ کوسوں دور تھے ۔ آپ کی سرکار میں مذہب و ملت کا امتیاز ناپید تھا ۔

سلطنت دکن کی کیا کیا خدمات جلیلہ انھوں نے انجام دیں اس تذکرے کی مجھے ضرورت نہیں ادب میں انھوں نے جو کچھ کیا وہ دوسرے امرا و عمائد کے لئے خضر راہ بننے کا حق رکھتا ہے ۔ انھوں نے نہ صرف ادیبوں و شاعروں ۔ اور مصنفوں کی عزت افزائی اور دستگیری کی بلکہ ایسی متعدد اور گرانقدر تصانیف اور تالیفیں چھوڑ گئے جن سے ہمارے ادب کو چار چاند لگے ۔ جامعہ عثمانیہ نے جب اردو کو تعلیمی زبان قرار دیا تو آپ کی بیدار مغزی، حسن تدبر اور ادبی گرمجوشی سے اس جدت حسنہ کی قبولیت میں گراں بہا امداد ملی ۔

مہاراجہ بہادر کی دائمی جدائی نہ صرف مرحوم کے اعزا و احباب کا دل خون کرتی ہے بلکہ وہ ایسا قومی سانحہ ہے جس کا ماتم تمام ملک میں مدتوں رہے گا ۔

برجموہن دتاتریہ کیفی



"ہم علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر کے ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ قطعہ بالبدیہہ لکھ کر عنایت فرمایا" ۔۔ ایڈیٹر

یمین السلطنت کی موت

سینۂ مشرق کا ناسور

زمانہ اپنی تاریخ خود لکھتا ہے، واقعات کے قلم سے! آج کی باتیں، کل تاریخ بن جاتی ہیں، ہر زندگی ایک تاریخ ہے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مورخ کا ذمہ دار قلم، جھونپڑوں کو چھوڑ کر، قصر و ایوان ہی کی تصویریں کھینچتا رہتا ہے۔ تاریخ کا یہ نہایت ہی تاریک پہلو ہے!

میں جس کی سیرت کے نقوش کاغذ پر پیش کر رہا ہوں، وہ اگرچہ قصر و ایوان ہی کا رہنے والا تھا، مگر اس کے پہلو میں بوریا نشین فقیر کے دل سے زیادہ متواضع اور درد مند دل تھا۔ دولت کے بندے اور دھن کے پجاری، جھونپڑوں میں رہ کر، محلوں کے خواب دیکھتے ہیں، لیکن یہ "فقیر منش امیر" محلوں میں رہ کر، جھونپڑوں کی زندگی پر رشک کرتا تھا تاریخ اس کو "مہاراجہ" "یمین السلطنت" اور "جی سی آئی" کی حیثیت سے نہیں، بلکہ جوہر شناس، پریشاں حالوں کے غمگسار اور درویش صفت امیر کے نام سے یاد کرے گی۔

بارہ سال کی مدت میں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر آنجہانی کے یہاں کیا کیا دیکھا؟ اس کی شرح و تفصیل چند اوراق میں کس طرح سما سکتی ہے۔ اس وقت جبکہ یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں، حافظہ، واقعات و مشاہدات کے اوراق جلد جلد الٹ رہا ہے، ان ہی اوراق کے چند غیر مرتب ٹکڑے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں!

پہلی ملاقات | میں ۱۹۲۶ء میں، سب سے پہلی مرتبہ حیدرآباد آیا، مہاراجہ بہادر یمین السلطنت

کا نام بچپن سے سنتا آیا تھا، یہاں آکر دوسرے دن ہی، مولانا عبدالقدیر صاحب بدایونی کی معیت میں مہاراجہ بہادر سے ملنے کے لئے گیا، برسات کی رت تھی، مہاراجہ بہادر ارجن بھون (الوال جاگیر) میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایڈی کانگ نے اطلاع کی، طلبی ہوئی، میں نے حاضر ہوکر آداب عرض کیا، جس کا جواب شگفتہ مسکراہٹ، خمیدہ گردن اور اٹھتے ہوئے ہاتھوں سے دیا گیا۔ مولانا موصوف نے تعارف کرایا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا، مہاراجہ بہادر نے اپنے ہاتھ سے چائے کی پیالی بنا کر عنایت کی، ملازم کیک، پیسٹری اور نقل کی کشتی لیکر سامنے آیا۔ اس کے بعد مہاراجہ بہادر نے پان بنا کر دیا، اور پھر فرمایا:

"کوئی غزل تو عنایت کیجئے"

میں نے غزل سنانی شروع کی، مہاراجہ بہادر نے ہلکی سی جھرجھری لی، اور ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے ادھر برسات کی رم جھم ہو رہی تھی، اور ادھر یمین السلطنت کی آنکھیں موتی لٹا رہی تھیں۔ ایسی قیمتی داد بہت ہی کم میسر آتی ہے۔ اس دن مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میرے اشعار جاہ و دولت کی آنکھوں کو بھی اشکبار کرسکتے ہیں، مگر یہ غالباً خودی کی "نمود اولین" تھی، میرے اشعار سے زیادہ، مہاراجہ بہادر کا درد مند قلب کارفرما تھا۔

ایک غزل کے بعد، اور ایک غزل سنانے کے لئے ارشاد ہوا، میں نے دوسری غزل سنائی، رخصت ہوتے وقت فرمایا کہ "آیا کیجئے"! میں اپنی قیام گاہ کو تاثرات کا ایک طوفان لیکر واپس ہوا۔

میں حیدرآباد رہنے کے خیال سے نہیں آیا تھا۔ اسلامی حکومت کے دیکھنے کی خواہش مجھے یہاں کھینچ لائی تھی، مگر مہاراجہ بہادر کے التفات وکرم نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دیں اور واپس نہ جانے دیا۔ پہلی ملاقات ہی میں ان کے خلوص و محبت کا جادو چل چکا تھا۔ بعد کی صحبتوں اور ملاقاتوں نے اس خدشہ کو بھی دور کر دیا کہ ان کے دربار میں خوشامد اور قصیدہ خوانی کے بغیر بھی قبولیت حاصل ہو سکے گی اور جاہ و منصب اور خودداری کی ٹکر نہ ہوگی، میں کہ

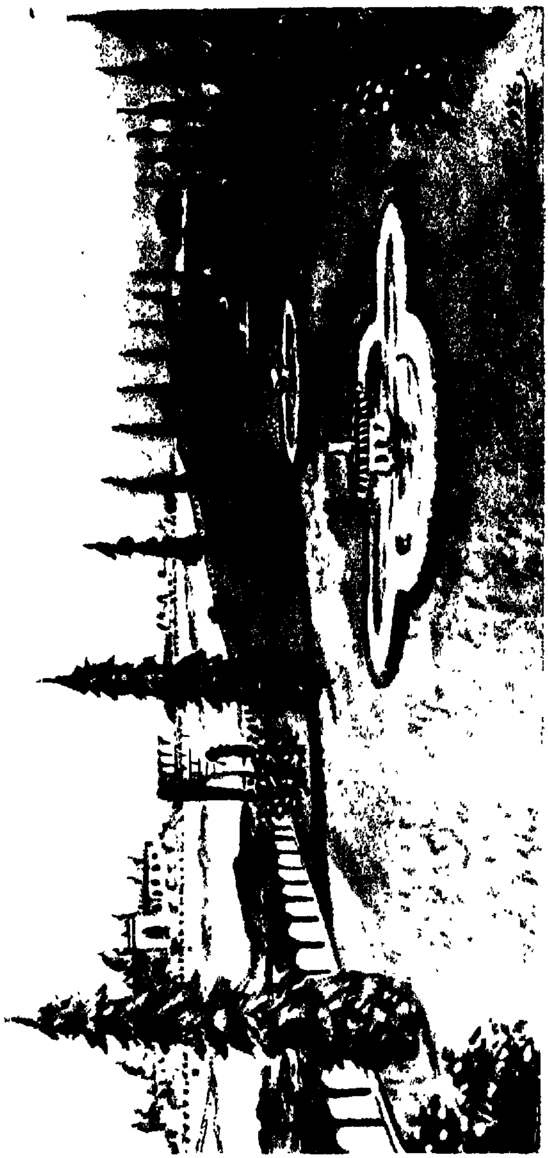
درباعِ داری اور امیروں کی مزاج شناسی کے فن سے یکسر ناواقف ہوں، مہاراجہ بہادر کے دربار میں اِتنے دن تک اسی لئے مبہو گیا کہ وہ "یمین السلطنۃ" سے زیادہ "فقیر شاد" تھے۔

آرٹ کا ذوق | مہاراجہ بہادر کی طبیعت کو "آرٹ" سے خاص لگاؤ تھا۔ شاعری تو ان کا اوڑھنا بچھونا ہی تھی، وہ بہترین خطاط اور مصور بھی تھے۔ ایران کے مایہ ناز خوشنویس اور دلی کے آثار کے لکھے ہوئے قطعات کو سامنے رکھ کر انھوں نے برسوں مشق کی تھی، اعتقاد کے لحاظ سے اگرچہ فطرت بت شکنی کی طرف مایل تھی، مگر آرٹ کا اتنا ذوق تھا کہ مٹی کے اچھے ناسے پتلے بنا لیتے تھے ـــ بت شکنی اور بت گری کا اجتماع ـــ! موسیقی کو وہ عبادت سمجھ کرتے تھے، طبیعت شاعرانہ پائی تھی، اس لئے خوش گلوی کے ساتھ "روئے زیبا" کو ضروری سمجھتے تھے، ناری رنگینوں سے ایک حد تک واقفیت تھی، جوانی میں ستار بجانے کا بھی شوق تھا۔ اہل ذوق نے شعر، تصویر اور موسیقی کو فنونِ لطیفہ میں شامل کیا ہے، لیکن "خوش مزاجی" کے بغیر یہ مجسمہ تیار ہی نہیں ہوسکتا، اگر میری بات مان لی جاتی تو میں رائے دیتا کہ "خوش مزاجی" کو بھی فنونِ لطیفہ میں شامل کر لیا جائے۔ مہاراجہ بہادر کی خوش مزاجی اور خوش سلیقگی فنونِ لطیفہ میں روح بن کر سما گئی تھی۔

میں نے اُن کو کبھی گاتے نہیں سُنا، لیکن گنگناتے ہوئے دیکھا ہے، جب طبیعت موج پر آتی اور بے تکلف لوگوں کا مجمع ہوتا تو گنگنانے لگتے اور انگلیوں کو باقاعدگی کے ساتھ جنبش دیتے جیسے کوئی ساز چھیڑتا ہے۔ تصویر کشی میں قدرتی مناظر سے بہت دلچسپی تھی۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کو مہاراجہ بہادر کی بنائی ہوئی تصویروں کو محفوظ کر لینا چاہیئے۔

یمین السلطنۃ کی موت "آرٹ" کا سانحہ!

سخاوت۔ | داد و دہش ان کی سیرت کا سب سے زیادہ رُوشن اور نمایاں پہلو ہے۔ کتابوں میں آل برامکہ کی فیاضیوں اور قدر شناسیوں کی داستانیں پڑھی تھیں، دربارِ شاد میں آنکھوں سے دیکھ لیں۔ اُن کی سخاوت کو فروتنی اور تواضع نے اَو



زیادہ بلند بنا دیا تھا۔ وہ بخشش کر کے اُلٹے شرماتے تھے، اور زیادہ سے زیادہ دے کر سمجھتے تھے کہ کچھ نہیں دیا۔ اُن کے ہاتھ سے سچ مچ چاندی سونے کا فوارہ اُبلتا تھا، جس کو بلدے کی گلیوں میں بھی گہر افشانی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ گلیوں میں مانگنے والے فقیروں سے لیکر خانقاہوں کی مسندوں اور سجادوں پر بیٹھنے والے تک، اُن کے دستِ کرم سے مستفید ہوتے تھے۔ اُن کی سخاوت کا نظریہ مذہب و ملت، اپنے پرائے اور ملکی و غیر ملکی کی قید سے آزاد تھا۔ بالکل ساون کی گھٹاؤں کی طرح جو لالہ زار پر بھی برستی ہیں اور چٹیل میدانوں اور سنگلاخ وادیوں میں بھی!

ایک دن کسی نے عبد الرحیم خانخاناں کی داد و دہش کا قصہ سُنایا تو اتنا سخی دل رکھنے کے باوجود، اپنی "تہی دامنی" پر بہت دیر تک ہاتھ ملتے رہے۔ بادشاہوں اور امیروں کی داد و دہش کی داستانوں کو وہ بہت دلچسپی کے ساتھ سنتے تھے۔

فقیر شاد، آرٹسٹ سے زیادہ سخی تھا!

مشرقی فطرت | کھانے، پہننے، بولنے، چالنے اور اُٹھنے بیٹھنے میں وہ سرتا بقدم "مشرقی" تھے۔ مغربی تہذیب پر بڑے لطیف انداز میں طنز کیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے لئے، مغربی دماغوں کے بنائے ہوئے دستور، مہاراجہ بہادر کی "مشرقی فطرت" کو تشویش میں ڈالتے تھے۔ اُن کی محفل، مغلیہ دربار کی آخری جھلک تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے تاریخ نے سچ مچ اپنے کو دُہرا دیا تھا، ملک اور بادشاہ کے سچے فدائی، وضعداری میں اپنی آپ نظیر، قدیم روایات کے پابند، متواضع، منکسر المزاج اور سب سے بڑھکر یہ کہ شکستہ حالوں سے جھک کر ملنے والے! مہاراجہ بہادر کی ان ہی خوبیوں نے میری زبان سے کہلوا کر چھوڑا:۔

محفلِ ہستی سے تو کیا اُٹھ گیا
وضعداری کا جنازا[1] اٹھ گیا

---

[1] جنازہ۔

ذوق علم طلب علم کا ان کو غیر معمولی شوق تھا، وہ آخر وقت تک طالب علم رہے۔ کوئی ان کی بھول چوک پر ٹوکتا، تو برا نہ مانتے بلکہ شکرگزار ہوتے، جو بات معلوم نہ ہوتی، دوسروں سے پوچھنے میں شرم نہ کرتے۔ خوابگاہ سے لیکر دربارعام تک ہر طرف کتابیں رکھی رہتیں، جب فرصت ملتی، کتابوں کا مطالعہ کرتے، کوئی اچھا شعر سناتا تو فوراً لکھ لیتے۔ شہر میں کہیں جاتے تو بھی کتابیں ساتھ ہوتیں۔ سفر، حضر میں کہیں بھی کتابیں ان سے جدا نہ ہوتی تھیں۔ زیادہ تر اردو کی کتابیں پڑھتے تھے۔

علمی ذوق کی انتہا ہے کہ بڑھاپے میں سنسکرت اور ترکی زبان سیکھنی شروع۔ طالبعلموں کا احترام کرتے تھے، کسی تقریب اور جلسہ کے سلسلہ میں طلبا کا کوئی وفد آتا تو فوراً بلا لیتے۔ اپنے بچوں کو پابندی کے ساتھ مدرسے جانے کی تاکید کرتے۔ اہل علم کی بہت زیادہ قدردانی فرماتے۔

قدر شناسی اور علم و فضل "فقیر شاد"
کے لئے رو رہے ہیں!

شعر وسخن شعر وسخن، ان کا دن رات کا شغلہ تھا، مہینوں اور برسوں، روزانہ مسلسل غزلیں کہی ہیں۔ شعر بہت جلد کہتے تھے، تخیل کی بلندی سے زیادہ سادگی کا خیال رکھتے تھے، دقت پسند نہ تھے، الجھے ہوئے اشعار کو ناپسند کرتے تھے۔ کوئی اور ہو یا نہ ہو، کوئی نہ کوئی شاعر ان کی محفل میں ضرور نظر آتا۔ بہت سے لوگ، مہاراجہ بہادر کے یہاں رسوخ حاصل کرنے کے لئے "شاعر" بن گئے، ان کا دربار شاعرنواز بھی تھا اور شاعرگر بھی! اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے۔ دل شکنی ان کے مذہب میں کفر تھی، "متشاعرین" بھی ان کے یہاں سے خوش ہو کر جاتے۔ کسی کی غزل پسند آجاتی تو اس پر دوغزلہ اور سہ غزلہ تک کہتے۔ متقدمین اردو شعرا میں وہ غالب کے مداح نہیں بلکہ عاشق تھے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے غالب کے شعر سے مہاراجہ بہادر کے شعر کا تقابل کیا تو چہرہ خفگی کے اثر سے

تمتما اٹھا۔

موجودہ دور کے وہ شعراء جو اپنا ذاتی تخیل نہیں رکھتے، اور صرف الفاظ سے کھیلتے رہتے ہیں، اُن کا کلام رسالوں میں پڑھکر کہتے:۔

" ہماری سمجھ میں تو یہ شاعری آتی نہیں"

اُردو زبان کے وہ ہندوستان میں سب سے بڑے حامی اور سرپرست تھے، اُردو کی مخالف تحریکوں سے اُن کو بڑا دُکھ ہوا اور اس موضوع پر وہ اپنے خیالات ظاہر کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، مگر زمانہ نے فرصت نہ دی!

مہاراجہ سرکشن پرشاد کی موت نے مشرقی روایات اور قدر شناسی کے سینہ میں ناسور ڈال دیا، دیکھئے کب تک اس کا اندمال ہوتا ہے!

ماہرالقادری

اقبال اور شاد کی مراسلت

گزشتہ نصف صدی میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر گذرا ہو جس سے مہاراجہ سرمین السلطنت شاد کے تعلقات نہ ہوں۔ پھر اُردو کے سب سے بڑے شاعر علامہ سر اقبال اس رشتہ مودت میں منسلک ہوئے بغیر کیسے رہ سکتے تھے! یوں تو ان دونوں کی شناسائی پہلے ہی سے تھی۔ لیکن ۱۹۱۳ء کی ملاقات نے آپس میں وہ الفت و یگانگت پیدا کر دی جس کی نظیر اُردو ادب میں شاذ ہی ملے۔

اس سال ماہ جولائی میں مہاراجہ نے اجمیر اور پنجاب کا سفر کیا تھا اور ۱۷ر جولائی کو شب کے ساڑھے نو بجے گیارہ دن کی سیر و سیاحت کے بعد لاہور پہنچے تھے۔

"اسٹیشن پر میرے سب پرانے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا موجود تھے ان سے ملا اور اپنے ڈبوں کو علاحدہ کرا کر ایک طرف قیام کیا" (سیر پنجاب ص ۸۸)

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور میں شاد کے یہ ایک ہی دوست تھے جنہوں نے رات کے وقت اسٹیشن پہنچکر ان کا استقبال کیا۔ اقبال کے علاوہ اگر اور بھی لوگ ہوتے تو مہاراجہ اپنی عادت کے مطابق ان کا بھی ضرور تذکرہ کر دیتے۔ چنانچہ دوسرے روز کے روزنامچے میں لکھتے ہیں :-

"مولوی عبدالعزیز صاحب منیجر پیسہ اخبار اور سید جالب صاحب دہلوی جائنٹ ایڈیٹر پیسہ اخبار ملاقات کے لئے آئے"

پھر آگے لکھتے ہیں :-

"۵ بجے شام کے میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا آئے۔ بہت دیر تک لطف صحبت رہا۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں۔ خدا زندہ رکھے۔ چونکہ برخوردار عثمان پرشاد طال اللہ عمرہ کا مزاج اچھا نہیں ہے اس لئے حسب مشورہ ڈاکٹر محمد اقبال ڈاکٹر محمد حسین کو جو لاہور کے نامی ڈاکٹر ہیں طلب کرکے دکھایا

. . . .

۹ بجے پھر ڈاکٹر محمد اقبال آئے اور اُن کے اصرار سے مع دو مصاحبوں کے آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں گیا۔" (سیر پنجاب ص ۹۱)

اسی طرح غالباً ہر روز علامہ اور علم دوست مہاراجہ کی ملاقات ہوا کرتی تھی لیکن ۲۲ جولائی کے روزنامچے میں مہاراجہ نے لاہور کے معززین میں اقبال کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

"بعض اکابر و معززین بر دری نے میرے لاہور میں (جو میرا اجادی وطن ہے) آنے کی خوشی میں ایک جلسہ تھیٹر ہال میں منعقد کیا اور میں ۶ بجے شام کے رائے بہادر رام سرنداس و لالہ کرم چند مجسٹریٹ و ڈاکٹر محمد اقبال اور نیز دیگر معزز حضرات کی معیت میں اس جلسہ میں گیا۔"

اس واقعہ کے دوسرے روز ساڑھے تین بجے انجمن حمایت اسلام کا ایک وفد مہاراجہ سے ملنے کے لئے آیا جس میں غالباً علامہ اقبال بھی شریک تھے۔ اس وفد کو انجمن کے یتیم خانہ کے لئے مہاراجہ نے ایک ہزار روپیہ عطا کیا۔

۲۴ جولائی کو شام میں ہرکشن تھیٹر ہال لاہور میں مہاراجہ کے استقبال کے لئے ایک دوسرا عظیم الشان جلسہ آنریبل رائے بہادر رام سرنداس کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی صدارت ڈاکٹر سر پرتول چند چٹرجی نے کی اور بہ حیثیت صدر اپنی افتتاحی تقریر میں باشندگان لاہور کی طرف سے مہاراجہ کا خیر مقدم کیا۔ اس موقعہ پر سفرنامہ میں لکھا ہے :-

---

۵۷ یہ کتاب مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ میں ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی رائل سائز ۱۵۹ صفحات

"ان کے بعد آنریبل رائے بہادر رام سرن داس اور ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا و مسٹر اکبر علی بیرسٹرایٹ لا۔ وآغا حشر کاشمیری۔ وجالب صاحب جائنٹ اڈیٹر پیسہ اخبار نے نہایت جوش اور سنجیدگی کے ساتھ پرمعنی تقریریں کیں اور ہر ایک نے اپنے حسن ظن کی (سے) میرے خاندانی اعزاز و خدمات وخطابات پر روشنی ڈالی

(سیر پنجاب ص ۱۰۶)

غرض اس جلسہ میں علامہ محمد اقبال کو اپنے اس امیر دوست اور مہمان کے متعلق اپنے تاثرات کے اظہار کا پہلی دفعہ موقعہ ملا تھا۔ ان تقریروں کے جواب میں مہاراجہ نے ایک اہم اور طویل تقریر کی جس میں انہوں نے اپنے ہندو مذہب کا علی الاعلان اعتراف کیا اور نعت لکھنے اور دیگر اسلامی امور میں دلچسپی لینے کی توجیہہ بیان کی۔ اس تقریر میں دو جگہ شاد نے اتفاق و اتحاد کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بیان کی وضاحت اور سند کے طور پر اقبال کے حسب ذیل شعر بھی پڑھے ؎

(۱)　نظارہ کہکشاں نے مجھ کو عجیب نکتہ یہ کل سمجھایا　　ہزار گردش رہی فلک کو مگر یہ تارے بہم رہے ہیں

(۲)　چمن میں اے ہم صفیر اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا　　خزاں کا دورہ ہے گلستاں میں نہ تو رہا ہے نہ ہم رہے ہیں

اثنائے تقریر میں اقبال کے اشعار سنانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک مہاراجہ نے ان کی شاعری سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا تھا۔ اور خود اقبال نے لاہور کی صحبتوں میں مہاراجہ کو اپنے کلام سے شاد کام کیا تھا۔

لاہور سے واپس ہوتے وقت ڈاکٹر اقبال نے اپنے دوست محمد حسین کے اسسٹنٹ سید برہان صاحب کو مہاراجہ کے اسٹاف میں منسلک کر دیا تھا۔ چنانچہ جب پانی پت میں[۱] ٹھہرتے ہوئے جہاز بہادر کانپور پہنچے تو درد شکم میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انہی سید برہان صاحب نے علاج کیا۔ روزنامچے میں لکھا ہے۔

"سید برہان صاحب اسسٹنٹ ڈاکٹر محمد حسین نے جو میرے اسٹاف میں تھے دوا حاضر کی ۱۲ بجے افاقہ ہوا" (ص ۱۴۳)

---

[۱] پانی پت کے قیام کے زمانہ میں مولانا حالی نے بھی مہاراجہ سے ملاقات کی ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ آج صبح (۲۸ جولائی ۱۹۱۳ء) کو مولوی الطاف حسین حالی آئے ان کا دم نہایت غنیمت ہے۔ گو پیری نے اپنا عمل دخل کر لیا ہے۔ مگر دل جوان اور عقل آزمودہ کار ہے۔ ان کی ہر بات دل سے نکلتی ہے۔ اور دل میں ایسی اترتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ خدا ان کو دور رکھے۔ لطف صحبت سے میں نہایت محظوظ اور مستفید ہوا۔ بہت دیر تک باتیں رہیں (سیر پنجاب ص ۱۴۲)

غرض اس ملاقات نے دونوں کے تعلقات بہت استوار کر دیئے تھے۔ اور ان کے آپس میں مراسلت کے ذریعہ سے اکثر نصف ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ چنانچہ علامہ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء کو لاہور سے لکھتے ہیں۔

"سرکار کی بندہ نوازی کا سپاس گزار ہوں کہ اس دور افتادہ دعا گو کو بالالتزام یاد فرماتے ہیں۔"

مہاراجہ نے اپنے خط میں اقبال سے یہ شکوہ کیا تھا کہ لاہور سے نکلے ہی تھے تو حیدرآباد چلے آتے اس کے جواب میں علامہ لکھتے ہیں :-

"لاہور سے ایک ماہ کی غیر حاضری کا مقصد سیاحت نہ تھا۔ اگر سیاحت کے قصد سے گھر سے باہر نکلتا تو ممکن نہ تھا کہ اقبال آستانۂ شاد تک نہ پہنچے مقصد محض آرام تھا۔ لاہور کورٹ میں تعطیل تھی . . . .

پہاڑ جانے کے لئے سامان موجود تھا۔ مگر صرف اس قدر کہ تنہا جا سکوں تنہا جا کر ایک پر فضا مقام میں آرام کرنا اور اہل و عیال کو گرمی میں چھوڑ جانا بعید از مروت معلوم ہوا۔ اس واسطے ایک گاؤں میں چلا گیا . . . ."

پھر اپنی ادبی مصروفیت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں :-

"اس تنہائی میں مثنوی اسرار خودی کے حصہ دوم کا کچھ حصہ لکھا گیا اور ایک نظم کے خیالات یا پلاٹ ذہن میں آئے جس کا نام ہوگا "اقلیم خاموشاں" یہ نظم اردو میں ہوگی۔ اور اس کا مقصد یہ دکھانا ہوگا کہ مردہ قومیں دنیا میں کیا کرتی ہیں۔ ان کے عام حالات، جذبات، و خیالات کیا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ بس یہ دو باتیں میری تنہائی کی کائنات ہیں۔"

مہاراجہ نے اس خط کا جواب عادت کے خلاف ذرا دیر سے دیا۔ ورنہ جس روز خط ملتا اسی روز جواب دیدیا کرتے تھے۔ اس تعویق کی معذرت یوں چاہتے ہیں :-

"مائی ڈیر اقبال۔ آپ کا خط مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۱۶ء مجھے ملا۔ اس وقت تو خوش کیا وقت ناخوش کر دی۔ جواب میں دس روز کا وقفہ ہوا جس کا سبب میرے چھوٹے علاتی بھائی راجہ گوبند پرشاد کا انتقال تھا۔ آنجہانی کی عمر ۲۶ سال کی تھی۔ ہائے۔

ع این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

متوفی کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ ماہ ربیع الاول میں اس کے اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ مگر افسوس کہ چار مہینے قبل ہی وہ عروس اجل سے ہمکنار ہو گیا۔ اور عزیزوں کو داغ دائمی جدائی کا دے گیا۔"

اس سلسلہ میں متوفی کے اخلاق و عادات کی تعریف اور موت و غم کے فلسفہ پر خیال آرائی کرنے کے بعد لکھتے ہیں:—

"آپ کی نظم اقلیم خاموشاں کے دیکھنے کا مجھے بے چینی کے ساتھ انتظار رہے گا مگر مجھے امید ہے کہ اقلیم خاموشاں اسم بامسمیٰ ہوگا۔ ایسا نہ ہو اقلیم حشر ہو جائے اور دار و گیر کی صدائیں ہر طرف سے گونج کر مہر خموشی کو توڑ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس خط کے جواب میں ۱۳ اکتوبر کو علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں:—

"والا نامہ مل گیا ہے۔ جس کے لئے میں سرکار کا سپاس گزار ہوں۔ راجہ گوبند پرشاد مرحوم و مغفور کی خبر رحلت معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے۔ کتنے رنج و قلق کی بات ہے کہ ایسا نوجوان اس دنیا سے ناشاد جائے۔ لیکن گوبند پرشاد باقی ہے۔ اور یہ جدائی محض عارضی ہے ؎

ہستی عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

لاہور کے حالات بدستور ہیں۔ سردی آ رہی ہے۔ صبح چار بجے کبھی تین بجے اٹھتا ہوں پھر اس کے بعد نہیں سوتا۔ سوائے اس کے کہ مصلیٰ پر کبھی اونگھ جاؤں۔ یہ موسم نہایت خوشگوار ہے۔ اور پنجاب کی سیر و سیاحت کے لئے موزوں۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو

پنجاب کی خاک کو قدم بوسی کا موقع دیجئے۔ یہاں کے دلوں پر آپ کا نقش ابھی تک موجود ہے۔

کبھی اس راہ سے شاید سواری تیری گذری ہے کہ میرے دل میں نقش پا تیرے توسن کے نکلے ہیں

"اقلیم خاموشاں تیار ہو جائے تو سرکار کی خدمت میں ارسال کروں۔ مقصود اقلیم خاموشاں سے محشر ہے تاکہ دیدار الٰہی نصیب ہو کہ یہ موقوف بہ محشر ہے۔

طالب دیدار محشر کا تمنائی ہوا وہ سمجھتے ہیں کہ جرم ناشکیبائی ہوا

زیادہ کیا عرض کروں سوائے اس کے کہ سرکار سے دور ہوں اور جیتا ہوں۔

مخلص محمد اقبال"

ان دو خطوں میں بعض باتیں قابل ملاحظہ ہیں۔ (۱) مہاراجہ کا روز کے مطابق اپنے بھائی گوبند پرشاد کو آنجہانی اور متوفی لکھنا اور علامہ کا فراخ دلی اور بے تعصبی سے مرحوم و مغفور لکھنا اور دعائے مغفرت کرنا۔

(۲) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی ابتدائی زندگی لاابالی اور رنگین گذری اور وفات سے صرف پانچ سات سال قبل ہی فرائض مذہبی کی تعمیل کا جوش پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس خط سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وفات سے بیس بائیس سال قبل ہی سے صوم و صلوٰۃ اور تہجد کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔

(۳) مہاراجہ کے سفر پنجاب نے اقبال اور ان کے ہم وطنوں کے دلوں میں مہاراجہ کی خاص وقعت پیدا کر دی تھی اور جیسا کہ ابتدائے مضمون میں لکھا گیا تھا ان دونوں کے تعلقات میں اس ملاقات کے بعد ہی سے ایک والہانہ کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ مہاراجہ یہ چاہتے تھے کہ اقبال حیدرآباد میں اور اقبال یہ چاہتے تھے کہ مہاراجہ پنجاب آئیں۔ چنانچہ اس مذکورہ خط کے آخر میں مہاراجہ کو پنجاب آنے کا ایک اور طرح سے بھی لالچ دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں:۔

ہاں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ لاہور میں کچھ عرصہ سے ایک بہت بڑے ایرانی عالم مقیم ہیں۔ یعنی سرکار علامہ شیخ عبدالعلی طہرانی۔ معلوم نہیں کبھی حیدرآباد میں بھی ان کا گذر ہوا یا نہیں۔ عالم متبحر ہیں۔ مذہباً شیعہ ہیں۔ مگر مطالب قرآن بیان فرماتے ہیں تو

سمجھنے سوچنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ علم جفر میں کمال رکھتے ہیں ۔ کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا ہوں ۔ اگر اس موسم میں سرکار لاہور کا سفر کریں تو خوب ہو کہ آدمی دیکھنے کے قابل ہے ۔

اس مکتوب کے جواب میں مہاراجہ تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ کے خط رقمزدہ ۱۳ ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کا آج ۱۱ ر نومبر کو جواب لکھ رہا ہوں مگر سوچ رہا ہوں کیا لکھوں ۔ زمانہ کی نیرنگیوں کا مشاہدہ کر رہا ہوں اور انگشت بدنداں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ آج کل میری یہ کوشش ہے خدا اس میں مجھے کامیاب کرے کہ سفر کروں اور اپنے کعبۂ مقصود کا طواف ۔ یعنی بارگاہ حضرت خواجہ پر پہنچکر اپنی امیدوں کا چراغ روشن کروں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اجمیر آنا ہوا تو آپ سے ملاقات ضرور کروں گا ۔ اگرچہ میں خود لاہور آؤں یا آپ کو اجمیر بلاؤں ۔ آپ کے اس فقرہ پر کہ "صبح کبھی چار بجے اور کبھی تین بجے اٹھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے ہنسی آئی ۔ پیارے اقبال تم تو ۸ ۔ ۹ بجے سے یعنی سات آٹھ گھنٹے سوتے بھی ہو ۔ مصلے پر بیٹھ کر اونگھ بھی لیتے ہو ۔ یہاں تو بقول غالب مرحوم ؎

دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالب　　دل رک رک کے بند ہو گیا ہے غالب
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں　　سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

خواب میں بھی نیند نہیں آتی ۔ جب سے لگی ہے آنکھ ترستی ہے خواب کو ۔ ۔ ۔ ۔"

علامہ اور مہاراجہ دونوں کی باہمی کشش قابل دید ہے کہ بعض وقت دونوں نے ایک ہی روز خط لکھے ہیں ۔ چنانچہ مذکورہ خط کا جواب ادھر اقبال نے ۴ ڈسمبر کو دیا اور ادھر مہاراجہ نے بھی اسی روز بمبئی سے اقبال کو خط لکھ کر سفر کی اطلاع دی ۔

بمبئی کے اس سفر سے چند ماہ پیشتر ہی یعنی جنوری ۱۹۱۶ء میں بھی اجمیر جاتے ہوئے مہاراجہ نے بمبئی میں قیام کیا تھا ۔ چنانچہ وہ ۲۳ جنوری کو بمبئی پہنچے اور ایک ہفتہ قیام کے بعد ۲۹ جنوری کو

وہاں سے روانہ ہو کر یکم فروری کو اجمیر شریف پہنچے تھے۔ اور گیارہ روز قیام کرنے کے بعد متھرا کانپور اور آگرہ وغیرہ کی سیر و سیاحت کرتے ہوئے یکم مارچ کو حیدرآباد واپس ہوئے تھے۔ اس سفر کے واقعات مہاراجہ نے ایک ضخیم کتاب "سیر و سیاحت" میں قلمبند کئے تھے جو رائل سائز کے ۲۴۴ صفحات پر ۱۳۳۱ھ میں مولوی سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی کے اہتمام سے ذخیرہ پریس حیدرآباد سے شایع ہوئی تھی۔

حضرت خواجہ اجمیریؒ سے مہاراجہ کو کتنا اعتقاد تھا کہ آٹھ مہینے قبل وہاں کی زیارت کو آئے تھے لیکن ابھی اشتیاق باقی تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے ۳۱ اکتوبر کے خط میں کیا ہے!

۱۹۱۶ء کے آخری دو مہینوں میں جب حیدرآباد میں مرض طاعون نے شدت اختیار کر لی تو اعلحضرت بندگانعالی نے سفر بمبئی کا قصد فرمایا اور مہاراجہ بہادر کو بھی حکم ہوا کہ بمبئی آئیں۔ چنانچہ وہ ۲۷ نومبر کو حیدرآباد سے نکلے اور ۲۹ کی رات میں بمبئی پہنچے۔ ابتدائی چند روز اگرچہ مکان کی تلاش اور پریشانی میں گذرے لیکن ایسی حالت میں بھی وہ اپنے لاہوری دوست کو نہیں بھولے لکھتے ہیں کہ:-

" مائی ڈیر اقبال۔ ۱۴ نومبر کو ایک خط حیدرآباد سے روانہ کر چکا ہوں۔ پہنچا ہوگا۔
آجکل حیدرآباد کی آب و ہوا میں رداءت ہے . . . .
مجھے بھی حکم ہوا کہ تبدیل آب و ہوا کیجئے۔ میں بھی معہ محلات و اسٹاف بمبئی آیا ہوا ہوں
. . . . میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ آپ بخیر و عافیت ہیں۔ کیا اب بھی لاہور نہ بلاؤگے
غضب خدا کا۔ ہائے وہ اثر کسی میں نہ رہا۔"

ادھر اسی روز علامہ اقبال لکھتے ہیں:-

" سرکار والا تبار۔ نوازش نامہ ابھی مل گیا ہے۔ جس کے لئے سراپا سپاس گذار ہوں
سرکار علامہ عبدالعلی ہروی طہرانی سے ملاقات ہوئی تھی وہ نہایت مخلصانہ سلام
آپ کی خدمت میں پہنچاتے ہیں۔ اس سے پیشتر امرائے دکن میں سے کسی سے
سرکار کے اوصاف کا تذکرہ سن چکے تھے۔ فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا سفر کروں گا تو

مہاراجہ بہادر سے ضرور ملاقات کروں گا وغیرہ۔"

پندرہ دن کے اندر علامہ نے مہاراجہ کو دو خط لکھے جن میں سے ایک کے جواب میں مہاراجہ بہادر تحریر فرماتے ہیں :۔

"میرے پیارے اقبال۔ خدا تمہیں دل شاد و سلامت رکھے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ جس وقت اقبال کا خط دیکھتا ہوں باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اور دل نہایت شادماں اور مسرور ہوجاتا ہے۔ اللہ کے واسطے محبت ہے۔ نہ کوئی غرض ہے دنیوی نہ دین سے سوال۔ حالانکہ اس قسم کا ارتباط اور بھی ایک دو سے ہے۔ مگر آپ سے کیوں اس قدر خلوص ہے اس کا علم بھی اس عالم الغیب کو ہے۔ خیر بھئی یہاں تو کسی طرح انشاء اللہ کبھی نہ کبھی مل ہی لیں گے مگر اس عالم میں کس طرح ملاپ ہوگا۔ واللہ اعلم۔ آپ تو جنت میں فرشتے اڑاتے رہیں گے ہم گنہگار . . . .

خیر جب تک زندہ ہیں جب تک تو خدا آتنا نہ ترسائے . . . . . . واللہ چار برس سے لاہور اور اقبال کے لئے دعائیں کر کر کے تھک گیا مگر وائے نصیب کہ دعا مستجاب ہوئی . . . . . مگر افسوس اس کا ہے کہ اتنی دور آکر نہ پیر سنجر کی زیارت نصیب ہوئی نہ اقبال کے دشمن اس سے معلوم ہوا کہ شاد کا اقبال یاور نہیں۔ خیر مرضی اس مالک کی . . . . .

میرے پیارے اقبال خدا کے واسطے لاہور بلاؤ اگر یہ ناممکن ہی ہو تو خیر دشمن ہی ذرا بہت ترس گیا . . . .

بھئی اقبال جب کہ آپ شرمندۂ عقبیٰ کہتے ہو تو میں آپ کو کیا کہوں شرمندۂ دنیا و عقبیٰ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے۔ آپ چھپے رستم ہو۔ خدا خوش رکھے۔ سلامت رکھے۔ میرے لئے دعائے خیر کرو . . . . "

اس محبت نامے کے جواب میں اقبال جیسے مہر و وفا کے پتلے نے کیا لکھا ذرا یہ بھی دیکھ لیجئے!

"سرکار والاتبار۔ تسلیم بصد تعظیم۔

محبت نامہ مل گیا ہے۔ جس کے لئے اقبال سراپا سپاس ہے۔ الحمد للہ کہ آئینۂ دل گرد غرض سے پاک ہے۔ اقبال کا شعار ہمیشہ سے محبت و خلوص رہا ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔ اغراض کا شائبہ خلوص کو مسموم کر دیتا ہے۔ . . . . .

تین چار ماہ ہوئے کہ ارادہ مصمم سفر حیدرآباد کا کر لیا تھا۔ مگر استخارہ کیا تو اجازت نہ ملی خاموش رہا۔ اب سرکار مع الخیر پھر حیدرآباد واپس تشریف لے جائیں اور پنجاب کی سردی بھی قدرے کم ہو جائے تو پھر قصد کروں۔ کئی باتیں راز کی آپ سے کرنی ہیں۔ گو یہ ممکن ہے کہ میرے حیدرآباد آنے تک وہ راز خود بخود آشکارا ہو جائے اور مجھے افشا کرنے کی ضرورت نہ ہو"

غرض ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ اور صداقت و محبت کا یہی جوش دونوں کے درمیان آخر تک باقی رہا۔ ان کے خطوط اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سب محفوظ ہیں۔ اور ان میں سے صرف سو خطوں کا ایک مجموعہ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہو رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی کتابت و طباعت میری گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے مہاراجہ کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی۔ اس میں پچاس خط مہاراجہ کے اور پچاس اقبال کے شریک ہیں۔ اور تاریخی ترتیب کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ دونوں کے اکثر خطوط کئی کئی صفحات پر حاوی ہیں۔ اس طرح یہ "مجموعۂ خطوط شاد و اقبال" تین سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون کو ختم کرنے سے قبل دونوں کے چند اور مکتوبات کے ضروری اقتباس بھی ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مکتوبات اقبال کے اقتباس

"مولوی ظفر علی خان حیدرآباد طلب کر لئے گئے آج میں نے اخبار میں دیکھا کہ وہ وہاں پہنچ گئے۔ نہایت قابل آدمی ہیں۔ اور ذہن ان کا مثل برق کے تیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی علمی قابلیت سے ریاست کو بہت فائدہ ہوگا۔ دو تین روز میں شملہ

رموزِ بیخودی یعنی اسرارِ خودی کا دوسرا حصہ خدمتِ عالی میں مرسل ہوگا۔ کتاب چھپ کر نیا ہے آپ کے لئے جلد بانٹنے کو دی ہے۔" (۱۰ را پریل ۱۹۱۸ء)

"کاش آپ سے ملاقات ہوتی اور کچھ عرصہ کے لئے آپ سے مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ لیکن کوئی بات اپنے بس کی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انشاء اللہ کل صبح کی نماز کے بعد دعا کروں گا۔ کل رمضان کا چاند یہاں دکھائی دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد بھی دعا کروں گا کہ اس وقت عبادتِ الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔ کیا عجب کہ دعا قبول ہو جائے۔

(۱۱ر جون ۱۹۱۸ء)

"میرا ارادہ رامائن کو اُردو میں لکھنے کا ہے۔ سرکار کو معلوم ہوگا کہ مسیح جہانگیری نے رامائن کے قصے کو فارسی میں نظم کیا ہے۔ افسوس ہے وہ مثنوی کہیں سے دستیاب نہ ہوئی اگر سرکار کے کتب خانہ میں ہو تو کیا چند روز کے لئے عاریتاً مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس کا ترجمہ کرنا بہتر ہوگا۔ اس کے متعلق اور مشورہ سے بھی سرکار دریغ نہ رکھیں گے۔" (۲۵ را پریل ۱۹۱۹ء)

"یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی معرفت کے لئے لکھتا ہوں یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سرکارِ والا کی شرفا نوازی کے اعتماد پر اس درخواست کی جرأت کی گئی۔" (۱۴ر جنوری ۱۹۲۴ء)

مکتوبات شادؔ کے اقتباس

" مولٰنا اکبر کے " رین بسیرے " میں بسیرے کی کیفیت قبل ازیں حضرت خواجہ صاحب قبلہ کی تحریر سے معلوم ہوئی تھی چنانچہ فقیر شادؔ نے ایک ٹوٹی پھوٹی نظم بھی رین بسیرے کے نام سے لکھ کر بھیج دی تھی۔ یقین ہے کہ آپ کے قیام دہلی کے وقت ضرور آپ کی بھی نظر سے گذری ہوگی۔ اس اجتماع ثلاثہ پر موحد تو درکنار اہل تثلیث کو بھی رشک آئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر فقیر شادؔ کا تو ترجمان حقیقی یہ ہے کہ — "

رشک بر تشنۂ تنہا رو وادی دارم — نہ بر آسودہ دلان حرم و زمزم شان

(۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء)

" آپ کے خطابات کے متعلق ایک بدمعاش نے دل کے پھپولے پھوڑے اور ذیل کا قطعہ لکھ کر مقامی اخبار رہبر دکن میں چھپوایا۔

کے مرد حق اسیر کمند ہوا شود — گر سر ز تن جدا و تن از سر جدا شود

تاریخ از خطاب بہ سر افراز آمدہ — اقبال را چو قلب کنی لا بقا شود

آپ کے دلی محب کو بہت برا معلوم ہوا فوراً ایک قطعہ لکھ کر اسی روز اسی اخبار میں بھیج دیا۔

اقبال ہر کسے کہ ترقی فزا شود — ادبار حاسدین بجہاں لا بقا شود

چوں بر وجود حاسد او نفی آمدہ — تیغ فنا نہ بہر بقا حرف لا شود

(۱۱ فروری سنہ ۱۹۲۳ء)

" عثمانیہ یونیورسٹی کی طلب پر بھی آپ کا حیدرآباد نہ آنا فقیر شادؔ کی ناشاد کامی کے سوا اور کیا تعبیر کی جاسکتی ہے۔ خیر یار زندہ و صحبت باقی۔ خدا کبھی تو وہ موقع لائے گا کہ شادؔ اقبالؔ کے ساتھ ہم کلام ہو۔ "

(۸ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء)

" پنجاب کونسل کے الیکشن میں تین ہزار کی میجارٹی سے آپ کا کامیاب ہونا فقیر

شاد کے لئے شاد کامی کے ساتھ مبارکباد دینے کا سبب ہے ۔ یوں تو عموماً ہر کامیابی نفیہ شاد کی خوشی کا سبب ہوئی ہے ۔ خصوصاً وہ کامیابی جو عوام اور اقران میں سرخ رو کرے مزید مسرت کا باعث ہے ۔

منصب جلیلۂ صدارت عظمیٰ کے متعلق آپ کے مخلصانہ اور محبت آگین تہنیت تار کا جواب شکریے میں آپ کو پہنچ چکا ہوگا ۔ مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حیدرآباد کے معاملات اس مرکز سے بہت آگے گذر گئے ہیں جہاں پر ان کو فقیر نے ایک دن پیچھے چھوڑا تھا ۔ ....."

(۴ر جنوری ۱۹۲۷ء)

سید محی الدین قادری زور

محبت کے آنسو

[جو حیدرآباد کے تعزیتی جلسہ میں، اشکبار آنکھوں اور غمناک چہروں کے درمیان پڑھی گئی۔]

یہ جہانِ رنگ و بو کچھ بھی نہیں
آبشار و آبجو کچھ بھی نہیں
عشرت و مستی فقط وہم و خیال
گردشِ جام و سبو کچھ بھی نہیں
حسن و خوبی ہے تصور کی نمود
شاہدانِ لالہ رو کچھ بھی نہیں
آدمی بس آرزو کا نام ہے
اور اصلِ آرزو کچھ بھی نہیں

یہ فضا، یہ بام و در کچھ بھی نہیں
یہ نظامِ بحر و بر کچھ بھی نہیں
لالہ و گل ہیں حبابِ رنگ و بو
سبزہ و برگ و ثمر کچھ بھی نہیں
یہ جہاں کیا ہے؟ نگاہوں کا فریب
منظرِ شام و سحر کچھ بھی نہیں
روشنی بھی چلتی پھرتی چھاؤں ہے
طلعتِ شمس و قمر کچھ بھی نہیں

ہستیٔ رنج و خوشی کچھ بھی نہیں
آدمی کی زندگی کچھ بھی نہیں
یہ زمیں یہ آسمان یہ روز و شب
ساحری ہے ساحری کچھ بھی نہیں
ایک ہی ہے منزلِ شاہ و گدا
اس جہاں کی افسری کچھ بھی نہیں
چند سانسوں پر مدارِ زیست ہے
درحقیقت آدمی کچھ بھی نہیں

ماہ و پرویں کہکشاں کچھ بھی نہیں — دہر کی نیرنگیاں کچھ بھی نہیں

ہے گلستاں کو خزاں کا انتظار — یہ لچکتی ڈالیاں کچھ بھی نہیں

یہ جہاں یعنی طلسم عقل و ہوش — جز فریبِ این و آن کچھ بھی نہیں

اے خدائے جزو و کل فریاد ہے!

ہم وہاں پر ہیں جہاں کچھ بھی نہیں

اے مہاراجہ یمین السلطنۃ — چشم پرنم ہے دکن تیرے لئے

کس قدر ہے بیقرار و سوگوار — انجمن کی انجمن تیرے لئے

اب بھی تیری راہ تکتے ہیں فقیر — خون روتا ہے وطن تیرے لئے

آج تک اس[1] روز سے بے چین ہیں — موجِ گنگ و جمن تیرے لئے

کون دے گا ان کے اب جوہر کی داد — نوحہ خواں ہیں اہلِ فن تیرے لئے

کس قدر بے تاب ہے بے چین ہے

وہ ترا ارجن[2] بھون تیرے لئے

وقف تھی جو دردمندوں کیلئے — وہ تیری چشم عنایت یاد ہے

وہ ترے ابر کرم کی بارشیں — وہ ترا دستِ سخاوت یاد ہے

وہ ترا شعر و ادب سے ذوق و شوق — وہ ترا حسن طبیعت یاد ہے

وہ تری سادہ مزاجی کا وقار — وہ تری شانِ امارت یاد ہے

وہ ترا جھک جھک کے فرمانا سلام — مسکرا دینے کی عادت یاد ہے

محفلِ ہستی سے تو کیا اٹھ گیا

وضعداری کا جنازہ[3] اٹھ گیا

ماہر القادری

---

[1] مہاراجہ بہادر کے شمالی ہند کے سفر کی ایک تصویر۔ [2] مہاراجہ بہادر کے ایوان واقع الوال جاگیر کا نام۔ [3] جنازہ۔

"مہاراجہ بہادر"

"مہاراجہ بہادر" کی دلنواز شخصیت کے متعلق ایک ایسا شخص کیا لکھے جس نے انکو صرف دور ہی سے دیکھا ہو۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ وہ دور سے جیسے نظر آیا کرتے تھے۔ نزدیک سے بھی ویسے ہی نظر آتے تھے!۔ دس پانچ مرتبہ جب مجھے ان کی صحبت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی تو ہر دفعہ " شاد مینشن "کے اوس بالائی کمرہ میں مجھے ہندوستان کی مشرقی تہذیب وتمدن کے وہی گزرے ہوئے خواب نظر آئے جن کا دامن شاہان مغلیہ اور دربار آصف جاہی کے قدیم روایات سے وابستہ ہے۔ جس طرح سینما کے متحرک تصویروں میں کبھی کبھی پردۂ سیمین پر کسی ایک ہی تصویر کے پس منظر سے بہت سی دوسری تصویریں پیدا ہوتی ہیں کچھ اسی طرح میرے تصورات میں بھی مہاراجہ بہادر کی شخصیت دربار اکبری کے کسی بست ہزاری امیر کا عکس معلوم ہوا کرتی تھی یعنے اگران کے جسم پر مغلیہ دربار کا رسمی لباس کسی نے دیکھا ہوگا تو اوس دیکھنے والے نے آگرہ کے ایوان شاہی میں راجہ ٹوڈرمل کو دیکھ لیا ہوگا۔ مرحوم کی انجمن آرائی قدیم علم و فضل اور مشرقی تہذیب کی ایک آخری انجمن آرائی تھی جو حیدرآباد میں ختم ہوگئی۔ لیکن قطع نظر اس کے اگران کے دیوان خانہ میں کوئی بھی محفل برپا نہ ہوتی تب بھی وہ بجائے خود ایک انجمن تھے۔ ان کی تنہا شخصیت میں گویا محمد شاہ اور آصف جاہ اول کا ایک پورا دربار آراستہ تھا۔

اہل غرض کا جو ہجوم ان کے گرد وپیش حاضر رہا کرتا تھا اس میں تو شاید بہت ہی کم لوگ ایسے ہوتے ہوں جنھوں نے اس نظر سے مہاراجہ بہادر کی شخصیت کے نقش و نگار کو دیکھا ہو

گو بمجھے تو یاد نہیں کہ میں کبھی شاد مینشن میں حاضر ہوا ہوں اور مہاراجہ بہادر کو دیکھکر مجھے وہ گزری ہوئی محفلیں یاد نہ آئی ہوں جن کا ذکر اب صرف تاریخوں ہی کے صفحات پر باقی رہ گیا ہے۔

عہد جدید کی کشمکش میں زمانہ کے بیرحم ہاتھوں نے دور قدیم کے رُوح پرور آثار کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا اور انسانوں کے تصورات کو اُن کی جدید ترقیوں نے اِتنا منتشر کر ڈالا کہ اب یہ گزرے ہوئے افسانے بھولی ہوئی کہانیاں ہیں۔ روحیں آوارہ ہیں، دل سرد ہیں، فکر و نظم گم ہے اور ایسے لوگوں کی یہ روح افزا خواہیں جو اب بھی گزرے ہوئے زمانہ کا دامن پکڑے چلے جا رہے ہیں محروم تعبیر ہیں۔ تاہم قدامت کے اوس گوشہ میں جہاں "یادِ عہد رفتہ" کی کچھ پرچھائیاں باقی ہیں شاعر اور مفکر اپنی روح کے لئے کوئی نہ کوئی چنگاری ڈھونڈ ہی لیتا ہے اور اپنے تصور کی اس ایک چنگاری سے اپنا سارا آتش خانہ گرم کرلیتا ہے۔

قدیم برگد کے ایک خشک پتے کے گرنے کی آواز شاعر کی ساری دنیا کو ایک المناک موسیقی سے معمور کر دیتی ہے۔ عہد قدیم کے ایک تناور درخت کا خزان دیدہ پتا جب اپنے صحرا سے جدا ہو چکتا ہے تو وہ پھر کبھی اس پرکیف قدامت کی خاموش وادیوں میں ہوا کے کسی جھونکے سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ تاہم وہ اہل نظر کے لئے فکر و نظم کا بہت کچھ سرمایہ چھوڑ جاتا ہے۔ قدیم محفل تہذیب کی یہ آخری شمع گل ہو گئی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس دورِ آخر کا افسانہ گو جب ہماری آئندہ نسلوں کو اون کے گزرے ہوئے بڑوں کی کہانیاں سنائیگا تو یہ ناممکن ہے کہ "مہاراجہ بہادرؒ" کا نام اوسکی زبان پر نہ آئے۔

محمد عبدالغفار

بہ یادِ شاد

ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت آنجہانی کو اس دار فنا کو خیر باد کہے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے اور جب سے اب تک بہت کچھ اُن کے غیر معمولی اوصاف واخلاق سے متعلق عام اور خاص جلسوں میں کہا گیا۔ ملک کے اخبارات و رسائل نے طرح طرح سے اُن کو سراہا اور جتنا جس سے بن پڑا لکھا۔

میں نے چاہا تھا کہ ممدوح کی سوانح حیات کا وہ جزو پیش کروں جو آپ بیتی ہے۔ جس کا تعلق براہ راست میری ذات سے ہے اور ضمناً اُن تمام فیوض و برکات سے جن سے ایک میں ہی نہیں ہزارہا انسان بلا تفریق ملت و مذہب ممدوح کی ذات بابرکات سے مستفید ہوتے رہے۔ افسوس کہ ابتک یہ قصد پورا نہ ہو سکا۔

ممدوح کی وفات سے ایک ہفتہ قبل مجھے عزت باریابی حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ میں آخر مرتبہ یہ عزت حاصل کر رہا ہوں۔ دوسرے ہی دن سے میں کچھ ایسا بیمار ہوا کہ عرصے تک نشست و برخاست کی قوت بھی باقی نہ رہی۔ نہ جنازے میں شرکت کر سکا نہ کسی ماتمی جلسے میں اور نہ کچھ لکھ سکا۔

اب جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ مختصراً یہ ہے کہ مجھے حیدرآباد آنے کا موقع سب سے پہلے ۱۹۲۶ء میں ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہز ایکسیلنسی آنجہانی صدارت عظمیٰ پر فائز نہ تھے یہاں پہونچکر میرے قیام کو بمشکل چوبیس گھنٹے گزرے تھے کہ ممدوح کو میری آمد کی اطلاع کسی نہ کسی ذریعہ سے ہوگئی چنانچہ مجھے طلب فرماکر باریابی کی عزت سے سرفراز فرمایا گیا۔

میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی امیر کے دربار میں شرکت کی۔ امراکے دربار سے متعلق میری معلومات اُس وقت تک صرف ان افسانوں کی حد تک تھی جو یا تو فی الحقیقت افسانے ہی تھے یا وہ تاریخی واقعات تھے جو اب افسانے بن چکے تھے۔ دربار کی شان اور درباریوں کے آداب نشست و وضع تخاطب کا ایک خاص اثر میں نے محسوس کیا۔ میں نے ان خوابوں کی تعبیر بھی دیکھی جو میں نے شاہان مغلیہ کے درباروں سے متعلق دیکھے تھے۔ اُس اپنے خیال کو مجسم ہوتے ہوئے پایا جو بارہا میری قوت متخیلہ نے امراء سلف کے درباروں کی نسبت میرے دل میں قائم کر رکھا تھا۔

یہ سب کچھ ایک تصویر تھی جو حسین ہونے کے علاوہ میرے لئے اس وقت عجیب بھی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ میں نے اس تصویر میں ایک روح بھی دیکھی ایک زندگی بھی محسوس کی۔ وہ روح وہ زندگی ہزایکسلنسی کی ذات والاصفات تھی۔

ان میں ایک خاص قوت کشش تھی۔ میری پہلی نظر اُن کے چہرے تک پہونچنے کے بعد بمشکل واپس آئی۔ شاید آداب دربار کا پاس تھا کہ میں نے اس خاص کشش اُس ناقابل بیان قوت جذب کا مقابلہ کرتے رہنا ہی مناسب سمجھا جو میری نظر کو واپس ہونے میں مزاحم تھی بھرحال میں برخاست دربار تک حاضر رہا مختلف علوم وفنون اور اسی ضمن میں شعروشاعری کے تذکرے رہے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ کچھ پڑھو۔ میں نے اُس وقت جو کچھ یاد تھا عرض کیا۔ اسپر بہت کچھ میری ہمت افزائی فرمائی گئی اور مجھے وہ حقیقی داد ملی جو شاعر کو اُس کی زندگی میں مشکل کبھی کبھی ملا کرتی ہے۔

حیدرآباد میں اس مرتبہ میرا قیام گیارہ روز رہا۔ دوران قیام میں ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جس دن مہاراجہ بہادر اس حقیر کو یاد نہ فرماتے۔

اس زمانے میں جبکہ عموماً اخلاق کا مفہوم منافقت قرار پاچکا ہے اگر سچا اخلاق اپنے صحیح معنوں میں میسر آجائے تو زندگی کا یہ واقعہ کس قدر عجیب اور اہم واقعات میں شمار کئے

جانے کے قابل ہوگا ۔

یہ کہنا تو مبالغے سے خالی نہ ہوگا کہ میں نے مہاراجہ بہادر کو اپنی زندگی میں سچے اخلاق کی پہلی مثال پایا۔ مگر ان چند گنتی کی ہستیوں کو چھوڑ کر ممدوح کی وہ غیر معمولی ہستی تھی کہ جس کی ہر ادا میں سچے اخلاق کے لطیف ترین پہلو نکلتے تھے۔ اس اخلاق اور اس اخلاق کی فراوانی نے ممدوح میں وہ قوتِ تسخیر پیدا کر دی تھی کہ دربار میں ایک مرتبہ حاضر ہونے کے بعد کسی سے یہ نہ ہوسکتا تھا کہ وہ پھر ایک اور بار شرفِ باریابی کا آرزومند نہ ہو جائے۔

غرض کہ پہلی مرتبہ دورانِ قیام میں میرے لئے حیدرآباد اور حیدرآباد میں جو کچھ تھا وہ شاد اور ایوانِ شاد تھے اور بس۔

میں نے ممدوح کی خدمت میں پہونچکر اپنے درد کی دوا پائی۔ خلوص اور صداقت کے بھوکے کو غذا میسر آئی۔ بالآخر جب میں ممدوح سے رخصت ہوا تو کسی کا یہ شعر ضروری ترمیم کے ساتھ میری زبان پر تھا۔

از در شاد چہ گویم بچہ عنوان رفتم
ہمہ درد آمدہ بودم ہمہ درمان رفتم

دوسری مرتبہ ۱۹۲۲ء میں حیدرآباد آیا۔ اس سال ممدوح صدارت عظمیٰ پر فائز تھے۔ یوں کہنے کو تو زندگی کی ہر ساعت زندگی ہی کہلاتی ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسے لمحات ایسی ساعتیں زندگی میں بہت کم میسر آئی ہیں جن کا شمار اگر میری زندگی میں کیا جائے تو مجھے کوئی عذر نہیں ہوسکتا یہی وہ لمحات تھے جو مہاراجہ بہادر کی خدمت میں گزرے۔ یہی وہ ساعتیں تھیں جنہیں میں اپنی عمر رفتہ کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال وہ زمانہ بھی گزر گیا اور اگرچہ ممدوح نے بہت اصرار فرمایا مگر میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور اس وعدے کے ساتھ کہ وطن سے جلد واپس ہونے کی سعی کرونگا حیدرآباد سے واپس گیا۔

سوء اتفاق سے یہ وعدہ پانچ سال تک پورا نہ ہوسکا اور میں تیسری اور شاید آخر مرتبہ

سنہ ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد پہونچا۔ یہاں پہونچنے پر مہاراجہ بہادر نے میرے لئے جو کچھ کیا۔ جس حد تک میری قدر افزائی فرمائی، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ محتاج اعادہ نہیں کہ میرے لئے کن کن دشواریوں سے مقابلہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ کتنی مخالف قوتوں سے سینہ سپر ہونا پڑا۔ کس قدر طویل زمانے تک بذاتِ خود میری ضروریاتِ زندگی کی کفالت فرماتے رہے۔

ممدوح کی بے حد فیاضانہ بذل و بخشش، شعرا پروری، امیرانہ وضعداری، دردمند نوازی، قدر شناسی، وسعتِ اخلاق، عزم و استقلال، جذباتِ بذل و کرم ان سب کا اگر ایک قابلِ تقلید نمونہ نہ تھی تو پھر کیا تھی۔

یہ سعی مشکور ہوئی یا نامشکور، میں اس کے متعلق صرف اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مہاراجہ آنجہانی سے اس سعی میں ایک اجتہادی غلطی ضرور ہوئی۔ ممدوح نے میری ہمت افزائی کے سلسلے میں صرف اپنے پر قیاس فرمایا۔ صرف اپنی طرف دیکھا۔ میرے قلب میں ایک جلتا ہوا ایک کبھی نہ بجھنے والا چراغ تو دیکھ لیا۔ مگر یہ نہ دیکھا کہ جس محفل میں وہ اس چراغ کو لے جا کر رکھنا چاہتے تھے وہ اب نئی روشنی کے شدید القوۃ جھاڑوں سے منور ہے بلکہ زیادہ موزوں ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مہاراجہ ممدوح کو اس کا خیال ہی نہ رہا کہ اب بزم دکن آفتاب عالمتاب کی ہمہ گیر شعاعوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔ چراغوں کی ناقابل ذکر روشنی کا وقت باقی نہیں رہا۔ رات گزر چکی ہے اور سویرا ہو چکا۔ اب اس چراغ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی کوئی نہ دیکھے گا۔ بہرصورت میری حد تک مشیت الٰہی نے ممدوح کے ارادوں کا ساتھ نہیں دیا۔ اور ان کی سعی کچھ اس طرح مشکور ہوئی کہ مشکور نہیں کہی جا سکتی۔

تہی دستانِ قسمت را چہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

خیر۔ میری داستان سے قطع نظر کیجئے۔ کچھ زیادہ دلچسپ بھی نہیں اب میں مہاراجہ آنجہانی کی چند خصوصیات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

ممدوح کا دربار ایک عام دربار تھا۔ مشکل ہی سے کوئی بدنصیب ایسا ہوگا جس نے اس دربار میں باریاب ہونا چاہا ہو اور اُسے باریابی کی اجازت نہ عطا ہوئی ہو۔ خواص بھی شریک دربار ہوتے تھے اور عوام بھی اس عزت سے محروم نہ رہتے تھے۔ یہ تو خیر۔ مگر اس شرکت دربار کی امتیازی شان یہ تھی کہ یہاں کسی مفلس و بینوا کو کبھی یہ محسوس نہونے پاتا تھا کہ وہ اس دربار میں ایک حاجتمند کی حیثیت سے حاضر ہے۔ یہی وہ دربار تھا جہاں انسان اپنی خودداری کو مجروح کئے بغیر فیض حاصل کرسکتا تھا۔ یہی وہ دربار تھا جہاں سائل کو بسا اوقات زحمت طلب بھی نہ اٹھانا پڑتی تھی یہی وہ دربار تھا جہاں یہ حکم تھا کہ سائل محجوب نہ ہونے پائے اور جہاں یہ دستور تھا کہ سرفرازیاں فرمانے والا خود شرما جائے۔

دوسری امتیازی خصوصیت ممدوح کی رواداری یا بے تعصبی تھی مذہب و ملت کا اختلاف ان کے نزدیک ایک لفظ بے معنی تھا۔ انہیں یوں بھی کسی کی دلشکنی گوارا نہ تھی۔ تعصب مذہبی کا تو کیا ذکر۔ اُن کا تمامتر طرز عمل اس کی ناقابل تردید شہادت تھا کہ اُن کا دامن اس کثافت قلبی سے کبھی آلودہ نہ ہوا۔

تیسری خصوصیت اُن کا جذبہ عجز و انکسار تھا جو دولت زدہ ارباب اقتدار میں شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق خوشگو شاعر تھے مگر انہیں کبھی اپنی خوشگوئی پر اصرار یا دوسروں کے کلام کی خوبیوں سے انکار نہ تھا۔ یہی نہ تھا کہ انہوں نے لفظ فقیر کو اپنے نام کا ایک جزو قرار دے رکھا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ طبعاً جذبات غرور و تکبر سے متنفر تھے۔ وہ درویش دوست ہی نہ تھے درویش صفت بھی تھے۔

چوتھی خصوصیت ان کی علم دوستی اور ادب نوازی تھی جس کی مثال دکن تو دکن ہندوستان بھر میں کہیں ملنا دشوار بلکہ محال تھی کہا جاتا ہے اور بالکل سچ کہا جاتا ہے کہ ان کا دربار اُن کی اس خصوصیت کی بدولت چھوٹے پیمانے پر شہنشاہِ اکبر کا دربار نظر آتا تھا۔ دکن کی سرزمین پر جس اہل کمال نے جب کبھی قدم رکھا اس دربار نے اُسے ضرور نوازا۔ ممدوح نے اُس کی

قدر دانی میں کبھی تامل نہ فرمایا۔ اکثر ارباب علم و فن کی زندگیاں ہی بدل ڈالیں وہ کچھ نہ تھے اور یہاں پہونچکر سب کچھ ہوگئے۔

پانچویں خصوصیت ممدوح کی وضعداری تھی۔ جس کسی سے پہلی مرتبہ جس تپاک سے ملے آخر تک اس میں سر مو تفاوت نہوا۔ وہی انداز ملاقات وہی حسن سلوک۔ مجھے کوئی ایسی مثال یاد نہیں جبکہ ممدوح نے بھول کر بھی اس وضع خاص میں کوئی تبدیلی روا رکھی ہو۔

چھٹی خصوصیت اُن کی وہ قابل تقلید عقیدت تھی جو وہ اعلیحضرت بندگان اقدس و اعلیٰ خسرو دکن سلطان العلوم آصف سابع خلد اللہ ملکہ وادام اللہ حشمتہٗ سے رکھتے تھے۔ وہ ملک و مالک کے بہی خواہ اور دعاگو تھے۔ اُن کی وفاداری ایک امر مسلمہ تھی۔ وہ جذبہ جان نثاری لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ وہ بقول حضرت بندگان عالی متعالی اس بساط کا آخری مہرہ تھے جو گردش زمانہ نے بالآخر اٹھالیا۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

خدا مغفرت فرمائے اور اُن کو اُن احسانات کا عوض دے جو انہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک بنی نوع انسان پر کئے ہیں۔

فانیؔ بدایونی

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر

بن گئی ہے یونہی تعمیرِ حیاتِ روزگار — ایک حالت پر نہیں ہوتا زمانے کو قرار
گو رہی ہے زندگی کا ساز، لیکن ہر نفس — دھن بدل کر چھیڑتا ہے تارِ نغمے روزگار
موجِ ہستی کو ہے پیہم رقصِ نو کی جستجو — کھیل ہے فطرت کا عیدِ غم ہو یا فصلِ بہار

وہ مبارک ہیں جنھوں نے باوجودِ کشمکش
جبر کے اجزاء سے رکھی ہے بنائے اختیار

ہو گئے رخصت جہاں سے گرچہ یمین السلطنت — جس سے لی تھی سونپ دی اس کو حیاتِ مستعار
اور بھی ہے لیکن اک دنیا عظیم و مستقل — صد بہاراں زیرِ دامن، صد گلستاں درکنار
ہے یہ دنیا سیرت و اخلاق کی دنیا یہاں — جاوداں ہوتا ہے نقشِ ہستیِ ناپائیدار
سرمہاراجہ اسی دنیا میں ہیں مصروفِ سیر — زندگی پہنے ہوئے ہے سرمدی پھولوں کے ہار
موت کیا، فطرت کا وہ آئینِ محکم ہے ندیم — توڑ دیتا ہے جو ہر بندِ نقابِ روزگار
جہلِ عامی کے لئے سامانِ بربادی ہے موت — اور عارف کے لئے اک تازہ تر موجِ بہار
جو سکھائے نوعِ انسانی کو جینے کے اصول — نقش ہو جائے دلوں پر جس کی سیرت کا وقار
جاگ اٹھے جس کے سائے میں ضمیرِ کائنات — ٹوٹ جائے جس کی نظروں سے طلسمِ روزگار
جس کی اک ہلکی سی جنبش بھی، باندازِ نسیم — اس خزاں آلودہ گلشن کو عطا کر دے بہار

موت کی تاریک وادی سے گزر سکتا نہیں
یہ وہی انسان ہے اختر جو مر سکتا نہیں

علی اختر۔ اختر

وطن سے دور

مہاراجہ سے ملاقاتیں

گرمائی تعطیلات کا وہ سنہرا زمانہ جب کہ طالب علمانہ زندگی کتابوں کے انبار سے نکل کر کھلی فضاؤں میں سانس لیتی ہے طالب علموں کے دلوں میں ایک لہر سی پیدا کردیتا ہے۔ یہ لہر فرصت کو خوش گوار بنانے کے لئے نئی نئی راہیں تلاش کرتی ہے۔ اب جب کہ میرے دوست احمد خاں صاحب مدیر مجلہ عثمانیہ کے اصرار نے مجھے ایک زمانے کے بعد "گوشۂ گمنامی" سے باہر نکلنے پر مجبور کردیا ہے۔ میرے دل میں ایسے ہی ایک "موسم گرما" کی یاد تازہ ہوگئی ہے میں جس موسم گرما کا ذکر کرنے والا ہوں وہ میرے لئے اپنی یاد میں ایک پائیدار جاذبیت رکھتا ہے۔ یہ جب کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کا ماحول ابھی "توپ کے سانچے" کی پھیلی ہوئی عمارتوں میں اپنی تنگ دامانی کو محسوس کر رہا تھا۔ لیکن میرے لئے یہ زندگی کا بہت ہی خوش گوار زمانہ تھا اور زندگی کے ان خوش گوار لمحوں کو وہی اچھی طرح محسوس کرسکتا ہے جیسے فوقانی تعلیم کے بعد پہلے پہل کالج میں ایک "ذمہ دار طالب علمانہ حیثیت" نصیب ہوتی ہے یا ان خشک مصروفیتوں سے قطع نظر جنھیں امتحان کا اندیشہ بعض وقت دلچسپ اور بعض وقت مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ بہت سے مشاغل ہاتھ آجاتے ہیں جن میں ذرا پہلی مرتبہ اپنے وجود کا احساس ہونے لگتا ہے۔ امتحانوں کی مشق تو پہلے ہی سے تھی، لیکن یہ مشاغل ——

بہرحال جب "لیاقت منزل" کے ایک تاریک کمرہ میں ہم نے سال بھر کا بوجھ سر سے ہٹا دیا تو ہم مدراس بنگلور اور میسور کے تعلیمی سفر کے لئے روانہ ہوئے۔ یہاں "تعلیمی سفر" کی اصطلاح کو واضح کر دینا ضروری ہے۔ طالب علموں کا ہر سفر تعلیمی سفر کہلاتا ہے۔ اگرچہ اس میں تعلیم کا کوئی جزو نہیں ہوتا۔ جامعہ کے برادران قدیم اس اعتراف پر مجھے معاف فرمائیں اور برادران حال سمجھ لیں کہ یہ اعتراف اُن سے متعلق نہیں ہے۔ میرے عزیز دوست میر حسن ابھی زندہ ہیں وہ اس زمانہ میں انجمن اتحاد کے بہ اتفاق آرا صدر تھے یعنی ان کو صدارت حاصل کرنے کیلئے نہ ڈینگیاں بجانے کی ضرورت ہوئی تھی نہ نقارے پیٹنے کی۔ نہ پروفیسر وحید الرحمن صاحب کو پولنگ اسٹیشن کا انتظام کرنا پڑا تھا۔ ان ہی کی قیادت بلکہ نگرانی میں یہ تعلیمی سفر ہوا تھا۔ اُن سے پوچھ لیجئے کہ اس تعلیمی سفر نے ماضی کی ایک خوشگوار یاد کے سوا ہمیں کیا دیا۔ سب سے پہلے ہم مدراس گئے جہاں سخت گرمی میں ہم نے پسینہ بہا کر اور مچھلیوں کی طرح تڑپ کر تین دن گذارے۔ اور جب ہم نے بنگلور کی راہ لی تو اس کے سوا کچھ معلوم نہ تھا کہ مدراس ہندوستان کا ایک مشہور شہر ہے جہاں ایک بار جانے کے بعد دوبارہ جانے کی خواہش نہیں ہوتی جب ہم بنگلور پہنچے تو ہمیں بہت جلد معلوم ہو گیا کہ یہاں حیدرآباد کے کئی ایسے اصحاب موجود ہیں جن کے سامنے ہم ٹوپی پہنے اور کالر درست کئے بغیر نہیں جا سکتے۔ مدراس سے جو چیز ہم نے حاصل کی تھی اسے یہاں گنوا دینا پڑا۔ وہاں ہم "تن کی عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس" گنگنا سکتے تھے۔ لیکن بنگلور میں ہمیں بچہ "مادر وطن کے مہذب سپوت" بن کر رہنا پڑا۔ یہاں حیدرآباد کی جس ہستی سے ملنے کے لئے سب سے پہلے دل میں تمنا پیدا ہوئی وہ آنجہانی سر یمین السلطنۃ تھے۔ مہاراجہ بہادر کی جاذبیت ہر ایک کو اپنی طرف مقناطیسی قوت کے ساتھ کھینچتی تھی۔ وہ اس پرانی تہذیب کے آخری یادگار تھے، جہاں نئی تہذیب اپنے لئے سکون زندگی کی تفسیر ڈھونڈتی تھی۔ وہ دنیا کے تہذیبی دور راستے پر چراغ منزل کی طرح جگمگاتے تھے ان کے چہرہ پر وقار، ان کی آنکھوں میں طمانیت اور اُن کی گفتگو میں مٹھاس تھی۔ ہم اُن سے

اس لئے بھی ملنا چاہتے تھے کہ وہ حیدرآباد کے حکومتی حلقے میں بلند ترین مقام رکھتے تھے۔ اس لئے بھی کہ وہ ہماری جامعہ کے امیر تھے اور اس لئے بھی کہ وہ ایک انفرادی شخصیت نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کی ذات میں ایک ادارہ مضمر تھا۔ ایسا ادارہ جو مشرقی اور مغربی تمدنوں کے دھاروں کو ایک سنگم پر ملاتا ہے۔ ویسے بھی وطن سے دور ارباب وطن میں ایک غیر معمولی کشش پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر مہاراجہ بہادر کی جاذبیت میں ہمارے لئے کیوں اضافہ نہ ہوتا ــــــــ!

پہلے دن میر حسن ام۔ اے۔ محی الدین غازی، مرزا عبدالباسط بیگ بی۔ اے۔ ایچ۔ سی ایس۔ میر عباس علیخاں بی۔ اے۔ ایچ۔ سی ایس اور راقم الحروف ان سے ملنے گئے۔ مہاراجہ بہادر ایک درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے پنسل سے کاغذ پر ایک منظر کی حسن کاری کر رہے تھے۔ ان کے سامنے رنگ اور برش دھرے تھے ـــ شاید بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ مہاراجہ بہادر ایک اچھے حسن کار بھی تھے۔ مجلۂ عثمانیہ چاہے تو ان کے جمالیاتی ذوق کے اس حسین پہلو کو بھی عوام سے روشناس کر سکتا ہے۔ تجسس اور کوشش سے ان کی حسن کاری کے نمونے حاصل ہو سکیں ــــــ مہاراجہ کے قریب چند بچے کھیل رہے تھے وہ فطرت کی ان جیتی جاگتی تصویروں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اور کاغذ پر بے جان لکیروں کے ذریعے ایک منظر میں جان ڈال رہے تھے۔ ہمارے آنے کی خبر پا کر انھوں نے ہمیں وہیں بلالیا۔ تعارف کے بعد ادھر ادھر کی گفتگو ہوئی۔ بار بار وہ ہم سے دریافت کرتے تھے کہ "آپ لوگوں کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ـــ!" ـــ دیر تک گفتگو کے بعد انہوں نے ہماری تمام جماعت کو دوسرے دن چائے پر دعوت دی اور ہم واپس ہوئے۔

دوسرے دن ہم سب سہ پہر کے وقت مہاراجہ بہادر کے ہاں گئے۔ ہریالی کے سبز میدان میں سلیقے سے کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ اس صحبت میں زیادہ تر علمی و ادبی بحثیں ہوتی رہیں۔ اور خصوصاً "شاعری" میں زیادہ وقت صرف ہوا۔ اس سے تو سب ہی واقف ہیں کہ مہاراجہ بہادر، اردو اور فارسی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ محفل میں شعراء اور تنہائی میں اشعار ان کے جلیس رہے

اُن کا کلام اب بھی اُردو داں حلقہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے ماہنامہ سب رس کے اس ایک "اداریہ" میں جس میں مہاراجہ بہادر کو آخری خراج تحسین ادا کیا گیا ہے لکھا تھا کہ ان کی شاعری اگرچہ اپنا کوئی بلند مقام نہیں رکھتی لیکن اس زمانے میں جب کہ زبان کے مسئلہ نے ایک سیاسی اہمیت حاصل کرلی ہے اور ہندی اردو کے جھگڑے نے دوسرے سیاسی مسائل کی طرح اپنا محاذ "فرقہ واریت" کی گندہ پناہ گاہوں میں بنا رکھا ہے ایک ہندو شاعر وادیب کی حیثیت سے ان کی نظم و نثر اپنا وزن رکھتی ہے۔ اردو کی خدمت میں ہندو ارباب قلم نے مسلمانوں کے دوش بدوش حصہ لیا ہے۔ لیکن جب سے اردو کا نام بدلنے کی خواہ مخواہ ضرورت محسوس ہوئی وہ سنسکرت اور عربی اور فارسی کے درمیان ایک "رسہ" بن گئی ہے مہاراجہ آنجہانی اُن چند اصحاب میں سے تھے جن کے ہاتھ "قومیت" کو تباہ کرنے اور "فرقہ واریت" کا سومنات بنانے کے لئے نہیں اُٹھے۔ وہ آخر تک ایک مجاہد کی طرح ادبی تعصبات کے خلاف اپنے اثرات کو کام میں لاتے رہے۔ غرض مہاراجہ کا یہ احسان ہے کہ اُنہوں نے اُردو ہی کو اپنی تصنیف و تالیف کے لئے استعمال کیا۔ خیر مہاراجہ کی زندگی کے اس پہلو پر کوئی دوسرے صاحب روشنی ڈال سکتے ہیں میں تو اس محفل کا تذکرہ کر رہا تھا جہاں ہم مہاراجہ کی زبان سے اُن کے اپنے اور دوسروں کے شعر سُن رہے تھے۔ اُن کو دوسرے شاعروں کے بھی ہزاروں پاکیزہ اشعار یاد تھے اور موقع سے وہ اُنہیں استعمال کرتے تھے۔ ہمارے بعض شاعر دوستوں نے بھی اپنا کلام سُنایا۔ دوسروں کا تو اس وقت خیال نہیں رہا البتہ اتنا یاد ہے کہ میر عزیز الحق شاکر بی۔ اے نے اپنی ایک نظم سنائی تھی۔ اور "جامعہ عثمانیہ کے مشہور کردار" نے اپنے خاص انداز میں اپنا ایک شعر سُنایا تھا۔ یہ شعر آج کل کی "روزمرہ" میں اُن کی شاعری کا "واحد نمائندہ" تھا۔ غرض یہ محفل چائے اور آئسکریم کی طرح میٹھی تھی یہاں ایک دلچسپ "حرکت" کا تذکرہ کردینا ضروری ہے دعوت میں ہم لوگوں کے آگے "سگرٹ" بھی پیش کئے جارہے تھے۔ بہ پاس ادب اکثروں نے انکار کر دیا۔ لیکن میر حسن نے نہایت اطمینان سے سُلگا ہی تو لیا۔ دوسرے دور میں جو

دیکھتا ہوں تو یہ "طلبکار" کے ہاتھ میں سگرٹ تھا یا تو جب ایک کے سگرٹ پیا تھا یا اب صرف ایک ہی سگریٹ پینے سے رہ گیا۔ یہاں میرحسن کی "جرأت رندانہ" سے قطع نظر مہاراجہ کے اس تصور کا خیال آتا ہے جو انہوں نے ہمارے "ادبا انکار" کے متعلق قائم کیا تھا۔ اور دوسرے دور کے متعلق قائم کیا تھا۔ اور دوسرے دور کے متعلق اُن کا اشارہ اس کا ثبوت ہے۔

اس کے بعد تیسرے دن مہاراجہ بہادر کے ہاں ہم "عکس کشی" کی تقریب میں بلوائے گئے۔ سرمرزا اسمٰعیل دیوان میسور کے نوجوان صاحبزادے ہمایوں مرزا بھی موجود تھے۔ ان سے مہاراجہ روانی کے ساتھ فارسی میں گفتگو فرما رہے تھے۔ ہمیں حیرت ہو رہی تھی کہ اس زمانے میں ایک ہندو اس طرح تیزی سے فارسی بول سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مہاراجہ نے سینے میں جہاں مغلیہ تہذیب کے سارے نمایاں نقوش محفوظ کر لئے تھے وہاں ان کی زبان بھی مغلیہ دور کی "آواز بازگشت" معلوم ہو رہی تھی۔ اس خیال سے کہ ہم بے تکلفی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے مہاراجہ نے اب کی دفعہ ہمارے لئے الگ مقام پر بھی کرسیاں ڈلوا دی تھیں۔ ان سے اشارہ پاکر ہم نے پھر اپنی تبسم اور قہقہوں سے معمور ایک دنیا بنالی —— تھوڑی دیر کے بعد سرمرزا اسمٰعیل دیوان میسور مہاراجہ سے ملاقات کے بعد سیدھے ہمارے پاس آ گئے۔ ان سے بھی گفتگو ہوئی۔ سرمرزا سے ہم پہلے بھی مل چکے تھے لیکن ہمارے اکثر ساتھی ان سے پہلی دفعہ مل رہے تھے۔ اس عرصہ میں فوٹوگرافر نے اپنا سامان درست کر لیا اور ہم بنگلور کی "یادگار" کو قائم رکھنے کے لئے آگے بڑھے۔ ہندوستان کی دو سب سے بڑی ریاستوں کے وزیروں کو ایک ساتھ دیکھکر ایک خاص اثر ہو رہا تھا۔ ایک مسلم ریاست کا ہندو وزیر اور ہندو ریاست کا مسلم وزیر۔ یہ تصویر جس کی کاپی مہاراجہ آنجہانی نے اپنے دستخط کے ساتھ ہمیں دی ہے اور جو مجلہ عثمانیہ میں چھپ چکی ہے — دوسروں کے لئے اتنی اہم نہ ہی لیکن ہمارے لئے اثر آفریں ہے۔ اسلئے بھی کہ مہاراجہ سورگ باشی ہو گئے اور اسلئے بھی کہ گردش ایام پیچھے کی طرف نہیں لوٹ سکتی۔

جب کبھی مہاراجہ کا خیال آتا ہے تو میں بنگلور کے اس سفر کو ضرور یاد کرتا ہوں۔   مینکش

نذر مہاراجہ

"یہ نظم سر یمین السلطنت (مرحوم!) کی وفات سے چھ مہینے قبل لکھی گئی تھی، مگر افسوس ہے کہ علم و کمال کے اِس بے غرض محسن کی خدمت میں یہ ناچیز نذر پیش نہ ہوسکی۔

اکنون کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان — بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد!"

وَجد

اے پرستارِ وطن صوفیِ اورنگ نشیں! — غیرتِ ساغرِ جمشید ترا قلبِ حزیں
سینکڑوں سال میں تجھ سا کوئی ہوتا ہے کہیں — قوم کی مملکتِ دل ہے ترے زیرِ نگیں
قلزمِ دل سے جہاں تاب گہر لایا ہوں
نذر اشعار نہیں، لختِ جگر لایا ہوں

تیری صہبائے سخن پی کے میں سرشار ہوا — جذبۂ شعر مرے قلب میں بیدار ہوا
جوہرِ طبع جو پنہاں تھا نمودار ہوا — طوطیِ فکرِ رسا مائلِ گفتار ہوا
مجھ کو جو کچھ ہے سلیقہ سخن آرائی کا
یہ نتیجہ ہے تری حوصلہ افزائی کا

تو مروت کا نمونہ ہے شرافت کا امام — ترے در سے کوئی پلٹا نہیں بے نیلِ مرام
جانِ اخلاص و مروت ہے ترا طرزِ کلام — وہ ترا حسنِ تواضع کہ عدو بھی ہو غلام

سیکڑوں صاحبِ اکلیل و علم دیکھے ہیں
تجھ سے انساں مگر دہر نے کم دیکھے ہیں

فیض پاتا ہے تری بزم سے ہر صاحبِ فن | لطف سے تیرے سرفراز ہیں اربابِ سخن
فخر کرتے ہیں تری ذات پہ ابنائے دکن | قوم کہتی ہے تجھے غازیِ تفریق شکن

کیوں نہ شہرہ ہو ترے خلق و رواداری کا
فیض ہے آصفِ سابع (خلد اللہ ملکہ) کی وفاداری کا

فلک پیر و جواں ہمہ تن گوش و چشم | خلق کے سود و زیاں سے انہیں شادی ہے نہ غم
تجھ کو دیکھا نہیں مستِ مئے جاہ و حشم | تیرے چہرے سے عیاں ہے صفتِ لطف و کرم

تیری شہرت ہے غریبوں میں کہ لکھ داتا ہے
مینہ برستا ہے لٹانے پہ جب آجاتا ہے

زر بہانے نہ گئے تیرے خزانے کے لئے | ہاتھ ہیں وقف زر و مال لٹانے کے لئے
درد ہے دل میں ترے سارے زمانے کیلئے | کی سخاوت نہ کبھی تو نے دکھانے کے لئے

یہ ترا حسنِ عطا دل کو بہت بھاتا ہے
کرکے سائل پہ کرم آپ ہی شرماتا ہے

علم و دولت کی یہ کثرت یہ فقیرانہ مزاج | اہل بینش تجھے دیتے ہیں عقیدت کا خراج
تجھ سے اسلاف کے باقی ہیں ابھی رسم و رواج | جذبۂ مہر و وفا میں ترا ثانی نہیں آج

دیکھ اب تنگ چمن رنگِ وفاداری ہے
پھول خاموش ہیں، تبلیغ ستم جاری ہے

سکندر علی وجد بی۔ اے

لہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے مہاراجہ مرحوم کے ایک تعزیتی جلسے میں فرمایا تھا "دے کر اترانے والے تو بہت دیکھے ہیں، دیکر شرمانے والا بھی ایک نظر آیا" میں نے اخبار میں یہ جملہ پڑھکر نواب صاحب کو اس نظم کے کچھ بند لکھ بھیجے تھے۔ صاحب موصوف نے جواب میں اس شعر سے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی تھی "میں نے اپنی تقریروں میں یا آپ نے اپنی نظم میں جو کچھ کہا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو تصنع اور تکلف سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ توارد رخیال زاویۂ نگاہ کی یکسانیت کا لازمی نتیجہ ہے"
وجد

”طلبہ وہ تو میری جان ہیں!“

سر مہاراجہ بہادر کی نگاہِ نکتہ بیں میں طلبہ کا مقام

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر آنجہانی سابق امیر جامعہ طلبہ کے بہت بڑے بہی خواہ تھے وہ طلبہ کی علمی وادبی اور معاشرتی سرگرمیوں میں بہ نفس نفیس شرکت فرما کر ان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ طلبہ بھی ان کا تہ دل سے احترام کرتے تھے۔ وہ حد درجہ وسیع النظر واقع ہوئے تھے اور ہندو مسلم طلبہ کو ایک ہی نظر سے دیکھتے تھے بقول مولوی احمد خاں صاحب مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ ”ہندو مسلم روایات کا وہ ایک سنگم تھے“ سر مہاراجہ بہادر کی نگاہ نکتہ بیں میں طلبہ کا کیا مقام تھا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ کے پڑھنے سے ہو سکے گا۔

انجمن ترقی طلبہ، طلبہ حیدرآباد کی علمی و معاشرتی سرگرمیوں کا ایک دلپذیر عکس ہے۔ متذکرہ بالا انجمن کے زیر سرپرستی ایک مہتم بالشان طلبہ کانفرنس کا انعقاد بتاریخ ۲۶ و ۲۷ مہر ۱۳۴۳ف عمل میں آیا تھا جس کا افتتاح ازراہ علم دوستی سر اکبر نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی نے فرمایا تھا۔ طلبہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی اس کانفرنس کے سلسلہ میں ایک مشاعرہ بھی رکھا گیا تھا جس کی صدارت کے لئے سر مہاراجہ بہادر سابق صدر اعظم و امیر جامعہ کا نام تجویز کیا گیا تھا۔

کابینہ انجمن ترقی طلبہ نے راقم الحروف کو اپنا نمایندہ بنا کر بہ حیثیت معتمد مشاعرہ طلبہ کانفرنس مشاعرہ کی صدارت کے حصول کے لئے حضرت شاد مدظلہ کے یہاں بتاریخ ۱۹ / مہر ۱۳۴۷ف بھیجا ایوان شاد پہنچنے کے بعد میں نے اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ مجھے بہت جلد بالائی منزل میں طلب کیا گیا جہاں سر مہاراجہ بہادر تشریف فرما تھے۔ اس وقت راجہ نرسنگ راج بہادر عالی بھی وہاں موجود تھے

مہاراجہ بہادر ایک کرسی پر تشریف فرما تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ راجہ نرسنگ راج بہادر عالی نے میرا تعارف مہاراجہ بہادر سے کرایا۔ میں نے سر مہاراجہ بہادر سے طلبہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے بعد مشاعرہ کی صدارت کی درخواست کی۔ مہاراجہ بہادر کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور ان کی آنکھیں التفات و شفقت کا روح پرور نور برسا رہی تھیں۔

میری درخواست سننے کے بعد فرمانے لگے "طلبہ" وہ تو میری جان ہیں! "فقیر" کو ان کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہونے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ طلبہ مستقبل کے علمبردار ہوتے ہیں۔ ان سے میری بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ بالخصوص جامعہ عثمانیہ کے طلبہ مجھے بہت عزیز ہیں میں ان سے بہت خوش ہوں۔ میں نے ان کے عزم میں ثریا کی رفعت اور عمل میں جوش زندگی کی عظمت دیکھی ہے عثمانی نوجوان حیدرآباد کے خوش آیند مستقبل کے خواب کی دل خوش کن تعبیر ہے۔ میرے "آقا" نے جامعہ عثمانیہ قائم فرما کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ اس بارگاہ علم کے فیض یافتہ اپنی ذہنی اور علمی قوتوں سے اہل ملک کو خاطر خواہ فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ شاہ جمجاہ کی ارادت و عقیدت اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت ہی عثمانیین کی زندگی کا نصب العین ہے۔ میرا ایقان ہے کہ عظیم تر حیدرآباد کا خواب "عثمانیین" ہی کی مجاہدانہ جدوجہد سے مجسم ہوگا۔

بعد ازاں میں نے مشاعرہ کی تاریخ کیلنڈر میں نوٹ کرادی اور طے پایا کہ مشاعرہ بمقام حسینی علم بدیوڑھی راجہ نرسنگ راج بہادر عالی منعقد ہو۔

بتاریخ ۲۷ مہر ۱۳۴۸ف بروز جمعہ بوقت ۹ ساعت شب راجہ نرسنگ راج بہادر عالی کی دیوڑھی میں اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ منعقد ہوا۔ سر مہاراجہ بہادر حضرت شاد مدظلہ نے بنفس نفیس شرکت فرمائی۔ مشاعرہ ہال کئی سو سامعین سے پُر تھا۔ ابتدا میں راقم الحروف نے "شعر و شاعری کی اہمیت اور افادیت" پر تقریر کی۔ بعد ازاں مشاعرہ کا آغاز کیا گیا۔ حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے چوٹی کے شعرا نے اپنا بلند پایہ کلام سنا کر خراج تحسین حاصل کیا۔ ڈھائی گھنٹے کی دلچسپ

صحبت کے بعد مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

راجہ نرسنگ راج بہادر عالی نے مشاعرہ کے بعد سر مہاراجہ بہادر اور مخصوص اصحاب کے لئے چار نوشی کا انتظام کیا تھا۔ سر مہاراجہ بہادر کے ساتھ چار نوشی میں راقم الحروف مسٹر محی الدین غازی صدر استقبالیہ طلبہ کانفرنس اور ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم نے مہاراجہ بہادر کی خدمت اقدس میں اسی محفل مشاعرہ میں اقبالؒ سے متعلق اپنا ایک مطبوعہ مرثیہ پیش کیا تھا۔ دوران چار نوشی میں سر مہاراجہ بہادر مشرق کے غیر فانی مفکر شاعر علامہ اقبالؒ کے الہامی کلام کے جمالیاتی، انقلابی اور قومی پہلوؤں پر اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرما رہے۔ فرماتے تھے کہ ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے اس عظیم المرتبت شاعر کے سرمدی نغموں سے دنیا کی فضائیں ابد الآباد تک گونجتی رہیں گی اور آنے والی نسلیں اس عدیم النظیر فلسفی شاعر کے لاہوتی نغموں میں اپنے لئے راہ عمل تلاش کریں گی۔ "خودی" اقبال کا محبوب ترین موضوع ہے انھوں نے نہایت موثر اور حکیمانہ انداز میں خودی کی تعلیم دی ہے۔ مشرق کی جاں بہ لب اقوام کی کائنات میں بقا کے لئے وہ "خودی" کا علاج تجویز کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

چار نوشی کے بعد مہاراجہ بہادر نے خود اپنے دست مبارک سے پان کی گلوریاں لگا کر ہمیں عنایت فرمائیں اور ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم کو سگریٹ عطا کرنے کے بعد سگریٹ کیس میری اور مسٹر محی الدین غازی کی طرف بڑھایا۔ ہم نے ادباً معافی چاہی ـــــ رخصت ہوتے وقت سر مہاراجہ نے ہم سب سے نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور مجھے مشاعرہ کی غیر معمولی کامیابی پر مبارک باد دی۔

گو "حاتم دکن" اب ہم میں موجود نہیں لیکن ان کی یاد ابنائے وطن کو ہمیشہ تڑپاتی رہے گی۔ ہمارے قلوب میں ان کا مزار ہے۔ دنیا ان کا محض اس لئے احترام نہیں کرتی تھی کہ وہ حکومت کے

ایک رفیع المرتبت عہدہ پر فائز رہ چکے تھے بلکہ دنیا خلوص دل سے ان کا اس لئے احترام کرتی تھی کہ محتاجوں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے حق میں وہ ایک فرشتۂ رحمت تھے۔ کوئی حاجتمند ان کی بارگاہ سے مایوس نہیں لوٹتا تھا۔ یہ مصیبت زدہ ایوان شاد سے اپنے دامن مراد کو گلہائے مقصد سے بھر کر شاد شاد جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ "دوسرے دے کر اتراتے ہیں اور وہ دے کر شرماتے تھے"۔

سر مہاراجہ بہادر کی وفات حسرت آیات کی خبر سنکر حرماں نصیب بیواؤں کی روح لرزنے لگی ——— بے نواؤں کی امیدوں کی لہلہاتی کھیتی پر حسرت ویاس کی بجلی گری ——— اور یتیموں پر کوہ الم ٹوٹ پڑا جس سے ان کی آرزوں اور ارمانوں پر پانی پھر گیا۔

حیدرآباد کی مردم خیز سرزمین سے عظیم المرتبت عالم پیدا ہوں گے، فاضل پیدا ہوں گے قائد پیدا ہوں گے لیکن پھر کوئی سر کشن پرشاد شاد ہی پیدا ہوگا کیونکہ وہ ایک دیدہ ور تھے اور بقول اقبال ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔

مہاراجہ بہادر کا یہ حیات بخش جملہ ——— "طلبہ وہ تو میری جان ہیں"! مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔

جب کبھی میرا گذر ایوان شاد کی جانب ہوتا ہے تو مجھے اپنی ملاقات کا وہ منظر بے اختیار یاد آجاتا ہے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہاراجہ بہادر مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں ——— "طلبہ وہ تو میری جان ہیں! ......"

جب کبھی سر مہاراجہ بہادر کی تصویر میری نظر سے گذرتی ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبہ کا یہ عظیم ہمدرد تصویر میں سے کہہ رہا ہے ——— "طلبہ وہ تو میری جان ہیں! ......"

جب کبھی میں کسی سے سر مہاراجہ بہادر کا نام سنتا ہوں تو وہ ملاقات کا منظر ایک فلم کے پردے کی طرح میری نظروں کے سامنے سے گذر جاتا ہے اور میں مہاراجہ کو یہ کہتا ہوا پاتا ہوں "طلبہ وہ تو میری جان ہیں! ....."

محمد علی نیر۔ بی۔ اے (ابتدائی)

لے جز و تقریر نواب بہادر یار جنگ بہادر

روحِ شاد

یہ کونسا شرارۂ نو آسماں میں ہے / جس کے جگر کی آگ حریم جہاں میں ہے
کیا روحِ شاد ہے جو فلک پر چلی گئی؟ / کیا جانِ پاک ہے جو فضاؤں کو دی گئی؟
اتنا فروغ، اتنی چمک، اتنا اعتبار / جس کو ملا ہے دل میں سمانے کا اختیار
دلداریٔ حیات کا یہ احتشام ہے / یہ نیکیوں کی زیست کا عالی مقام ہے!
وہ یادگارِ بزمِ محبت، وہ دلفگار / وہ دستگیرِ علم و شرافت وہ جاں نثار
تعظیم اور نجابتِ ہستی کا راز داں / تھی جس کی زیست، حلم و تواضع کا امتحاں
فرزندِ ارضِ پاکِ دکن، مردِ کارزار / تیشہ زنِ صنم کدۂ کبر و امتیاز
وہ کامگارِ دہر، وہ دلدارِ بیکسی / تھی جس کی بزم آئینۂ صلح و آشتی
دل تھامتی تھی جس کی امارت غریب کا / ملتا تھا جس کی شمع سے نیکی کو راستا
آئینہ دارِ طنطنۂ ماضیٔ دکن / تصویرِ خوش نگاہی و خوش ذوقیٔ وطن
بے چین جس کے ہاتھ میں تھیں سرفرازیاں / بیتاب جس کی بزم میں تھیں دلنوازیاں
خالی رہے گی اس کی جگہ دہر میں مدام / ذی اختیار کو نہ ملے گا یہ فیضِ عام
کہتی تھی روحِ شاد کہ ہم قدرداں رہیں / اہلِ وطن کے ساتھ رہیں ہم جہاں رہیں

آتا ہے کون تھامنے ہر دلفگار کو
کوئی پکارے آج کسی غمگسار کو

عبدالقیوم خان باقی۔ ام۔ اے۔ لکچرار اردو

مہاراجہ آنجہانی کی سیرت

"اس مضمون پر قاضی محمد حسین صاحب نائب معین ناظم جامعہ نے انعام اول عطا فرمایا ہے"

"دنیا میری قدر بعد کرے گی۔ دنیا کہنہ مردہ پسند ہے"[1] یہ تھے وہ سچے جذبات جو ایک دفعہ بے ساختہ مہاراجہ کے قلم سے ٹپک پڑے ــــ کیسی صداقت ہے اس قول میں ؟ کس قدر جادو کا اثر ہے اس مختصر سے جملہ میں ؟ مہاراجہ کی بلند پایہ شخصیت اور اُن کے کردار کی عظمت کا ہمیں اُس وقت احساس ہوا جبکہ وہ ہم میں نہیں رہے۔ لیکن اُن کے مضبوط کردار کی ہمارے دلوں پر اب بھی ہیبت طاری ہے اور اُن کی سخاوت، ظرافت، مروت، خوش اخلاقی اور وضعداری کے نقوش ہمارے دلوں پر اب بھی مرتسم ہیں۔

مہاراجہ بہادر ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء م ۱۸ شعبان ۱۲۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے نانا مہاراجہ نریندر بہادر نے مہاراجہ کی تعلیم و تربیت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا اُردو، فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت وغیرہ کی تعلیم خاص خاص اُستادوں کے ذریعہ سے دلائی گئی۔ اُردو فارسی کے لئے میر لطف علی صاحب اُن کے انتقال پر میر پرورش علی صاحب اور بعد میں مرزا علی بابا شیرازی مقرر کئے گئے۔ عربی کی تعلیم مولوی سید خلیل ہراتی کے ذریعہ سے دلائی گئی۔ نرسہوان چاری بنگلوری انگریزی درس دیا کرتے تھے۔ درگا پرشاد زناردار قنوجی کو خاص سنسکرت کی تعلیم کے ساتھ آبائی مذہبی تعلیم کے لئے مقرر کیا گیا۔ برجلال تمکین خطاطی کی مشق کرواتے تھے ــــ تیر اندازی کی تعلیم میر عظمت علی صاحب کے سپرد تھی اور بنوٹ پہلے تو مراد شاہ مرحوم سکھاتے رہے اُن کے انتقال پر محمد شہاب الدین۔[2]

---

[1] مکتوب مہاراجہ آنجہانی موسومہ کیپٹن امام الدین صاحب۔ اے۔ ڈی۔ سی (مہاراجہ) [2] یہ تمام تفصیل خود مہاراجہ کی ایک تصنیف "جذبات شاد" میں موجود ہے۔

اخلاقی تربیت کے لئے حضرت غفران مکان محبوب دکن کی ذات ستودہ صفات اور خود مہاراجہ نریندر بہادر کی شخصیت کے دو نمونے مہاراجہ کے پیش نظر تھے۔ اعلیحضرت مرحوم آپ کو نصیحت فرماتے تھے کہ

"سادگی بڑی عمدہ چیز ہے . . . . اپنی عادت اور وضعداری کو ہرگز ہرگز نہ چھوڑنا . . . . وقت بڑی نعمت ہے۔ یا تو انسان اپنے وقت کو عبادت میں صرف کرے کہ مراتب روحانی کا اعلیٰ درجہ ہے ورنہ مخلوقِ خدا کی مخلصانہ خدمت گذاری میں یا تالیف و تصنیف اور مطالعہ کتب اور تحصیل فنون میں[1]۔"

مہاراجہ نریندر بہادر کی پند و نصائح یہ تھے کہ "جو انسان اپنے سے عجز و انکسار پیش آئے اور اپنے آپ کو مجبور ظاہر کرے اگر وہ دشمن بھی ہے تو اُس سے نہایت خلق سے ساتھ پیش آنا اور خلوص سے اُس سے ملنا شیوۂ انسانیت ہے[2]"

مہاراجہ کی زندگی کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہی وہ گرانمایہ نصائح تھے جن کو مہاراجہ نے اپنے لئے مشعل راہ بنایا یہی وہ تربیت تھی جس کی بنا پر آپ کی حیات کی تعمیر ہوئی اور آپ کے چند مخصوص اُصول و ضابطے قائم ہوئے جو دمِ تک اٹل اور مستقل رہے۔

مہاراجہ کے مضبوط کردار اور قابل تقلید سیرت کو سمجھنے کے لئے بہتر ہوگا اگر مہاراجہ کی روزمرہ زندگی کا ایک مختصر ساخاکہ پیش کیا جائے۔

صبح میں بالعموم ۴½ بجے بیدار ہوتے۔ حوائج سے فارغ ہوکر ناشتہ کرتے طلوع آفتاب کے ساتھ ہی درباری لباس میں مغلیہ دربار کے امراء کی شان کے ساتھ باہر تشریف لاتے اور جھروکہ میں تشریف فرما ہوتے۔ اور گارڈ کی سلامی لیتے — آپ کے صبح جلد اُٹھنے کی دو تین وجوہات تھیں — ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ موسم کے لحاظ سے ایسے وقت اُٹھ جاتے تھے کہ غسل اور ناشتہ وغیرہ کرکے گارڈ کی سلامی لینے کے لئے طلوع آفتاب کے وقت تک باہر پہنچ سکیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ آپ اُن لوگوں کو ملاقات کا موقع دینا چاہتے تھے جو نماز پڑھتے ہی مسجد سے نکل کر آپ سے ملنا چاہیں چونکہ فقراء وغیرہ عام طور پر ایسے ہی وقت ملنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ

[1] "نورخشم" [2]

ہندوؤں کی عبادت کا یہ بھی ایک جزو ہے کہ وہ سورج نکلتے وقت عبادت سے فارغ ہو کر کسی بڑے راجہ مہاراجہ کا درشن کریں۔ آپ کے صبح اُٹھنے کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ آپ علی الصبح غسل کرنے کے عادی تھے۔ نیز آپ کے لکھنے کا بھی یہی وقت تھا کیونکہ دن میں یا رات میں اور کسی وقت آپ کو لکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

باہر تشریف لانے کے بعد دوپہر کے کھانے کے وقت تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں صرف دس بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا دس بجے باب حکومت تشریف لے جاتے تھے لیکن صدارت عظمیٰ سے سبکدوشی کے بعد اگر اتفاقی طور پر ہوا خوری کے لئے جاکر دوپہر کے کھانے کے وقت واپس آجاتے۔

لنچ کے بعد مطالعہ کرتے ہوئے قیلولہ فرماتے۔ چار ساڑھے چار بجے بیدار ہو کر پانچ بجے باہر تشریف لے جاتے پھر شام کی سلامی لے کر مغرب تک باہر رہتے اور اس اثنا میں بھی ملاقاتیوں اور حاجتمندوں کا سلسلہ جاری رہتا۔

مغرب کے بعد سے ڈنر کے وقت تک بالکل تنہائی میں گزارتے اور کسی شخص کو حتیٰ کہ خدمتگار کو بھی اس وقت اندر آنے اور بات کرنے کی اجازت نہ تھی کہا جاتا ہے کہ یہی وقت آپ کی عبادت خاص اور ذکر خدا کا ہوا کرتا تھا[1] ۸ بجے کھانے سے فارغ ہو کر شبستان تشریف لے جاتے

خدمت خلق | اس نظام العمل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے وقت کا بڑا حصہ خدمت خلق کے لئے وقف تھا۔ بعض اوقات وقتاً فوقتاً آپ جو دعائیں مانگا کرتے تھے اُس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ۱۹۲۲ء کے اختتام اور نئے سال کی ابتدا پر آپ یوں دعا فرماتے ہیں کہ

"الٰہی یہ سال نوانسان، چرند پرند حیوان بلکہ گھانس کی پتی پتی کے لئے مبارک کر۔ . . . . .
الٰہی امیر، غریب، بادشاہ، گدا امن و راحت سے بسر کریں۔ ہر جگہ شانتی اور اطمینان کا پہرہ ہو"

---

[1] آخر عمر میں چونکہ بعض بیگمات اور بچوں کے انتقال کی وجہ سے طبیعت کچھ ملول سی رہتی اس لئے تقریباً روزانہ دن [illegible] کی خاطر ہوا [illegible] البتہ [illegible] جانے تھے [illegible] لیکن شوقیہ ہونے کے بجائے مجبوراً ہوتا تھا اور بے وقت سونے کے عادی تھے اور قبل از وقت اس سے وحشت محسوس فرماتے تھے۔ [illegible]

جب ہردوار تشریف لے گئے تو گنگا میں اشنان کرنے کے آپ اسی طرح دست بدعا ہوئے

"مجھ میں اے پربھو وہ شانتی دے جیسا کہ اس دریا کو تو نے عطا فرمائی ہے کہ بہتے۔ بھلے پاپی گنشٹ۔ برہمن، چھتری، ویش، شودر سب کو ایک سمجھتی ہے ایک دیکھتی ہے اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتی ہے ویسا ہی میرا من بھی ہو جائے۔"

"اے داتا جس طرح اس کو تو نے فیض پہنچانے کے لئے پیدا کیا ہے مجھ جیسے ناقص غریب مخلوق سے تو اپنی مخلوق کی اطاعت لے اور مجھے خدمت گزاری کی عزت دے۔ میں جب تک زندہ رہوں عبادت اور مخلوق کی اطاعت میں فرق نہ سمجھ کر ہر وقت ہر دم اس طرح تیری عبادت کروں کہ اپنی ہستی کو تیری ہستی کے نذر کر دوں۔ مجھ میں کوہ ہمالیہ کی طرح استقلال دے تیری بلاؤں پر صابر رہ کر تیری نعمتوں کا شکر گزار رہوں جس طرح دریا کا پانی خس و خاشاک کو بہا دیتا ہے ویسے ہی میرے دل سے کدورت بغض، حسد، کینہ، رشک، تعصب، نخوت اور غرور کے خس و خاشاک کو اپنے دریائے کرم کی موج سے بہا دے"۔

ایک اور جگہ اپنے درد بھرے دل کے حقیقی جذبات کی اس طرح ترجمانی فرماتے ہیں۔[۱]

"آہ! دنیا امن و صلح کے لئے پیدا کی گئی تھی تاکہ انسان اخلاقی اور مادی پرورشوں اور سچوزوں کو چھوڑ کر اپنی فطرت کے عمیق اسرار کو سمجھے اور جو قوتیں اس کے گرد و پیش عمل کر رہی ہیں ان کی حقیقت سے آگاہ ہو کر اُن پر حکمرانی کرے۔"

مہاراجہ انسانیت کے متعلق ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین اور ایک مقصد اپنے سامنے رکھتے تھے۔ مہاراجہ کی دلی خواہش اور آرزو تھی کہ انسانیت کو ایک بلند مقام پر دیکھیں ایک ایسی منزل پر پائیں جہاں امیر، غریب، فقیر اور شاہ کا فرق نہ ہو صرف امن و شانتی راحت و سکون اور اطمینان و آرام کا دور دورہ ہو، مہاراجہ کی ساری زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانیت کے متعلق دراصل یہی مقصود اور مطمح نظر تھا جس کی بنا پر اُن کے مستحکم ارادہ کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔ مہاراجہ کی سیرت گویا اس پاک اور مقدس نصب العین کی تکمیل کے لئے ایک مستقل اور مسلسل

[۱] "نذر شاد نگر" [۲] "پریم بچن"

حد جدید تھی۔ مہاراجہ کا زاویہ نگاہ نہایت وسیع تھا وہ مذہب، ملت، قوم، وطن اور نسل وغیرہ کے امتیازات اور تعریفوں سے علیحدہ اور بے نیاز ہو کر انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اُن کے سارے عمل کی بنیاد اسی پر تھی کہ ممکنہ حد تک تمام انسانی برادری کا مفاد پیش نظر رہے نہ کہ کسی خاص طبقہ، یا گروہ یا جماعت کا۔

مذہب اور تصوف ہندو مسلم اتحاد کے آپ دل سے خواہاں تھے۔ دھول پیٹھ کے ناخوشگوار واقعہ سے آپ کو سخت صدمہ پہنچا۔ اکبر کی طرح ملک کی ترقی کو ہندو مسلم اتحاد پر منحصر خیال کرتے تھے۔ تعصب کو آپ ملکوں اور قوموں کے زوال اور تباہیوں کی بنیاد تصور فرماتے تھے۔ رواداری آپ کا شیوہ اور طغرائے سیاست تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ مذہب کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے۔ اور خیال تھا کہ " مذہبی پابندی چھوڑنے سے انسان شتر بے مہار ہو کر گو اپنے کو آزاد سمجھے پر اصل میں ایسی آزادی کو وہ ایمان کو اڑا دینے والی بارود ہے۔[۱]

مہاراجہ نے کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ہندو ہیں۔ ہر شخص کو اپنے اپنے مذہب کی پابندی پر بہت زور دیتے تھے۔ عالیجناب نواب بہادر یار جنگ بہادر آپ پاس گھنٹوں بیٹھا کرتے اور اکثر مغرب کی نماز دیہیں پڑھتے تھے۔ لیکن نواب صاحب فرماتے ہیں کہ نواب صاحب سے زیادہ مہاراجہ بہادر کو اُن کی نماز کی فکر رہتی تھی اور نماز کا وقت ہوتے ہی آپ آدمی سے کہدیتے " خانصاحب کے لئے جانماز بچھاؤ "۔

کیپٹن امام الدین صاحب۔ (اے۔ ڈی۔ سی۔ مہاراجہ) نے ایک معروضہ گزرانا تھا کہ جمعہ کے روز دو گھنٹہ کی چھٹی دی جائے۔ اُس پر آپ نے تجویز فرمائی " ضرور جائیے۔ یہ حکم الٰہی ہے جو مقدم ہے ہر ایک حکم پر " — اس کے بعد کیپٹن صاحب کہتے ہیں کہ اُن کی مذہبی عبادات کا مہاراجہ نے اس قدر لحاظ رکھا کہ بعض اوقات حسین ساگر کے کٹہ پر بھی نماز کا وقت ہوتا تو آپ موٹر روک کر ادائی فرض کی طرف توجہ دلاتے۔ اگر کہیں راستہ میں نماز کا وقت ہو جاتا تو فوراً آپ دیوڑھی تشریف لاتے اور فرماتے کہ آپ نماز سے فارغ ہو جائیں پھر راہ ہو لیں۔

---

[۱] " معراج ترقی "

بزرگوں سے بلا قید ملت و مذہب عقیدت تھی۔ ہندو، مسلمان، سکھ ہر ایک کے بزرگوں کی بڑی مدح فرماتے تھے۔ آنحضرتؐ کی شان میں فرماتے ہیں۔

روپ ہے تیرا رتی رتی۔ نور ہے تیرا تی پتی مہر و مہ کو تجھ سے رونق، نور بنا سیاروں کا

گرو گوبند سنگھ جی مہاراج کی بڑی عقیدتمندی اور خلوص سے جابجا تعریف کی ہے۔ مہاراجہ کرشن سے جو عقیدت تھی اُس کا تو اظہار ہی بیکار ہے "جلوۂ کرشن" کی مشہور اور زبان اُردو کی ایک بلند پایہ مثنوی، سری کرشن جی مہاراج کی ہی توصیف میں لکھی گئی ہے۔

آپ کی فقیر دوستی تو ضرب المثل ہے۔ آپ کا خود بیان ہے کہ "کمسنی سے مجھے بزرگوں کے ساتھ بلا قید ملت و مذہب خاص قسم کی عقیدت ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ میری گھٹی میں عقیدت کا پٹ پڑا ہے۔[1] لوگوں نے آپ پر تعصبانہ اعتراض کیا تھا کہ مسلمان بزرگوں سے آپ کو مصنوعی عقیدت ہے اور نمائش کی خاطر آپ نے یہ بہروپ اختیار کرلیا ہے۔ اُس کا آپ جواب دیتے ہیں ـــــ

"عقیدت اور محبت کسی کے ساتھ بناوٹی اور مصنوعی نہیں ہوتی پہلے ہی سے فطرت میں یہ چیزیں خدا کی جانب سے ودیعت ہوتی ہیں۔ میری عقیدت برگزیدگان رب العزت اور بزرگان دین محمدی کے ساتھ سن بلوغ کے پہلے ہی سے تھی . . . . . . اس وقت مجھے کونسی ظل الہامی کا تاج سر پر رکھنا تھا اور کونسی امارت کی آرائش و نمایش منظور تھی اور کس ملک گیری کے نظم و نسق کی طرف دل مائل تھا . . . . . .

یہ اعتراض تعصبانہ کہ بزرگان اسلام سے کیوں عقیدت ہے یا یہ عقیدہ نمائش اور خود غرضی کے ساتھ ہے ایسا سمجھنے والوں سے خدا سمجھے ـــــ دوستی، محبت اور عشق کے لئے قیود اور مذہب کی پابندی اور تفریق ملت بوالعجبیست!"

مہاراجہ کے مذہب کے متعلق مختلف قسم کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ یہاں موقع نہیں کہ اُن سب کا جواب دیا جائے یا مذہب پر تفصیلی طور سے روشنی ڈالی جائے۔ یہ بجائے خود

---

[1] "سرنامگو"

ایک علٰحدہ عنوان بن سکتا ہے۔ ہمیں صرف اس قدر بتانا مقصود ہے کہ باوجود بہت سی غلط فہمیوں کے مہاراجہ دراصل پکے موحد اور صوفی تھے۔ لوگ چاہیں کچھ ہی کہیں لیکن مہاراجہ نے تحریر، تقریر، گفتگو ہر طریقہ سے یہ ثابت کر دیا اور اس کا علی الاعلان اقرار کیا کہ وہ موحد اور صوفی تھے۔ تصوف میں آپ نے بہت کچھ تحقیق بھی کی تھی اور بڑے صوفیوں کے حالات اور خیالات سے واقف ہونے کی خاطر اس قسم کے ادب کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ آپ کا تصوف بڑی حد تک کبیرداس کے تصوف کا عکس تھا — ہم مہاراجہ کی بعض تحریروں اور اشعار کو نقل کرتے ہیں جس سے ناظرین خود اندازہ لگالیں گے کہ واقعی مہاراجہ کا مذہب کیا تھا اور وہ کن معنوں میں صوفی تھے۔

نقرار کے مذہب کے متعلق لکھتے ہیں "نقرار وہ مذہب نہیں رکھتے جو آپس میں بیر رکھنا سکھلاتا ہو یا جس کو نادان لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مذہب وہی ہے جو دنیا میں فرقہ بندی کے تعصبات پیدا کرے بلکہ نقرار کی ذات جلوۂ الٰہی ہوتی ہے خدا کی ذات کسی مذہب کسی قوم اور کسی خاص فرقہ کی طرفدار نہیں ہے اور نہ خدا کسی قوم اور مذہب کا ہے"۔

مہاراجہ کو لوگ طرح طرح کے ناموں سے پکارتے تھے کوئی کبیر مستر اکہتا کوئی نانکی، کوئی ملحد و مشرک، کوئی بھرشٹ، کوئی امین شاہ کوئی نظامی کوئی صابری کوئی چشتی، غرض جس کے جو جی میں آتا اسی نام سے پکارتا۔ لیکن اس کا سبب کس اچھے طریقہ سے آپ کے اس شعر سے واضح ہوتا ہے کہ

میں آئینہ ہوں نظر مجھ سے جو ملاتا ہے وہ جیسا آپ ہے ویسا ہی مجھ کو پاتا ہے

آپ کے تصوف کی حسب ذیل اشعار سے مزید وضاحت ہوتی ہے۔

مجھے تو کام ہے اُس سے جہاں رہے نہ رہے زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے
نہ ہندو اور نہ مسلم نہ مومن و کافر ہیں ایک صانع قدرت کی صورتیں ظاہر

اس تصوف کی دھن میں کبھی تو آپ بحر بے خودی میں ایسے غرق ہو جاتے ہیں بے ساختہ کہہ اُٹھتے ہیں۔

بے خود ہوں خودی مٹا رہا ہوں بے حال ہوں حال لا رہا ہوں

اور کبھی اقبال[1] کے ہم نوا بن کر اس طرح خودی کے گن گاتے ہیں

دی پیر مغاں نے مجھے اے شاد خبر ہے جملہ یہ کائنات تیرے اندر
تجھ میں ہے خدا اور خدائی میں تو ہے ذرہ بھی نہیں ہے شاد تجھ سے باہر

توحید کی مئے سے اس طرح سرشار ہیں۔

ساقی مئے وحدت دے مجھے ایک سبو گلزار ہو تو ہو، میں ہوں اور سب جو
بر بط ہو ہو کہے تو سینا حق حق مست مئے توحید کہے تو، تو، تو
اسلام سے اور کفر سے کیا کام اُسے اے شاد جو رکھتا ہے نظر وحدت پر

یہ کفر و دین کے ہیں سارے جھگڑے تجھے اے شاد ان سے کام کیا ہے مٹا کے زنگ دوئی کو دل سے خدا خدا کر خدا خدا کر

خیام اور حافظ کی طرح شرابِ معرفت کے اشتیاق میں ساقی سے یوں گویا ہوتے ہیں۔

تو اپنا کرم نہ چھوڑ ساقی تو شاد سے منہ نہ موڑ ساقی
جام مئے معرفت دئے جا میرے لئے خم تک جیئے جا
تو پی کہ نہ پی مجھے پلا دے محفل میں تو اپنی مجھ کو جا دے

سقراط کے تمام فلسفہ کی بنیاد ہی یہ تھی کہ "اے انسان۔ اپنے کو پہچان[2]"۔ مہاراجہ نے کس صوفیانہ اور عارفانہ رنگ میں اپنی حقیقت کو پیش کیا ہے اُس کا اظہار ان اشعار سے ہوتا ہے۔

اک آوازِ شکستِ دل ہوں نغمہ سازِ شکستِ دل ہوں
باغ میں گل ہوں گل میں بو ہوں خندۂ جام و جوش سبو ہوں
نقشِ طلسم جذب وفا ہوں اصل بقا ہوں شکل فنا ہوں
سوز کہیں ہوں ساز کہیں ہوں راز کہیں ہمراز کہیں ہوں
گیتی کی آبادی میں ہوں ہستی کی آزادی میں ہوں۔

---

[2] MAN KNOW THYSELF پریم درپن

ہستی میری شانِ خدا ہے   روح مری فرمان خدا ہے
میں ہوں شہودِ سرِ حقیقت   رہبرِ و مبدائے طریقت

غرض مہاراجہ کے مذہب کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک آزاد منش اور موحدانہ مسلک کے حامی تھے۔ آپ کا مشرب صلح کل تھا۔ خدمتِ خلق اور عبادت میں آپکے نزدیک کوئی فرق نہ تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار آپ کے حسب ذیل اشعار سے ہوتا ہے اور وہی دراصل آپ کے مذہب کا نچوڑ ہیں۔

مرا دھرم کہو ایماں کہو ہے ایک توحید   ہے صلح کل مرا مشرب بحق رب مجید
سخاوت اور شجاعت عدالت اور کرم   یہی ہیں میرے فرائض یہی ہیں میرے دہرم
شاد کا مذہب شاد ہی جانے   آزادی آزاد ہی جانے

شاہ پرستی | مہاراجہ کے مذہب میں اور شاہ پرستی و وفاداری میں ایک قریبی اور گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ جس طرح مذہب کے معاملہ میں آپ آزاد اور جس شدت کے ساتھ آپ وحدت پرست تھے اسی شدت کے ساتھ شاہ پرست اور ملک و مالک کی خدمت گذاری اور بادشاہ کی محبت میں گرفتار تھے۔ آپ کا مسلک ہمیشہ مالک کی خوشنودی اور ملک کی خدمتگذاری تھا۔

بادشاہ کی محبت کا آپ میں ایک والہانہ اور فدایانہ جذبہ تھا جس کا آپ کی روزمرہ زندگی میں ہمیشہ اظہار ہوتا رہتا تھا۔

"مشتے از خروارے" چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔

جب کبھی اعلیحضرت کی سالگرہ یا خانوادہ آصفی کی کوئی تہنیتی تقریب ہوتی تو اس ضعیف عمری میں بھی مہاراجہ شوخ اور رنگین اور اعلیٰ قسم کے قیمتی کپڑے زیب تن فرماتے۔ اور دوسرے اگر ایسا نہ کرتے تو آپ کو سخت حیرت اور تعجب ہوتا۔

انتقال کے کچھ عرصہ قبل سے جب آپ روزانہ سینماد دیکھ کر رات میں واپس ہوتے تو راستہ میں ایک ضعیفہ ملتی جو آپ کو دعا دیتی۔ لیکن آپ فرماتے کہ" اے ضعیفہ تو کافی بوڑھی ہوچکی ہے۔

تیری پرخلوص دعامیں اثر ہے۔ اس لئے تو میرے مالک کے حق میں دعا کر کیونکہ اُس کے زیر سایہ مجھ جیسے ہزاروں کی پرورش ہوئی ہے۔ مجھ کو دعا دینے سے کیا حاصل" تب وہ ضعیفہ دونوں ہاتھ بلند کرکے اعلیٰحضرت بندگانعالی کی ترقی عمر و اقبال کے لئے دعا مانگتی۔ اور آپ اُس کو انعام دے کر دیوڑھی تشریف لے جاتے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک عادت بن گئی اور روزانہ واپسی میں جب تک بڑھیا کے پاس موٹر رکوا کر حضور اقدس واعلیٰ کے لئے دعا نہ کرواتے آپ دیوڑھی تشریف نہیں لیجاتے۔

پنجاب کے سفر میں وہاں کے کھتریوں نے آپ کو ایک عصرانہ دیا تھا۔ اُس وقت آپ نے جو تقریر فرمائی اُس کے یہ جملے خاص طور سے قابل ذکر ہیں ؎۔

" اگر مجھے اور میرے خاندان کو فخر ہے تو اس امر کا ہے کہ میرا خاندان آصفجاہی کہلاتا ہے اور آفتاب سلطنت کے پیارے چاند محبوب دکن اعلیٰ اللہ مقامہ کا یہ خادم دست گرفتہ اور پروردہ ذرّہ بے مقدار ہے۔"

حضرت غفران مکان سے آپ کو بے انتہا عقیدت اور محبت تھی۔ جب کبھی اعلیٰحضرت مرحوم کی یاد ستاتی آپ ایک ایک گھنٹہ تک روتے۔ ہچکیاں بندھ جاتیں۔ حضرت غفران مکانؒ کے انتقال کا آپ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ اُسی سوگ میں آپ نے اپنی دیوڑھی میں اپنے مرنے تک دیوالی کی روشنی قطعاً موقوف کردی۔

حضرت اقدس واعلیٰ سے آپ کو جو دلی محبت تھی اس کا اظہار ان جملوں سے ہوتا ہے۔ میں یہ سب کچھ امن کی دولت کھونے والوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ اُن سے کہنا نہیں چاہتا جنھوں نے باہر سے آکر یہاں کی پرسکون فضا کو مکدر کیا ہے اور غلط و بے بنیاد پروپگنڈے کر رہے ہیں اور ہمارے ہر دلعزیز اور محبوب آقا کی فطری ہمدردی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو انسان تو انسان جانور کی تکلیف کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو زخمی بکرے کو اپنی موٹر پر بٹھا لیتا ہے اور اُس کی مرہم پٹی کراتا ہے جو گائے کو ذبح کرتے نہیں دیکھ سکتا جو اونٹ کی قربانی کو برداشت نہیں کر سکتا جو بلی کو لنگڑاتا دیکھ کر دواخانہ شاہی میں اُس کا علاج کراتا ہے اور دودھ روٹی اُس کے لئے مقرر کرتا۔

؎ بلدہ سیر پنجاب

کن کن اوصاف کو گناؤں اُس کی ذات سراپا رحمت ہے اور اُس کا محترم وجود سراپا برکت ہے!"

پھر کس والہانہ جذبہ کے تحت آپ اپنے ہندو بھائیوں کو نصیحت فرماتے ہیں۔

" اگر عاقبت اندیش ہو تو بادشاہ ذیجاہ کے قدموں پر اپنی پیشانیاں رکھ دو اور یہ یقین کرو کہ تمھاری نجات اسی کے سایہ میں ہے"[۱]

مہاراجہ کی اس وفاکیشی اور جاں نثاری کی قدردانی اعلیحضرت مرحوم اور اعلیحضرت حال دونوں نے فرمائی ہے۔ اعلیحضرت مرحوم تو یہاں تک فرماتے ہیں۔

مخلوق نہ کیوں چین سے سوئے آصف — جب شاہ خبردار ہو بیدار وزیر

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

جب شاہ کو ملتا ہے مرضی کا وزیر — ملتا ہے جبھی تو حکمرانی کا مزا

یہی حال حضرت اقدس و اعلیٰ کا ہے حضور پرنور خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ نے مہاراجہ کی ہمیشہ قدرافزائی فرمائی ہے۔ "مہاراج" کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ تحفوں اور عنایتوں اور الطاف و مراحم کی بارش ہوا کرتی تھی۔ بچوں کے لئے کھلونے، اسٹیشنری، انگشتریاں، شمشیریں، خلعتِ جواہر، گھڑیاں، آم وغیرہ خاص طور سے سرفراز ہوا کرتے تھے ـــ مہاراجہ کی علالت کے زمانے میں سرکار خود بنفس نفیس عیادت کے لئے تشریف لائے پھر انتقال کے بعد ایک فرمان مبارک شرف صدور لایا اور ارشاد ہوا کہ "پرانی بساط کا آخری مہرہ اٹھ گیا" اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ حضور والا کے دل میں مہاراجہ کی کس درجہ قدر تھی۔

یہی شاہانہ ذرہ نوازیاں تھیں جن کے سایہ میں رشک و حسد کے دیو پلنے لگے اور مہاراجہ کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی گئی۔ سنہ ۱۳۴۰ھ میں مہاراجہ نے "جواب باصواب" ایک کتاب لکھی جس میں ایسے ہی ضمیر فروشوں اور متعصب فرقہ پرستوں کے جھوٹے پروپگنڈے کا جواب دیا۔ چنانچہ دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

" ایک گمنام خط جس زمانہ میں فقیر شاد باغ عام میں باجازت اعلیحضرت ظل سبحانی قیام پذیر تھا۔

لہ " ہندو بھائیوں سے خطاب" از مہاراجہ آنجہانی

رجسٹری کے ذریعہ پہنچا تھا جس میں کسی نے بے سمجھے مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ اس وقت حضور کی جھوٹی خوشامد کرتا ہوں اور میری وہ خوشامد غلامی کی حد تک پہنچ گئی ہے اگرچہ وہ گمنام خط جواب دینے کے قابل نہ تھا مگر بعض احباب کے زبانی بھی اس خط کے وصول ہونے کے قبل میں نے سنا تھا کہ بعض ناعاقبت اندیش جو متوسط درجہ کے ہیں اپنے ہم صحبتوں میں اس قسم کی گفتگو کرتے ہیں اس لئے فقیر شاد ایک نظم ان گمناموں کے جواب میں لکھ کر طبع و شایع کرتا ہے تاکہ معترض کی نظر سے اگر گذرے تو وہ میرے صحیح خیال کا اندازہ کرکے قدر کرے خواہ مخواہ رشک و حسد کی آگ میں اپنے کو نہ جلائے"۔ اس نظم کے چند شعر بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

مرا پایہ نہ کم سمجھو وزیر شاہ آصف ہوں | دکن کے تخت کو تخت سلیماں کر کے چھوڑوں گا
گلے شکوے کرو منھ پر نہ لے پرکی اڑادو تم | وگر نہ مثل طائر ہوش پراں کر کے چھوڑوں گا
نہیں ہو قدر داں اب تم کروگے یاد اگر مجھ کو | پس مردن کبھی میں تم کو گریاں کر کے چھوڑوں گا
یہ جو تم کی پشت ہے میری نمک کھاتا ہوں آصف کا | میں اپنے خوان پر عالم کو مہماں کر کے چھوڑوں گا

وضعداری جس طرح مملکت آصفیہ اور شاہان آصفی سلطنت مغلیہ اور سلاطین مغلیہ کے حقیقی جانشین ہیں اسی طرح مہاراجہ بھی مغلیہ امراء کی شان و شوکت تزک و احتشام درباری آداب و وضعداری تہذیب اسلامی اور مشرقی ثقافت کا ایک مکمل نمونہ تھے۔ ٹوڈرمل کی سیاست، خانخاناں کی سخاوت، بیربل کی ظرافت ابوالفضل کی علمی فضیلت اور فیضی کی فیضیاب شاعری ـــ یہ سب آپ میں قدرتاً اس طرح ودیعت کردی گئی تھیں کہ آپ اسی عہد کے امیر کبیر معلوم ہوتے تھے۔

آپ کی وضعداری کے متعلق ماہر نے کیا خوب کہا ہے۔

محفل ہستی سے تو کیا اُٹھ گیا | وضعداری کا جنازہ اُٹھ گیا

جس سے ایک دفعہ جس انداز سے ملتے آخر تک وہی انداز قائم رہتا اور اس میں کبھی سر مو فرق نہ آتا۔ ابتداء میں بعض لوگوں کو وہ بڑے آدمی سمجھ کر اُن کی تعظیم کیا کرتے تھے لیکن بعد میں ہر چند اُن کے دل میں اُن کا کوئی احترام باقی نہ رہا تھا لیکن پھر بھی اپنی ملاقات اور تعظیم میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

اور جس طرح پہلے دن ملاقات کرتی تھی آخر تک وہی انداز باقی رکھا ۔ بعض لوگوں سے آپ رہنما ہو جانے تو ملنا ترک کر دیتے لیکن وضعداری ایسی کہ اگر اُن کو کوئی امداد دی جاتی تھی تو وہ آخر وقت تک جاری رہتی تھی ۔ (۳۰۰) روپیہ روزانہ کی وہ خیرات جو صدر اعظمی کے زمانہ میں ہوتی تھی وہ اپنی وضعداری کو باقی رکھنے کی خاطر صدر اعظمی سے سبکدوش ہونے پر (۸۰۰) ماہانہ مشاہرہ کی کمی کے باوجود بھی برابر جاری رہی ۔

مہاراجہ کی محفل میں بیٹھ کر ایک شخص بقول عالیجناب نواب بہادر یار جنگ بہادر بآسانی حیدرآباد کے مختلف امراء کے مدارج کا اندازہ کر سکتا تھا ۔ کیونکہ مہاراجہ کو حفظِ مراتب کا بڑا خیال تھا ۔ سلام کے مختلف طریقے تھے ۔ ایک شخص آتا اُس کے سلام کا جواب ہاتھ کو صرف پیشانی تک لیجا کر دیتے ۔ دوسرے کا جواب دینے کے لئے ہاتھ کو اچھی طرح گھماتے تیسرے کے لئے اُسی جگہ ذرا سا ایستادہ ہو جاتے، چوتھے کے لئے بالکل ایستادہ ہو کر اُسی جگہ ٹھہرتے، پانچویں کے لئے کچھ آگے بڑھتے، چھٹے کے لئے دروازہ تک جاتے، ساتویں کے لئے قبل از قبل ہی انتظامات ہوتے ۔ حتیٰ کہ امیرانِ پائیگاہ اور امرائے عظام (مثلاً سالار جنگ وغیرہ) کے استقبال کے لئے نیچے خود موجود رہتے ۔ مہاراجہ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ اکثر سرکاری تقاریب میں اور خاص خاص امراء کے ہاں بغیر دستار کے نہیں جاتے تھے ایک دفعہ کا ذکر ہے مہاراجہ دوبارہ صدر اعظم ہوئے تھے اُسی تقریب میں عالیجناب نواب بہادر یار جنگ بہادر کے ہاں آپ کی دعوت تھی ۔ راجہ خواجہ پرشاد کی عمر اُس وقت چھ سات سال کی ہوگی ۔ وہ کچھ دیر سے آئے اور اپنے اتالیق کے ساتھ ایرانی ٹوپی میں آگئے ۔ اتالیق نے اُن کو محفل میں پہنچا دیا ۔ وہ باپ کے پہلو میں بیٹھ گئے ۔ محفل آراستہ ہے ۔ سب لوگ درجہ بدرجہ بیٹھے ہوئے ہیں ۔ محفل سازگرم ہے ۔ مہاراجہ کے چہرہ کا رنگ یکایک تبدیل ہونے لگا اور ایکدم غصہ آگیا ۔ اتالیق کو آواز دی اور اس پر خفا ہو کر کہنے لگے ۔ تم یہاں بچے کو بغیر دستار کے کیسے لے آئے تم کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم کن گھروں میں کس طرح جایا کرتے ہیں اور حکم دیا کہ ان کو واپس لے جاؤ اور دستار پہنا کر لے آؤ ۔ نواب صاحب نے آگے بڑھ کر فرمایا

"ابھی صاحبزادے کی عمر ہی کیا ہے۔ جب بڑے ہوں گے خود ہی ان چیزوں کا خیال رکھیں گے۔"
لیکن مہاراجہ نے جواب دیا" خانصاحب! بچہ کی یہی عمر ہے جب اس کی قوت آخذہ بیدار ہوتی ہے اگر وہ اس عمر میں نہ سیکھے گا تو کبھی نہ سیکھ سکے گا۔ آپ مجبور نہ کیجئے اور اس کو واپس جانے دیجئے" غرض خواجہ پرشاد کو محفل سے اٹھوا دیا۔ نواب صاحب نے اُن کو دوسرے کمرہ میں بٹھایا۔ موٹر گئی دستار آئی اور جب وہ دستار پہن کر آئے تب اُن کو محفل میں آنے کی اجازت ملی۔

عالیجناب نواب بہادر یار جنگ بہادر کی قومی اور سیاسی مصروفیات میں جوں جوں اضافہ ہوتا گیا آپ کے ہاں نواب صاحب کی آمد و رفت بھی کم ہوتی گئی۔ جنہیں کہ" اصلاحات" کے زمانہ میں مہینوں سے نواب صاحب نے ملاقات نہ کی تھی مہاراجہ نواب صاحب کی ان ٹھیٹ اسلامی خدمات سے ناواقف نہ تھے۔ لیکن ایک دفعہ بارگاہ خسروی میں نذر کے موقع پر نواب صاحب نے مہاراجہ کو سلام کیا تو مہاراجہ نے مسکرا کر جواب دیا" ادھر! اب تو ہوگیا سلام سر راہے گا ہے" تب نواب صاحب نے سر جھکا دیا۔ مہاراجہ نے بے تحاشا نواب صاحب کو اُسی محبت اور خلوص سے گلے لگا لیا جو ان واقعات سے قبل مہاراجہ کو نواب صاحب اور ان کے خاندان سے تھا۔

بزرگوں کی عزت اپنے بزرگوں کی عزت و ناموس اور اُن کی شہرت کی بقا کا بڑا خیال تھا۔ ایک دفعہ نواب بہادر یار جنگ بہادر کو خط کے ذریعہ نصیحت کرتے ہوئے بزرگوں کے نام کو باقی رکھنے کے لئے اس طرح تحریر فرماتے ہیں کہ" آپس میں ایسے رہو کہ گورنمنٹ کی مداخلت نہ ہونے پائے۔ بات یہ ہے کہ اب زمانہ دوسرا ہے۔ سابق کے زمانہ میں ہزار ہا گھر بگڑے اور بگڑ کر بنے مگر اس زمانہ میں ایک گھر بھی بننے کی توقع نہ رکھئے۔

"آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند . . . .

خدا آپ سب کو توفیق نیک عطا کرے آپ کا گھر بہت بڑا اور قدیم خاندانوں میں سر برآوردہ اور معزز رہا ہے۔ اپنے بزرگوں کے نام باقی رکھئے۔ یہی ہماری بڑی خدمت ہے۔ ان کے غیاب میں اگر ہم سے ہو سکے۔"

سخاوت مہاراجہ اکثر راجہ چندولال کی سخاوت وغیرہ کے قصے سنایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "میں کیا دے سکتا ہوں میں تو صرف مہاراجہ چندولال کی لاج رکھنا چاہتا ہوں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد کے خیال کے مطابق، عبدالرحیم خانخاناں کی طرح مہاراجہ جود و کرم کے باب میں بے اختیار تھے اور عبدالرحیم خانخاناں کی طرح حسن طلب کے سچے روشناس جس کو کچھ دیتے اس انداز میں دیتے کہ لینے والا لینے پر مجبور ہو جائے اور شرمندہ نہ ہونے پائے۔

یہ صحیح ہے کہ مہاراجہ میں بعض عیوب بھی تھے مہاراجہ سے بعض لغزشیں ہوئیں اور بعض غلطیوں کا ارتکاب ہوا لیکن یہ بشریت کا تقاضا ہے غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے اور مہاراجہ کوئی فرشتہ تو تھے نہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سخاوت وہ نیکی ہے اور مہاراجہ کے کردار کا یہ وہ سب سے روشن پہلو ہے جس کے مقابلہ میں تمام کمزوریاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سخاوت سے مہاراجہ کے عیوب کی پردہ داری ہوتی تھی بلکہ خیرات خیر کا وہ جز ہے جس کی کوئی نظیر نہیں۔ اور یہ مہاراجہ کا خاندانی جوہر تھا۔ مہاراجہ کو بچپن ہی سے سخاوت کا شوق تھا۔ آپ کو ہر سال ہولی کی تقریب میں ڈیڑھ سو روپے خیرات کے لئے دئے جاتے تھے لیکن اسی وقت سے اس کی خیرات کے لئے وہ رقم ناکافی ہوتی تھی اور ہر سال آپ مزید ڈیڑھ سو کا مطالبہ کر لیا کرتے تھے۔

نواب بہادر یار جنگ بہادر فرماتے ہیں کہ حیدرآباد میں اب کوئی امیر نہ رہا۔ مہاراجہ ایک ہی امیر تھے۔ کیونکہ امارت دولت کی فراوانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ قلب کی وسعت سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔ مہاراجہ کے قلب کی وسعتوں اور دریادلی کا یہ عالم تھا کہ ان کی ہزاروں روپے کی کثیر ماہانہ آمدنی بالکل ناکافی ہوتی تھی۔ اکثر خود نواب صاحب کے ذریعہ سے پانچ پانچ سو روپے کی خیرات کی اور کہا "خان صاحب ان سے کہنا کہ میں شرمندہ ہوں" نواب صاحب فرماتے ہیں کہ نہ صرف زبان سے یہ کہتے تھے بلکہ چہرہ سے بھی شرمندگی کا اظہار ہوتا تھا۔

مہاراجہ چندولال کی طرح ہمیشہ نیچے سر جھکائے ہوئے خیرات کیا کرتے تھے۔ "اور جھکتے ہیں سخی وقت کرم اور زیادہ" کی مجسم تصویر بن جاتے۔ مانگنے والوں کو اگر پہرہ دار روکتے تو ان پر خفا ہو جاتے اور

غریبوں پر ترس کھا کر فرماتے کہ اُن کو کہنے دو اور مانگنے دو جو وہ کہنا اور مانگنا چاہتے ہیں ۔

آپ کی خیرات جو روزانہ تین سو کی تھی اُس کی تفصیل یہ ہے ۔

ایکسو روپیہ کی اکنیاں ۔ (۲۰) روپے کے چھوٹے پیسے ۔ (۲۰) روپے کے بڑے پیسے (۶۰) روپے ایسے محتاجوں کے لئے جو درخواست گزار ہوتے اور بے جھجک کے مانگتے اُن کو علانیہ طور پر حکم کے ذریعہ خیرات دی جاتی تھی باقی ایک سو جیب خاص میں رہتے تھے جس میں سے علی الصبح ناشتہ کرتے ہی (۲۵) خیرات کئے جاتے ۔ دوسرے (۲۵) برآمد ہوتے وقت تیسرے (۲۵) سہ پہر میں چائے پی کر باہر آنے کے بعد اور پھر (۲۵) سینما جاتے ہوئے ۔ اس طرح سو کی تکمیل ہوجاتی ۔ لیکن ہر سواری میں خواہ دن میں کتنی ہی دفعہ تشریف لیجائیں پندرہ کی اکنیاں (عنہ) کے بڑے پیسے اور دس کے چھوٹے پیسے ساتھ ہوا کرتے تھے ـــــ اس کے علاوہ ماہانہ پانچ ہزار کی خیرات ایسی تھی جس کی یا تو خود لینے والے کو یا صرف آپ ہی کو خبر ہوتی اور اکثر اوقات تو خود لینے والے کو بھی اس کی خبر نہ ہوتی مثلاً لفافہ بند کر کے یہہ کہہ کر کہ یہ اپنے فلاں بچہ کو دیدیجئے ۔ لینے والے کو یہ بھی خبر نہیں کہ لفافہ کے اندر کیا ہے ؟

ـــــ آپ کی یہی خیرات تھی جس کی وجہ سے مہاراجہ چندولال کے ہاتھ کی طرح آپ کا ہاتھ جلانے کے بعد بھی نہ جلا ـــــ

کرکٹ دیکھنے کے بڑے شوقین تھے ۔ میاچ کے دوران میں ہر ایک سے پوچھتے کہ فلاں شخص کتنے رن بنا کر اوٹ ہوگا ۔ اور اُسی وقت ایک اشرفی میز پر رکھدیتے جو شخص قریب ترین نمبر بتاتا وہ اُس اشرفی کا مستحق قرار پاتا ۔

ایک مرتبہ راجہ خواجہ پرشاد نے اپنے بچپن میں کسی فقیر کو اپنے ہاتھ سے سونے کا کڑا اُتار کر دیدیا پولس نے اُس فقیر کو گرفتار کرلیا ۔ کڑا مہاراجہ کے سامنے پیش ہوا ۔ آپ نے راجہ خواجہ پرشاد سے دریافت کر کے اُس کی تصدیق کرلی اور بلا تکلف کڑا واپس کردیا اور کہا کہ " بچہ نے جب دیدیا ہے تو اُس کو واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی "

آپ نے ایک روز اپنے ملازم کو (عہ) روپئے دئے ، دوسرے روز بھی دئے اور تیسرے روز بھی

لیکن چوتھے روز اُس شخص نے دست بستہ عرض کیا "سرکار کا دیا بہت کچھ ہے اگر فیاضی کا یہ عالم ہو تو میں خدمت گزاری سے اس کا صلہ ادا نہ کرسکوں گا" دو چار روز تک یہ سلسلہ منقطع ہوگیا لیکن پھر آپ نے ایک روز آزمائش کی خاطر اُس کو (سے) عنایت کیئے اور روپیے دے کر اس طرح مصروف ہوگئے کہ اُس کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ ملا۔ لیکن موقع ملتے ہی اُس نے عرض کیا "سرکار ایک معروضہ ہے" —— آپ کے لبوں پر ایکدم مسکراہٹ سی آگئی اس کے بعد آپ نے اس کو پھر کبھی نہیں آزمایا جب کبھی عطا فرمایا تو لفافہ میں بند کر کے ان الفاظ کے ساتھ" یہ آپ کے بچوں کے لئے روانہ کر رہا ہوں برائے خدا اسے قبول فرمائیے۔ آپ کا ممنون ہوں گا" —— سخاوت اور —— عنایت اور ممنونیت ! —— شرافت اس کا نام ہے !! ——

ایک دفعہ آپ ہوا خوری کے لئے جنگل تشریف لے گئے ایک شخص ادھر آنکلا اور عرض کیا "سرکار اٹھارہ سال کے بعد مجھے آپ کے درشن نصیب ہوئے" ارشاد ہوا "کیوں بھئی کہاں رہے ؟" عرض کیا "سرکار بیس سال کی سزا ہوئی تھی دو سال پہلے چھوٹا ہوں" پوچھا "کیوں سزا ہوئی تھی ؟" کہا "خون کے جرم میں" فرمایا "ارے —— بھلے آدمی تم خونی ہو ؟ تم خونی ہو ؟" کہا " سرکار وقت کی بات تھی" بس یہ سنتے ہی ہاتھ زانو پر مار کر فرمایا بے شک صحیح کہا ہے۔ "وقت کی بات تھی" اس فقرہ پر بڑے خوش ہوئے اور بڑی دیر تک مزے لے لے کر اس کی تعریف کرتے رہے اور جو کچھ دیا تھا اس کے سوا مزید پانچ روپیے عنایت فرمائے

جہاں جاتے سخاوت کا مینھ برسا آتے —— جب ہردوار تشریف لے گئے تو علی الصبح ایک سادھو حاضر ہوا۔ پہرہ دار نے اس خیال سے کہ شاید ابھی مہاراجہ بیدار ہوئے ہوں گے اُس کو خوب ڈانٹ ڈپٹ کر کے واپس جانے کے لئے کہا۔ اس پر سادھو نے کہا "تم کو مجھے واپس بھیجنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ تو بھیجا گیا ہے دینے کے لئے۔ اُس دینے والے نے اُس کو سبب گردانا ہے۔ اگر اس کو دینا مقصود نہ ہوتا تو وہ یہاں تک آتا کیوں ؟" یہ تمام گفتگو مہاراجہ اندر سے سن رہے تھے۔ آپ نے کہلوایا کہ سادھو کو روک لیا جائے۔ تب سادھو نے تپاک سے کہا "دیکھا میاں ؟ ہم نے کیا کہا تھا ؟ وہ تو مجبور ہے دینے پر وہ کیا دیتا ہے

۱ ۔۔۔

وہ تو ایک ذریعہ ہے" یہ سن کر مہاراجہ بہت مسرور ہوے اور سادھو کو خوش کر کے رد انہ کیا — مہاراجہ خود یہ فرماتے تھے کہ اُن کی امارت کسی کو کچھ دلواتی ہے اور نہ وہ خود کسی کو دیتے ہیں بلکہ وہ تو ایک سبب ہیں جن کو اُس مسبب الاسباب نے پیدا کیا ہے جو سب کا دینے والا ہے۔

مہاراجہ جب کبھی غصہ میں ہوتے بے حساب خیرات کرتے۔ اور ہر شخص کی حاجت اُسی وقت پوری ہو جاتی — حتیٰ کہ اشرفیاں تک پھینک دیتے — ایک دفعہ آپ کے جیب میں اشرفیاں تھیں۔ آپ غصہ میں تھے ۔ چلر اور روپے جب ختم ہو گئے تو آپ نے غصہ کی حالت میں اشرفیاں پھینکنا شروع کیں۔ ڈیوڑھی پہنچنے پر صرف ایک اشرفی ہاتھ میں رہ گئی وہاں آپ نے جھنجلا کر پوچھا کہ باقی اشرفیاں کیا ہوئیں۔ عرض کیا گیا کہ سرکار نے راستہ میں خیرات کر دی ہیں۔ آپ نے مسکرا کر کہا "اُنہی کے حصہ کی ہوں گی"

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ سابق رزیڈنٹ بارٹن نے آپ کو نصیحت کی کہ آپ اتنی سخاوت کرنا چھوڑ دیں اس سے آپ غریب ہو جائیں گے آپ نے جواب دیا "پہلے آپ اس کا انتظام کر دیجئے کہ لوگ مجھے چندو لال کا نواسہ کہنا چھوڑ دیں"۔

علم پروری | علم پروری اور عالم نوازی ایسی کہ ایک فلاکت زدہ ترک آگیا تو اس سے ترکی پڑھنا شروع کیا۔ اس سے اُس کی پرورش ہو گئی ۔ آپ کے ہاں علما اور شعرا کا جو جمگھٹا رہتا تھا اُس کا ہوش بلگرامی نے ایک جگہ کس قدر اچھا نقشہ کھینچا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں —

"مہاراجہ بہادر بالقابہ کی امیرانہ طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ ہے مہاراجہ چندو لال شاداں کا شاہانہ دربار شعرا سے بھرا رہتا تھا جس میں نصیر دہلوی کے سے اُستاد داد سخن دیا کرتے تھے۔ مہاراجہ شاد کے شاعرانہ دربار میں بھی ہر شاعر سرشار رہا کرتے تھے ۔ اور داغ بھی یوں نواسنج رہتے تھے کہ — ع آئیگی اُردو زباں آتے آتے ۔

جلیل و اختر بھی برسوں اس خوانِ کرم کے زلہ بردار رہے ہیں ۔ ضیا کی ضیا باریاں بھی شاعروں کو چمکا دیا کرتی تھیں۔ محوی کی شاعرانہ محویت اب بھی ہر جمعہ کو نظر آجاتی ہے ۔ ثاقب نے اپنی

پہلوانی کے شاعرانہ داؤ پیچ دکھائے ہیں اور غبار کی تصنیفی تراب تک حضرت شادہی کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے اور مشق سخن میں مصروف"

ان لوگوں کے علاوہ مرزا فرحت اللہ بیگ امیر مینائی، حالی، شبلی، اقبال، ہوش، جوش، ٹیگور طباطبائی اور علامہ عبدالقدیر، حسن نظامی، ماہر القادری۔ عالی (نرسنگ راج) عزیز یار جنگ امجد وغیرہ سے بھی آپ کے خاصے گہرے تعلقات تھے۔

آپ کی علمیت کا یہ عالم تھا کہ اردو کے علاوہ عربی، فارسی، تلنگی، انگریزی میں بڑی روانی سے گفتگو کر لیتے تھے۔ مفتی اعظم فلسطین نے مہاراجہ سے ملاقات کے بعد کہا تھا "میں نے لباس سے اور گفتگو سے کوئی بات ایسی نہیں دیکھی جس سے وہ ہندو معلوم ہوں" کیونکہ مہاراجہ آنجہانی گفتگو میں بے تکلف اور برمحل آیات قرآنی استعمال فرماتے تھے۔ بعض بعض اوقات تو بذلہ سنجی کے طور پر گفتگو آیات قرآنی ہی کرتے تھے۔

شاعری | مہاراجہ ایک پیدائشی اور پرگو شاعر تھے۔ غزل، قصیدہ، رباعی، مثنوی غرض ہر رنگ میں کہتے تھے ـــــ آپ کی دیوڑھی کا ایک خاص حصہ مشاعروں کے لئے مخصوص تھا جہاں ہر پندرہویں روز مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔

آنجہانی کی طبیعت کو شاعری کے ساتھ بچپن سے لگاؤ تھا۔ "ارمغان وزارت"[لے] میں لکھتے ہیں "مجھ کو یاد نہیں کہ شاعری کی دنیا میں میں نے کب قدم رکھا اور کیونکر رکھا۔ میں نے آنکھ کھول دیکھا تو یہ دیکھا کہ وسیع اور پُر بہار باغ نظر کے سامنے ہے۔ جو ہزاروں چمن اور لاکھوں گلہائے رنگارنگ پر حاوی ہے۔ ان پھولوں کی دلاویز خوشبو دل و دماغ میں بس جانے والی تھی۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے مجھ پر کب جادو کیا۔ میں ایک ایک پھول کا بلبل ہو گیا۔ اور میں نے اچھی طرح جان لیا کہ یہ چمن سخن ہی کا چمن ہے جس میں خزاں نہیں آتی جو پھول کھلتا ہے۔ وہ اپنی پائیدار تازگی سے سدا بہار کہلاتا ہے"۔

بہر حال آپ نے نوعمری ہی سے شاعری میں ایک خاص حیثیت حاصل کر لی اور اپنا کلام اعلیٰحضرت مرحوم کی خدمت میں پیش کرنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت غفراں مکانؒ نے آپ کو شاگرد خاص آصفجاہ کے نام سے

لے یہ مہاراجہ کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً "دبدبۂ آصفی" میں شائع ہوتے رہے۔

مہاراجہ امیر

نہ شادی داد سامانی نہ غم آورد نقصانی

بہ پیش ہمت ما ہرچہ آمد بود مہمانی

کتبہ فقیر شاد ۱۳۰۴

پکار نا شروع کیا۔ اس واقعہ کو مہاراجہ نے فخریہ ایک جگہ تحریر فرمایا ہے[1]۔

یوں تو آپ کی (۷۰) سے زائد تصنیفات میں نصف کے لگ بھگ فارسی، اردو منظومات ہی کا مجموعہ ہیں۔ لیکن آپ کی شاعری کے جو اچھوتے نمونے اور انوکھے انداز "پریم درپن"، "جلوۂ کرشن" "رباعیات شاد"، "آئینۂ عقیدت" اور "بیاضِ شاد" میں نظر آتے ہیں وہ کسی اور جگہ مشکل سے ملیں گے۔ "پریم درپن" اور "جلوۂ کرشن" کو آپ کی شاعری کا حاصل سمجھنا چاہئے۔ یہ دونوں مثنویاں زبان اردو کی چند گنی چنی مثنویوں میں سے ہیں، جن کی سلاست، زبان کی لطافت اور الفاظ کی کثرت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک دریا بہ رہا ہے۔ اور "جلوۂ کرشن" میں تو بقول جوش ملیح آبادی کے مثنوی کے ہر مصرع میں مصنف کا خون دوڑتا نظر آتا ہے اور ہر نقطے میں مصنف کا دل دھڑک رہا ہے۔

فنون لطیفہ | مہاراجہ نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ تحقیقی معنوں میں "ہرفن مولا" بہترین خطاط، مصور اور جلد ساز تھے، ایران کے مشہور کاتب عماد کے کتبوں کو سامنے رکھ کر خطاطی کی مشق کیا کرتے تھے۔ خط نسخ خوب لکھتے تھے۔ روزمرہ کی تحریر بھی نشیبانہ اور پختہ تھی مصوری اور تصویرکشی سے خاص ذوق تھا اور مرتے دم تک یہ شوق جاری رہا۔ چنانچہ آپ کے کمرۂ خاص میں ایک طرف وصلیاں اور دوسری طرف برش، رنگ اور ڈرائنگ کا کاغذ رکھا ہوا رہتا تھا۔ فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا۔ موسیقی میں بھی درک رکھتے تھے۔ خود فن سے واقف تھے اس لئے فن والوں کی بڑی قدر کرتے تھے ہارمونیم اور ستار بجانے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ سارنگ بڑے شوق سے سنتے تھے۔

آپ جیسے امیر کے لئے سنگتراشی ایک مشکل امر تھا اس لئے اس شوق کی تکمیل مورتیاں بنا کر کرتے تھے۔ اور مٹی سے اچھے اچھے مناظر اور جانوروں کے نمونے (Model) تیار کر لیتے تھے۔

فن پخت | خوبی یہ ہے کہ بڑے اچھے طباخ بھی تھے۔ نہ صرف موقتی ضرورت کی تکمیل کر سکتے تھے بلکہ اچھے اچھے انگریزی، ہندی، مغلائی، پکوان بھی جانتے تھے۔ آپ کا دعوی تھا اور نواب بہادر یار جنگ بہادر سے اکثر فرماتے تھے کہ "مہینہ بھر تک میں آپ کو دو سالن، ایک میٹھا، ایک کباب روزانہ

[1] ارمغان وزارت "۔۔۔" یوں تو صدہا ہزارہا آدمی خدمات جلیلہ سے ممتاز ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں حتی کہ خوش نصیبوں نے بادشاہ کی استادی کا شرف بھی پایا مگر یہ خاص عزت ہے جو مخصوص خانہ زاد کے حصہ میں آئی ہے اور میرے خیال میں تو اس کی نظیر مشکل سے ملے گی بلکہ نہ ملے کی کہ سلف سے خلف تک کسی وزیر کسی متوسل کو سلطان وقت کا شاگردی کا شرف حاصل ہوا ہو۔

پکا کر کھلاؤں گا۔ لیکن ایک دفعہ کھائی ہوئی چیز پھر آپ مہینہ بھر تک نہیں کھائیں گے"۔

طب | مہاراجہ نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ چنانچہ آپ نے خود ایک دفعہ فرمایا تھا[۱] "میں نے بھی طب کا درس زمانہ طالب علمی میں حکیم مظفرالدین صاحب مرحوم سے لیا ہے اور اپنی ڈیوڑھی کے متصل ایک مکان میں جو آج تک دواخانہ کے مکان کے نام سے موسوم ہے مرحوم حکیم صاحب کے ساتھ بیٹھ کر باضابطہ مطب بھی کیا ہے . . . . . . دواسازی میں کشتہ جات وغیرہ بنانے کی ترکیب سیکھی۔ اب بھی میرے پاس میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے کشتہ جات طلا، خالص فولاد اور ابرک ایک ہزار آنچ کے کشتے موجود ہیں"

فن سپہگری | فن سپہگری سے آپ کو دلی لگاؤ تھا نہ صرف یہ کہ آپ نے وقتاً فوقتاً فنونِ سپہگری کے مظاہروں کی سرپرستی کر کے ان سے دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے لیکن آپ کو خود ان فنون کی تحصیل کا شوق تھا چنانچہ ستر سال کی عمر میں بھی آپ نے بنوٹ کی تعلیم کے لئے ایک اُستاد مقرر کر لیا تھا۔

اوراد و وظائف پر بڑا عقیدہ تھا۔ اس کے فضائل اکثر بیان فرماتے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود بھی لوگوں کو تعویذ لکھ کر اور بتاشے وغیرہ پڑھ کر دیا کرتے تھے۔

ظرافت | ظریف ایسے تھے کہ کوئی بات بیان کرنی ہوتی تو بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے اور سننے والے لوٹ لوٹ جاتے۔ اس ظرافت کا آپ کی گفتگو تحریر نثر اور نظم ہر لحاظ سے اظہار ہوتا ہے ظرافت نثر اور شاعری کی سب سے نمایاں اور ممتاز خصوصیت ہے۔ آپ کی ظرافت طبع کا ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ

(۱) لیا تم نے جو میرا دل حساب دوستاں دل ہو — گلا کرنے سے کیا حاصل حساب دوستاں در دل

(۲) طفلی سے دیکھتا ہوں طبیعت شریر ہے — کچھ منحصر شباب ہی پہ شوخیاں نہیں

(۳) اے موذن وہ میرے پہلو سے اٹھ جائیگا — دیکھ اچھا نہیں ہے شور مچانا تیرا

آپ کے خطوط بہت دلچسپ ہوا کرتے تھے قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ تصنع اور بناوٹ نام کو نہ تھی اس لئے ایک خاص رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

---

[۱] خطبہ صدارت نظام آیورویدک یونانی طبی کانفرنس۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار کو خط لکھتے ہیں ۔

ذی وقار پنڈت رتن ناتھ سرشار

. . . . . ہاں صاحب یہ تو کہئے ان سب تجربات اور صدمات پر بھی آپ نے اپنی محبوبہ زرین کمر، عفت کوش، عصمت مآب، معشوق عالم، بنت العنب، ام عقبا کو کبھی دن طلاق نہیں کہا۔ واللہ بڑے جوانمرد ہو۔ کو کن اور قیس کے بھی کان کاٹے۔ جان جائے مگر جان جاں نہ جائے اسی کا نام عاشقی ہے ۔

عالیجناب نواب بہادر یار جنگ بہادر کو خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

. . . خدا کرے کہ آپ تینوں بھائی وحدت پرست تثلیث کو دور کرکے متحد ہو جائیں"

ایک اور خط ہے

مہربان نواب انتخاب جنگ بہادر

خط پہنچا۔ مسرور ہوا طبع رنگین کی نہ پوچھئے۔ مجھے دل آپ تھے ؟ خدا کے فضل سے ہمیشہ دلشاد رہے اور بقول شاد ۔ خدا شاد دار و بحق محمد ۔ ہمیشہ خوش رہیں گے ۔ رند خرابا تی تر دامن ہیں ۔ رنگین مزاج کیوں نہوں گے ۔ زاہد خشک نہیں کہ سبحہ و مصلے سے کام ہو ۔ . . . . . خدا کی عنایت سے تین بیویاں ہیں شرعاً ابھی ایک عوضی خالی ہے ۔ لفضلہ سات بچے ہیں اور آئندہ پانچ سات کی امید ہے ۔ طرفہ اور سنئے ۔ دشمن اتنے کہ جتنے سر میں بال ۔ ایک سہ ہزار سودا ۔ دوست فی زمانا عنقا ۔

شعر ۔

شاد ۔ زندگی اس طرح گزرتی ہے اپنے سایہ سے آپ ڈرتا ہوں

نواب سلطان الملک بہادر کو خط لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ۔

. . . شکار کی خوشی نے میری عقل پر ایسا دھاوا کیا کہ میں نے بھی جھٹ سے آوارہی کر لیا کہ کار سے اجازت لے کر آپ کو اطلاع دوں گا اس کی پوری مثال وہی ہوئی کہ (خوشی میں بندگی بھول گئے) بسنت کی خبر نہ رہی ۔ یعنی سالگرہ مبارک کی تقریب میں فوج کی طرف سے جو جشن ہونے والا ہے اس میں

مخلص کی شرکت ضرور ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہرن ہو جاؤں تو ادھر غیر حاضری کے رجسٹر میں دھرا جاؤں۔ سب چوکڑیاں بھول جاؤں۔ جل جلالہ نے شیر کا کیا شکار کیا ہوگا میرا تماشا ہو جائے گا۔ غالباً میرے اس عذر کو آپ عذر لنگ سمجھیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ یار باقی صحبت باقی۔ پھر کسی موقع پر کیا مزا ہوگا کہ ادھر گرما کا موسم۔ مئی اور جون کا مہینہ اور وہ گھمسان صحرا جس میں اونچے اونچے سوکھے درخت، آپ اور میں دونالی (۵۰۰) بور لیئے ہوئے شیر کے ملک الموت بنے بیٹھے ہوں۔ ادھر ہانکا ہوا۔ اور شیر پھپھر ٹوکا تا ہوا یہ نکلا اور گولی چلی۔ دائیں اور دھواں اس پار۔ شیر چاروں شانے چت۔ اُدھر آپ ادھر میں دونوں اپنے اپنے نشانے کی تعریف کے پل باندھ رہے ہوں ۔۔۔۔ یہاں تک چھوڑ دیتا ہوں اب اس کا تصفیہ کہ صید کس کی بندوق سے نشانۂ اجل ہوا وہ بر سر موقع دیکھا جائے گا۔ ۔۔۔۔

اپنے ایک مضمون "شادی"[۱] میں بچپن کی شادی کی مضرتیں، جوانی کی شادی کا لطف اور بڑھاپے کی شادی کا ایسے دلنشین انداز میں مذاق اُڑایا ہے کہ بیساختہ واہ واہ نکلتی ہے ۔۔۔ بچپن کی شادی کے متعلق آپ نے سر ایچ ٹیلر کا یہ قول لکھا ہے کہ "دو کمسنوں کی شادی کرنا ایسا ہی ہے جیسے مٹر کے دو دانوں کو ایک دوسرے سے ملا کر ٹھیرا دیا جائے"

جوانی کی شادی کی کس ظریفانہ انداز میں تصویر کھینچی ہے۔ اور عقد کے روز دُولہا دلہن کے حقیقی جذبات کو کس اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔" عقد کے دن کا قریب آنا اور دُولہا کے آتش شوق کا دلہن کا فرط حیا سے شرمانا لجانا۔ دُلہا کی جوانی کا جوش، دلہن عفت کوش، پرمست بادہ سرجوش شادمانی دو نظاہر میں چپ مگر سائیں دل لبریز شراب کامرانی۔ دلہا گرما گرم۔ دلہن پابند شرم، ادھر نشہ سے جوش مسرت آشکارا اُدھر حیا مانع اظہار۔ ادھر مسنوں کا مذاق دُولہا کی گرم جوشی۔ اُدھر ہمجولیوں کی چھیڑ دلہن کی خموشی"

بڑھاپے کی شادی میں پھبتیوں کی جو بھرمار ہوتی ہے اُس کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے۔

"ایک ۔ کاکا کہاں چلے کاکا؟

دوسرا ۔ محلے والوں کی چاندی ہے

تیسرا ۔ اسی برس کا سن، حلوا کھانے کے دن، چلے ہیں بیاہنے۔ مگر گھوڑے پر

---

[۱] "ارمغان وزارت"

کتنا اچھا سوار ہوتے ہیں۔ جیسے کسی نے رکھ دیا ہو۔

چوتھا ۔ یار و لڑکے کو ذرا سنبھالے رہنا کہیں لڑھکنی نہ کھا جائے۔ ورنہ ایک ہی قلابازی میں اٹا چت ہو جائے گا۔"

ایک مرتبہ[1] ایک بڑھے شاعر جو مہاراجہ بہادر کے ہاں ملازم رہ چکے تھے حاضر ہوئے اور اپنے ساتھ اپنے چھوٹے بچوں کو بھی لائے سب سے چھوٹے بچے کی عمر تین چار سال کی ہوگی۔ ایک شخص نے کہا "اس عمر میں بھی آپ کے اولاد ہوتی ہے۔ ماشاء اللہ" شاعر صاحب نے مہاراجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سرکار کے نمک کا اثر ہے" اس پر مہاراجہ ہنس کر بولے "خوب! میرے نمک کا مجھ میں تو اثر باقی نہ رہا! آپ میں باقی ہے"

ایکدفعہ آپ الوال میں تشریف فرما تھے۔ اپنے نبیرہ کے مزاج کی خرابی کے باعث ڈاکٹر کو فون کیا۔ لیکن ڈاکٹر وقت پر نہ آیا۔ اے۔ ڈی۔ سی سے کہا کہ وہ ڈاکٹر کو ٹیلیفون سے کہیں کہ مہاراجہ کی طبیعت خراب ہے اور وہ شام میں بہر صورت آکر دیکھ لے۔ ڈاکٹر جب حاضر ہوا آپ اندر تشریف فرما تھے جب باہر تشریف لائے تو سیدھے کھانے کی میز کی طرف تشریف لے گئے اور ڈاکٹر سے کہا کہ وہ خود بھی خاصہ میں شریک ہو جائے۔ خاصہ سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا کہ "ڈاکٹر صاحب میں اس وقت سینما جا رہا ہوں۔ اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میری واپسی پر ایک بجے مجھے دیکھ لیں" واپسی پر آپ نے فرمایا "ڈاکٹر صاحب آپ یہیں آرام فرمائیں اور صبح ساڑھے چار بجے مجھے دیکھ لیں" صبح جب آپ بیدار ہوئے تو آدمی سے (۶۰) روپے روانہ فرما کر کہلوایا کہ "ڈاکٹر صاحب آپ کو بہت زحمت ہوئی۔ اب آپ تشریف لیجائیے" ـــــ یہ تھا مہاراجہ کا مذاق۔ یہ تھا آپ کا ذوق۔

زندہ دل ایسے تھے کہ اس ضعیف عمری میں بھی اگر لوگ ہولی کے موقع پر آپ پر رنگ ڈالنا چاہتے تو روکتے نہیں بلکہ بخوشی اُن کو رنگ وغیرہ ڈالنے کی اجازت دیتے۔

ماتحت نوازی | بڑے ماتحت نواز تھے۔ اپنے اے۔ ڈی۔ سی۔ کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت ہو رہی ہے میں شرمندہ ہوں۔ ﷲ معاف کیجئے نہ دن کو

---

[1] "یہ واقعہ ماہر صاحب کے مضمون سے لیا گیا ہے"

آپ کو آرام ہے نہ شب کو ——— میرے ساتھ جو آپ کو محبت ہے آپ سکوت کرتے ہیں مگر میرا کانشنس مجھے شرمندہ کرتا ہے" ایک دوسرے خط میں ارشاد ہوتا ہے "آپ کے مخلصانہ اور خیر خواہانہ خدمات کا صلہ افسوس ہے کہ مجھ سے کچھ بھی نہ ہوسکا"۔ خدا مجھے ایسا موقع دے کہ میں معاوضہ اس کا یعنی آپ کی خیر خواہی کا کرسکوں۔ آج تک آپ کو اپنا صرف دوست سمجھتا تھا لیکن آج سے بخدائے عزوجل آپ کو اپنا عزیز کہوں گا"

اپنے لڑکے چندا پرشاد[1] کو خط لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تب یاد آیا میں نے سنا کہ تم نے آج بجرنگ کو پیٹا۔ آدمیوں پر ہاتھ چلانا بالکل بدتہذیبی ہے۔ اس پانچ اشرفیوں میں سے ایک جرمانہ اب چار ہی رہ گئیں"

جلسۂ تقسیم اسنادات سررشتہ طبیہ میں تقریر کرتے ہوئے جزمعاش ملازمین سے اپنی فطری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں "البتہ واجب عہدہ داروں کی ماہواروں میں کم مواجب ملازمین کی خوشحالی کے لئے تخفیف مناسب کی جائے اور اس سلسلہ میں میری ذات کی حدتک صدراعظمی کے مشاہرہ میں عام ادنیٰ ملازمین سرکار کی خاطر تخفیف مناسب کی ضرورت درپیش ہو تو مجھے تامل تو ایک طرف دلی مسرت ہوگی۔

ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ مہاراجہ کو اپنے ملازمین اور ماتحتین سے کس درجہ محبت تھی اور ان کو کس درجہ عزیز رکھتے تھے۔

مروت | ہر شخص کی بات توجہ سے سنتے تھے۔ دل شکنی اور دل آزاری کو کفر خیال کرتے تھے۔ کوئی کتنی ہی سادہ اور غیر ضروری بات کیوں نہ کرتا اس کو نہ ٹوکتے۔ اور کہنے والے کا دل رکھنے کے لئے اس کی تائید کرتے اگر کوئی آپ کو برا بھلا بھی کہتا تو ہنس کر ٹال دیتے لیکن خفا نہ ہوتے۔ اسی طرح کوئی آپ کے خلاف مرضی کچھ بھی کہہ رہا ہو اور آپ جانتے ہوں کہ وہ غلط کہہ رہا ہے مگر اس خیال سے کہ کہیں اس کا دل نہ دکھے ساکت ہو جاتے ۔ ایک دفعہ سر میں سخت درد تھا۔ حکیم محمد حسین افندی نے دو چار دفعہ سر پر ہاتھ پھیر کر

---

[1] یہ مہاراجہ کے سب سے بڑے بیٹے تھے لیکن چودہ سال ہی کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔

پوچھا کہ اب کیا حال ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ اب اچھا ہے۔ اور اس خیال سے کہ کہیں افندی صاحب کو بُرا معلوم نہ ہو اور اُس کی تکذیب ہونے سے اُس کا دل نہ دکھے بالکل خوش خوش نظر آنے لگے دس پندرہ منٹ تک خوب ہنستے بولتے رہے ایسے کہ کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ لیکن جونہی افندی صاحب روانہ ہوئے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا۔ آپ نے جواب دیا اگر میں اس وقت یہ کہتا کہ سر کا درد کم نہیں ہوا تو اس شخص کی دل شکنی ہوتی۔

مہمان نوازی | آنجہانی کی شخصیت مہمان نوازی میں یگانۂ روزگار تھی۔ حیدرآباد کی تو شاید کوئی مشہور ہستی ایسی نہ ملے گی جو مہاراجہ کے دریائے لطف و کرم سے فیضیاب نہ ہوئی ہو۔ لیکن حیدرآباد سے باہر بلکہ غیر ممالک کے اکابرین اور ماہرین علوم و فنون کو بھی آپ کے مہمان رہنے کا شرف حاصل ہوا ہے جب کوئی مشہور شخص حیدرآباد آتا اُس کو اپنا مہمان بنانے میں مہاراجہ ایک خاص خوشی محسوس فرماتے تھے۔ چنانچہ مفتی اعظم فلسطین، مولانا محمد علی، ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر ٹیگور، مہاراجہ بیکانیر، پرنس آف میسور، مہاراجہ دھولپور، نواب صاحب خیرپور، نواب صاحب چھتاری، نواب صاحب لوہارو، سر سپرو، سر فضل حسین، سر یعقوب، ڈاکٹر انصاری، پنڈت دت ماجی، سر اسماعیل وغیرہ آپ کے مہمان رہ چکے ہیں۔ پنڈت جگت پرشاد کو یومیہ پانچ روپیہ دیکر کئی ماہ تک مہمان رکھا، خواجہ حسن نظامی جب کبھی حیدرآباد آتے آپ ہی کے مہمان رہتے۔ مقامی مشاہیر، عہدہ داروں، مجذوبوں اور سالکوں کی مہمان نوازیاں اس کے سوا تھیں۔ آپ کی خاص عادت تھی کہ سوائے ناشتہ کے کسی اور وقت پورے اسٹاف اور حاضرین اور تمام اہل خاندان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ جو کوئی ملاقاتی آتا بغیر کچھ کھائے پیئے واپس نہ ہوتا جب کبھی کوئی مہمان کسی چیز کی تعریف کرتا تو وہ چیز واپسی میں خود بخود اس کے ساتھ کردی جاتی۔

نیکی کا تصور | آپ کے ہاں شرافت کا معیار یہ تھا کہ کوئی بُرائی کرے اور بدی سے پیش آئے تو اُس کا جواب نیکی اور بھلائی سے دیا جائے۔

نیکی کی خاطر نیکی یہ آپ کا نصب العین تھا۔ چنانچہ آپ کے دو شعر ہیں

دوزخ کا جسے ڈر ہے وہ ہے زشت عمل	جنت کی ہوس ہے جسے وہ ہے پاگل

نیکی کر، شاد و نیک رہنے کے لئے یہ اہل مذاہب کا ہے قول فیصل

...پ اکثر فرماتے تھے کہ "کسی کے متعلق اُس وقت تک رائے قائم نہ کرو جب تک اُس سے
...قف نہ ہو جاؤ اور کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ کسی کو بُرا بھلا نہ کہو۔ کیونکہ نہ معلوم کس میں کیا جوہر ہے"

...بت سے نفرت | غیبت سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ آپ نے سوامی ہری پرشاد کو ایک خط
...ا جس میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں "آپ نے حضرت چندا شاہ صاحب پر جو جملہ کہا ہے
...س سے صاف اس بات کا اظہار ہوتا ہے ۔ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ اید در حدیث دیگراں
چونکہ یہ غیبت ہے اس لئے مجھے اس کے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی حشر میں اس کا
...رد ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ جو کرے گا وہ اپنی آپ پائے گا۔ میں قاضی نہیں کہ فیصلہ چکاؤں"

...صاف گوئی سے محبت | صاف گوئی سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص دیر
...ت اپنی بپتا سناتا رہا۔ مہاراجہ نے اُس کو کچھ دے کر رخصت کرنا چاہا۔ وہ سربسجود ہو گیا۔ ایک صاف
...درباری کو یہ حرکت بہت بُری معلوم ہوئی اور اُس کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا۔ اُس کے جانے کے
...بعد یہ حالت دیکھ کر مہاراجہ نے درباری سے دریافت فرمایا "کیا بات ہے تمھارے چہرہ پر ایک رنگ
...آتا ایک رنگ اترتا ہے" عرض کیا "اُس شخص کی یہ حرکت مجھے بہت بُری معلوم ہوئی۔ خدا ہی ہر
شخص کا رزاق ہے وہ انسان کو بھوکا تو اُٹھاتا ہے لیکن بھوکا سلاتا نہیں" اس راست بازی سے
...پ بیحد محظوظ ہوئے اور فرمایا "بے شک تم نے سچ کہا۔ پیٹ اور غرض کی خاطر ظاہر و باطن میں
...منافرت کا باعید از شرافت ہے"

...خلوص | مخلص ایسے تھے کہ ایکدفعہ نواب بہادر یار جنگ بہادر نے مہاراجہ سے اجازت چاہی
...کہ آیا وہ محرم کی نویں تاریخ کو دیوڑھی مبارک آسکتے ہیں ۔ مہاراجہ اس سے بیحد متاثر ہوئے ۔ کچھ دیر
...سکوت کیا اور طنز سے کہا کہ "نہیں آسکتے ۔ نہ آیئے" اور اس قدر رنجیدہ ہوئے کہ جو ملنے آتا اُس سے
...یہی کہتے "سنا تم نے ۔ بہادر خاں کو بھی ہمارے ہاں آنے کے لئے اجازت کی ضرورت ہے"۔
"بہادر خاں ہمارے پاس آنے کے لئے اجازت مانگتے ہیں" غرض تین دن تک شکایت کرتے رہے۔

نواب صاحب حسب معمول روزانہ آتے۔ مہاراجہ پان بنا کر تقسیم کرتے۔ سلام کا جواب لیتے لیکن گفتگو نہ کرتے۔ تین دن تک یہی عالم رہا پھر نواب صاحب نے بڑی منت سماجت کی تب آپ نے بات کی۔

سادگی اور انکساری عجز و انکسار ایسا کہ ہر شخص سے خندہ پیشانی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہر ایک کی درخواست کو خود بغور پڑھتے۔ ہر کس و ناکس کی دعوت قبول فرماتے۔ اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ فقیر کا لفظ لکھتے تھے۔ اور سچ پوچھئے تو اس میں اس قدر صداقت تھی جس کا اظہار ناممکن ہے آپ کی سادگی کا اظہار آپ کے اخلاق طبیعت اور لباس ہر چیز سے ہوتا تھا۔ آپ کے یہی اخلاق تھے اور یہی کردار تھا جس کی وجہ سے لوگوں کو آپ سے دلی اور فطری طور پر عقیدت تھی اور آپ کے ایسے گرویدہ تھے کہ جہاں جاتے مثل پروانہ آپ پر ٹوٹ پڑتے۔ پھر جب آپ کا انتقال ہوا تو دو لاکھ سے زائد آدمی آپ کی میت کی معیت میں تھے۔

مہاراجہ آنجہانی کی ذات ایسے انسانوں کی صف میں ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت کی مالک ہے جنھوں نے تن، من، دھن ہر طریقہ سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کی غمخواری اور خدمت خلق کے لئے وقف کر دیا اور جو اپنے اندر غیر معمولی جذب قلوب اور ہمہ گیر محبت کا مادہ رکھتے تھے۔ ایسے انسانوں کی سیرت ایک بصیرت افروز اور عبرت آموز حقیقت کی حامل ہوتی ہے۔ ان نیک نہاد کی شخصیت ظاہری نمود کی شرمندۂ احسان نہیں ہوتی۔ اُن کے کارنامے انسانیت کے لئے مایۂ ناز ہیں اور اُن کی مقدس یاد اس دیرپا یادگار کی ایک مثال ہے جو اُن کی زندگی اور سیرت و کردار نے رہتی دنیا تک کے لئے قائم کر دی ہے۔

محمد بن علی باوہاب
بی۔ اے (آخری)

مہاراجہ بہادر کے تعلقات اُردو کے مشہور شعراء

اور

ادیبوں سے

"اُس مضمون پر ادارہ کی جانب سے انعام اول دیا گیا ہے"

"ادارہ"

مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت آنجہانی اُس جلیل القدر "وزیر سلطنت آصفیہ" کے نواسہ تھے جن کا نام علم و فضل کی قدر دانیوں اور علماء کی سرپرستیوں کی وجہ سے دکن کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ مہاراجہ چندو لال شاداں اور ان کی ان مٹ علمی سرپرستیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ مہاراجہ آنجہانی بھی علمی اور ادبی ذوق اور علماء کی سرپرستی میں اپنے نانا کے قدم بقدم تھے۔ آنجہانی کی زندگی تک سرزمین دکن میں قدیم اور جدید طرز کے انشا پردازوں اور شاعروں کا اگر کوئی قیام امن تھا تو وہ صرف "ایوان شادؔ" ہی تھا۔ جہاں سے ادیب و شاعر بلا لحاظ مسلک اپنی اپنی قابلیتوں کا ثمرہ پاتے اور حقیقی دادِ سخن حاصل کرتے تھے۔

حضرت شادؔ آنجہانی کی ترقی پذیر طبیعت خاص طور پر لائق تذکرہ ہے کہ آپ نے زندگی بھر باوجود اپنی غیر معمولی وضعداری کے علمی رجحانات زمانہ کا ساتھ دیا۔ اگر ہم شاعری کو تین زمانوں یعنی عصر اصلاح[1] عصر درمیانی اور عصر حاضر میں تقسیم کردیں تو حضرت شادؔ کا

[1] سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کا دور

عصرِ درمیانی میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ باوجود اس کے جب سے اُردو نثر نگاری یا شعر گوئی میں جدید اثر کا انقلابی پہلو نمایاں ہونے لگا، آنجہانی نے بھی صرف اس کا خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ ان کی ہمنوائی کی یہی وجہ ہے کہ آپ سے ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں اور مستند ادیبوں کے تعلقات کا دائرہ نہایت درجہ وسیع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مہاراجہ کے ان تعلقات میں آنجہانی کے وسعت اخلاق کا غالب عنصر بھی شامل ہے مگر علمی شغف بھی ضرور وجہ تعلق رہا ہے۔

آسمان ہند پر عصر اصلاح سے عصر حاضر تک اُردو زبان کے جس قدر بھی درخشندہ ستارے چمکے ان میں مشکل سے ایسے نکل سکیں گے جن سے آنجہانی کے خاص تعلقات نہ رہے ہوں۔

آنجہانی کے وسیع تعلقات کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے پاس ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت کا ایک علحدہ صیغہ اور دفتر[1] تھا۔ جہاں موصولات جمع کئے جاتے اور جوابی مسودوں کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس حسن انتظام کے بہت کم ذخیرہ مواد منظم حالت میں موجود ہے۔

زیر نظر مضمون میں میں نے صرف ان مستند شاہیر کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جن سے جدید ادبیت کی وسعت اور شعریت کی وسعت کے ساتھ اس کے ارتقاء کا کوئی نہ کوئی رشتہ وابستہ دامان رہا ہو۔

عصرِ اصلاح کے ادیبوں اور شاعروں سے تعلقات

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عصر اصلاح میں جتنے مسلم ادیب ہیں وہ تقریباً سب کے سب مستند شاعر بھی ہیں۔ جنہوں نے جدید شاعری اور جدید طرز تحریر کی نیو ڈالی اور قدیم رسمی اور تقلیدی اثرات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی	حالیؔ جیسے انقلاب آفریں شاعر اور شائستہ مذاق

---

[1] یہ دفتر اب عتبار صاحب کا دفتر کہلاتا ہے۔

ادیب سے حضرت شاد نے غالباً ۱۳-۱۹۱۲ء میں پہلی مرتبہ ملاقات فرمائی۔ وہ اپنی تصنیف "سفرِ پنجاب" میں لکھتے ہیں کہ

"حضرت مخدوم صاحب قدس سرہٗ العزیز کی بارگاہ میں گیا اس درگاہ کے بیرونی دروازہ پر مولوی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی سے بھی ملاقات ہوئی اور دیر تک ان سے باتیں کرنے کے بعد ان سے رخصت ہوا۔ مولوی صاحب کی تعریف کس قلم سے لکھوں دعا کرتا ہوں کہ خدا اس وجود کو ابھی باقی رکھے۔"

"سیر پنجاب" میں ایک دوسری ملاقات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

"آج صبح کو مولوی الطاف حسین حالی آئے۔ ان کا دم نہایت غنیمت ہے۔ گو پیری نے اپنا دخل کر لیا ہے۔ مگر دل جوان اور عقل آزمودہ ہے۔ ان کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اور دل میں ایسی اترتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ۔ خدا زندہ رکھے۔ لطف صحبت سے میں نہایت محظوظ اور مستفید ہوا بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔"

بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ابتدا میں ان کے نظم و نثر کے پائیدار کارناموں سے متاثر ہو کر آنجہانی نے ایک خط کے ذریعہ تعارف حاصل کیا تھا۔ اس خط سے ایک طرف مہاراجہ کے علمی ذوق کا اور دوسری طرف آپ کی ادبی قدر دانی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس مکتوب کا اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"خال رخسارِ فضل کمال خواجہ الطاف حسین صاحب حالی۔"

"یہ ظاہر ہے کہ آپ سے مجھ کو تعارف نہیں ہے اور آپ روشناس نہیں۔ اس بے تعارفی میں بے تکلفی یعنی چہ۔ مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ کان دھر کر سنئے میں نے آپ کی تصنیفات ایک حیات سعدی (بارک اللہ) دوسری یادگار غالب (سبحان اللہ) دیکھیں۔"

"مجھ میں نہ اس قدر استعداد ہے نہ قابلیت کہ آپ کی تعریف کروں۔ مگر مجبور

کہوں گا یہ دونوں کتابیں انمول ہیں اور آپ کا دم مغتنمات میں سے ہے۔ خدا تم کو ابد تک سے بچائے"

"اب جب کہ جس حالت میں آپ کو اور مجھے غالب مرحوم کے کلام کے ساتھ دلی تعلق اور اسی دلی تعلق کی بدولت آپ کے دلچسپ تالیفات و تصنیفات نے مجھے اس یگانگی میں بے تکلف کر دیا تو یہ ذریعہ تعارف پیدا کرنے کے لئے بالکل کافی ہے"

پنجاب کی ملاقات کے بعد مراسلت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوستانہ مراسم بڑھ گئے تھے۔ افسوس ہے کہ حالی کے خطوط کی نقلیں نہ مل سکیں مگر آنجہانی کے چند جوابات موجود ہیں۔ تعلقات کے اظہار کے لئے مکتوب کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"آپ کا مودت نامہ مورخہ ۱۹ اکتوبر معہ رسید وصول ہو کر کاشف احوال ہوا" چند ضروری امور کی نسبت ذکر تے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

"میں خدا سے امید کرتا ہوں کہ آپ بالکل تندرست ہو گئے ہوں گے خدا آپ کو بہت دن تک زندہ و سلامت رکھے"

علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ حالی کے معاصرین میں سنجیدہ غور و فکر کے لئے اگر کسی نے کچھ نیا لاٹ چھوڑے تو وہ شبلی ہیں۔ مہاراجہ آنجہانی شبلی سے صرف متعارف ہی نہیں تھے بلکہ آپس میں مراسلت ہوا کرتی تھی۔ اور آنجہانی شبلی کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ گو ان کی مراسلت موجود نہیں ہے مگر پھر بھی بعض خاص اشاروں سے تعلقات واضح ہو جاتے ہیں جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں آنجہانی نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"مولوی عزیز مرزا صاحب نے دار العلوم کی ترقی کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے قیام کی اسکیم بڑی محنت سے تیار کی تھی۔ اور میں نے عبد الحلیم شرر اور مولوی شبلی نعمانی کو (جن سے میں بخوبی واقف ہوں) اس کام کے لئے طلب بھی کیا تھا"[1]

اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں شبلی کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ جن میں ان کی صحبتوں

[1] خطبات یمین السلطنت

وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر

حالی اور شبلی کے معاصرین میں مولانا عبدالحلیم شرر، جن کو مستند ادیب ہونے کے ساتھ اردو شاعری میں "نظم غیر مقفیٰ" سے روشناس کرنے کا فخر حاصل ہے، سے بھی آنجہانی کے تعلقات نہایت وسیع تھے۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد مولانا عبدالحلیم شرر نے بحیثیت رکن تالیف "تاریخ اسلام" کی تدوین میں اپنی خدمات ایک عرصہ تک انجام دی ہیں۔ ان کی مراسلت سے قدیمی تعلق کا اظہار ہوتا ہے جب کہ ابھی جامعہ عثمانیہ کا قیام بھی عمل میں نہ آیا تھا۔ ۱۳۳۲ف کی مراسلت کا نمونہ دیرینہ ملاقات کے اظہار کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔

مکاتیب شرر

"صحیفہ والا نے شرف افتخار بخشا۔ حسب الحکم والا رجسٹر "دلگداز" کو جناب کے نام سے علاحدہ کر دی گئی۔ اور ۱۹۱۴ء کے کل پرچے مرسل خدمت والا ہیں رسید سے سرفراز فرمایا جائے۔"

"خط اور لفافہ سے غم و اندوہ کا اظہار ہوتا ہے مگر فدوی کو خبر نہیں کہ وہ کونسا سانحہ جاں فرسا پیش آیا جس کی وجہ سے خط کے کونے میرے نامۂ اعمال کی طرح سیاہ ہیں۔ مجھے اس واقعہ سے اپنا سچا شریک غم تصور فرما کر ضرور اطلاع دی جائے گی۔"

"یہ میرے لئے باعث فخر و مسرت ہے کہ جناب نے "سیر پنجاب" کے ریویو کو پسند فرمایا۔ یہ میرا فرض تھا جس کو میں ضرور ادا کرتا۔

دلگداز کا نمبر وی۔ پی نہیں روانہ کیا اور اس عام قیمت پر جو ہمارے ملک سے لی جاتی ہے اس کو جناب سے بھی لینا میں جناب کی شان کے خلاف تصور کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ "دلگداز" کو سالانہ تنخواہ مقرر کر دی جائے۔"

"سرکار نے لکھنؤ آنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا اور شوق قدمبوسی خاکسار کے دل میں پیدا ہوا تھا اس وقت بھی باقی ہے۔ معلوم نہیں سرکار کب تک آنے کا ارادہ رکھتے

ہیں سے اطلاع دیجئے۔ والسلام"۔

درمہاراجہ آنجہانی نے بھی اس کا طویل جواب دیا ہے جس میں تشرر کو "مہربان شاد" سے خطاب کیا ہے۔ چونکہ اس جواب میں بعض مذہبی و علمی مسائل پر ایک مستقل بحث کی گئی ہے اس لئے نقل سے احتراز کیا جاتا ہے۔

آنجہانی کے تعلقات عصر درمیانی کے مشہور ادیبوں

اور

شاعروں سے

درمیانی زمانہ کے ادیبوں اور شاعروں میں بھی عہد اصلاح کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی اس دور کے اکثر ادیب مشہور شاعر بھی ہیں۔ جیسے سرشار، چکبست اور اکبر الہ آبادی وغیرہ۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار آنجہانی کو سرشار سے غیر معمولی عقیدت تھی۔ اپنی تصنیف "ارمغان وزارت" کے دیباچہ میں پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کی تعریف فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مجھے جو نثر نگاری کی طرف میلان ہوا اس کا اصل باعث فسانہ آزاد کی سیر ہے"۔ اس کے علاوہ وہ اس سلسلہ میں دعا کرتے ہیں کہ "سائی ہوں کہ ان کے لٹریچر کے رنگ میں کامیابی حاصل کروں"۔ سرشار لکھنوی ایک عرصہ تک مہاراجہ بہادر آنجہانی کے پاس ملازم تھے۔ چنانچہ وہ رسالہ "دبدبہ آصفی" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "۱۳۱۵ھ کا وہ زمانہ ہے کہ سرشار مرحوم میرے پاس ملازم ہو چکے تھے"۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی کے تعلقات سرشار کے انتقال تک قائم رہتے ہیں۔ "آنجہانی خود" "ارمغان وزارت" میں اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "وہی شب و روز میرے ہمدم رہا کرتے تھے"۔ مکتوبات سے آپس میں بے تکلفی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ایک مکتوب میں آنجہانی سرشار سے مخاطب ہیں

ل اس رسالہ کو مہاراجہ بہادر شائع کیا کرتے تھے جن میں خصوصیت کے ساتھ منفران مکان کا کلام طبع ہوتا تھا۔

"مگر ہاں کہئے تو پرسوں شب میں میں نے جو رقعہ بھیجا تھا۔ اس کی عبارت کیسی تھی۔

آپ کو دعوی تھا کہ لکھنؤ والوں کے مقابل میں اور خصوصاً سرشار کے مقابل میں کوئی نثر

نہیں لکھ سکے گا مگر اب بھی مانو گے کہ نہیں کہ ہم حیدرآباد کے بھی کچھ لکھ سکتے ہیں۔"

سرشار سے غیر معمولی عقیدت کے کئی مکتوب "رقعات شاد" میں بھی نظر آتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس میں بے حد خلوص تھا۔ اور یہی وجہ ہے سرشار مرحوم اپنے انتقال تک آنجہانی کے مورد عنایت رہے۔

اکبر الہ آبادی اور چکبست

اکبر الہ آبادی اور چکبست سے بھی مہاراجہ متعارف تھے اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں انشا پردازوں اور شاعروں سے بھی مراسلت ہوا کرتی تھی مگر افسوس ہے کہ اب وہ موجود نہیں ہے۔ آنجہانی کے معتمد صاحب[۱] نانگی بیان کرتے ہیں کہ آنجہانی اکبر الہ آبادی اور چکبست کی صرف تعریف نہیں کیا کرتے تھے بلکہ دونوں سے کافی راہ و رسم تھا۔ مزاحیہ نگاری میں حضرت شاد بھی اکبر الہ آبادی کی سی تقلید فرمایا کرتے اور ان کو خطوط بھی اسی انداز میں لکھتے تھے۔ معتمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ چکبست سے بھی بڑے ہی خوشگوار تعلقات تھے اور کہا جاتا ہے ان سے بھی مراسلات ہوا کرتی تھی۔

شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی۔

درمیانی زمانہ کے انشا پردازوں میں مولوی سید علی بلگرامی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ آنجہانی اور بلگرامی کی مراسلت سے ان کے خلوص کا پتہ چلتا ہے آنجہانی لکھتے ہیں۔

"آپ کے اعتراض کے قربان۔ اگر اعتراض صحیح ہوتا تو میں شکریہ کے ساتھ تسلیم کر لیتا

اور یہ سمجھتا کہ خطا و نسیان ترکیب انسانی ہے۔ اور بے عیب ذات خدا۔ بلکہ آپ کے اعتراض

کے گھر آتے ہی میں نے اس مصرع کو ( ) یوں بدل دیا۔"

ایک دفعہ شمس العلماء سید علی بلگرامی نے حضرت شاد کو تقویم پیش کی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

---

[۱] علمبردار حسین صاحب۔

شمس العلما مولوی سید علی بلگرامی "چند قطعہ تقویم بابتہ ۱۹۱۰ء معیت مرضی مورخہ

۳۰ رمضان المبارک ۱۳۲۸ھ وصول بہت منزل ہوئے۔ یہ تقویم مرتبہ احسن التقاویم ہے۔ ایک

عمدہ اور کارآمد چیز ہے جس کے لحاظ سے امور ضروری فوراً ہمزمن ہو سکتے ہیں"

مولانا سے یوں بھی زیادہ قریبی تعلق تھا کہ انہوں نے سرکاری خدمات انجام دی تھیں۔ دربارہا دربار شاد

میں بھی موجود رہے ہیں۔

نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی

نواب حیدر یار جنگ بہادر نظم طباطبائی ان شعرا میں سے ہیں جنھیں قدیم اور جدید دونوں طرز کی شاعری میں کمال حاصل تھا۔ نظم جامعہ عثمانیہ کی مجلس نصاب کے رکن رہ چکے ہیں۔ طباطبائی نے غیر مقفیٰ نظموں کو اردو میں رائج کرنے کی کوشش کی تھی اس مہم میں شرر نے بھی آپ کی بڑی مدد کی ہے۔ جو اس کے بانی ہیں۔

نظم حضرت شاد کے استاد اور مشیر تھے۔ چنانچہ حضرت شاد لکھتے ہیں۔

شاگرد ان کے علم ادب میں کثیر تھے ۔۔۔ شعر و سخن میں نظم میرے بھی مشیر تھے

اصلاح نظم و نثر میں وہ بے نظیر تھے ۔۔۔ سچ یہ ہے وہ مؤید رب قدیر تھے

ان کی مراسلت سے بھی ان کے وسیع تعلقات اور محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت شاد کو نظم سے بیحد محبت تھی۔ مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"حاضرین!

"آج ہم یہاں ایک بزرگ، عالم، شاعر، حکیم، فلسفی، صوفی اور میرے استاد کے انتقال پر سوگ منانے اور ان کے پسماندوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کے لئے جمع ہوئے ہیں"

۵۔ نواب حیدر یار جنگ بہادر مرحوم۔

حضرت نظم طباطبائی مرحوم جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ایک عدیم المثال فرد فرید شاعر ادیب حکیم فلسفی، صوفی، فقیہ، محقق اور علوم جدیدہ سے واقف اور حقیقی معنوں میں ایک متبحر عالم تھے۔ ان کی وفات گو ان کے عمر طبعی کو پہونچنے کے بعد ہوئی لیکن ہندوستان کو ان کے انتقال نے ایک بڑی قابل عزت اور بے بدل ہستی سے محروم کر دیا۔ میں محسوس کرتا ہوں جس سے آپ بھی یقیناً متفق ہوں گے کہ مرحوم کی وفات پر محض اظہار افسوس خواہ وہ کیسا ہی دلخراش اور پر خلوص ہو ہماری تمدنی زندگی اور علم دوستی کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ جب تک ہم مولانا کی وفات کے المناک موقع پر جو ہمارے لئے نقصان عظیم اور حرماں نصیبی کا سبب ہوتی ہے مرحوم کی موزوں یادگار کے قائم کرنے میں ایسے کام نہ کریں جو ہمارے احساسات کی روشنی میں ہماری صلاحیت اور زندگی کی دلیل ہوں۔"

یہی نہیں بلکہ آنجہانی نظم کے انتقال پر یوں نوحہ فرماتے ہیں کہ

تیغ الم سے آج میرا دل فگار ہے — خون جگر سے دیدۂ دل اشکبار ہے
مضطرب ہے قلب جان حزین بیقرار ہے — مخلوق نوحہ خواں ہے جہاں سوگوار ہے
دامن شکیب وصبر کا اشکوں سے بھر گیا — اونچا ہوا یہ پانی کہ سر سے گزر گیا

حضرت داغ دہلوی داغ دہلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ داغ اپنے زمانہ میں آنجہانی کی قدردانیوں کا ثمرہ پا چکے ہیں۔ جب تک داغ "دربار آصف" میں موجود تھے آنجہانی کے تعلقات ان سے بھی بہت اچھے رہے اور آپس میں ایک عرصہ تک خط وکتابت بھی ہوتی رہی۔ تعلق کے سلسلہ میں مہاراجہ آنجہانی کا ایک مکتوب درج ذیل ہے جس سے خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"جناب من نواب فصیح الملک بہادر حضرت داغ دہلوی سلمہ اللہ تعالیٰ"

"مزاج شریف کئی روز سے کیفیت معلوم نہیں ہوئی۔ کیا شکایت ہے اور خدانخواستہ کیوں طبیعت کسلمند ہے۔ یقین ہے کہ بفضلہٖ مزاج خیریت سے ہوگا۔ اللہ تعالیٰ

خیریت سے رکھے۔ سب شعراء نے آئینہ کی ردیف میں وہ طبع آزمائی کی کہ آئینہ کی ناک میں دم آگیا۔ یہاں تک کہ کسی نے خورشید کو جام بنایا۔ اور گھر گھر آئینہ دکھانے کی خدمت سپرد کر دی۔ خیر وہ تو بڑے بڑے آئینہ خانہ ہیں۔ میں بھی انھیں آئینہ خانوں میں ہر ایک ریزہ لایا اور اس کی تراش خراش کر کے آئینہ آرسی کی صورت میں ڈھالا۔ اس سے بڑھ کر کیا قدر ہوگی۔ آپ پسند فرمائیں تو در پر کسی کی رونمائی کے لئے بھیج دوں۔"

حضرت امیر مینائی

حضرت امیر مینائی جو قدیم دبستان شاعری میں اپنے عصر کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ مہاراجہ آنجہانی کے بڑے کرم فرما بزرگ تھے گو انہوں نے پہلے حضرت آصف جاہ سادس نواب میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکاں کے دربار میں رسائی کی لیکن آنجہانی کی عنایت بھی امیر کے شامل حال رہی اور امیر کے تعلقات آنجہانی سے عرصہ تک قائم رہے۔

امیر مینائی نے مہاراجہ آنجہانی کی علمی قدردانی کے مدنظر فرمایا تھا "گلزار دکن ہیں گل شاداب ہیں شاد"

حضرت آصف

حضرت آصف کی شاعری داغ کی اتباع میں لکھنے والوں میں ایک ممتاز اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت آصف کی شاہانہ سرپرستی ہی نے حضرت شاد کو شعری کاوشوں اور علمی سرپرستیوں کی طرف راغب کیا۔ تعلقات کا ذکر تحصیل حاصل ہے اس سے زیادہ کیا ہو کہ ابتدائی تربیت تک حضرت غفران مکاں کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور پھر ایک عرصہ تک تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ شاد لکھتے ہیں۔ "ہزار ہزار شکر ہے کہ سرکار ابد قرار نے اس ناچیز کو جو خانہ زاد ہستی اور نمک خوار قدیمی اور جان نثار ازلی ہے۔ اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔ منہ مانگی مراد پائی۔ آرزو بر آئی ؎

الٰہی فضل ترا کس قدر ہے کہ میں سجدہ کروں کعبہ کدھر ہے

شاگردی بھی ملی اس شان کے ساتھ کہ تمام عالم پر وہ شرف مثل آفتاب نصف النہار آشکار ہو جائے اور خانہ زاد بجز تلمیذ آصف کے اور کسی نام سے نہ پکارا جائے۔ نہ تحریر میں آئے۔ سبحان اللہ۔ ع

اے تری قدرت کے صدقے میں تو اس قابل نہ تھا

عظمت اللہ خاں عظمت عظمت اللہ خاں مرحوم اُردو کے آزاد فکر شعرا میں ہیں جن کی نفیس طبیعت، اعلیٰ کردار اور علمی و ادبی ذوق ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ عظمت نے بلاشبہ اُردو شاعری میں ہندی بحروں کا ترنم پیدا کر کے ایک نئی چیز پیدا کی ہے۔ آنجہانی اور عظمت اللہ خاں مرحوم میں خوب گاڑھی چھنا کرتی تھی۔ گو ان کی مراسلت موجود نہیں ہے مگر آنجہانی کی بعض تصانیف میں عظمت کا ذکر موجود ہے۔ نیز ان کے دربار تک رسائی رکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ مہاراجہ بہادر سے ان کے بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ عظمت سے ملاقات اور خوشگوار تعلق کے اظہار کے لئے کسی اسناد کی یوں بھی ضرورت نہیں کہ عظمت حیدرآباد کا درخشندہ ستارہ تھا اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ آنجہانی کا دربار شعرا اور ادیبوں کا آسمان بھی یہ کیونکر ممکن تھا کہ عظمت حیدرآباد میں ہونے کے باوجود مہاراجہ آنجہانی کے دربار فیض آثار سے محروم رہتے۔

آنجہانی کے تعلقات عصر حاضر کے شعراء سے

علامہ اقبال مہاراجہ آنجہانی کے سفرنامہ "سیر پنجاب"[1] سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ آنجہانی کو علامہ اقبال سے تعارف حاصل ہوا۔ اور اسی زمانہ سے دونوں میں خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے۔ مہاراجہ اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں۔

"۵ بجے شام کے میرے دوست ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا آئے بہت دیر تک لطف صحبت رہی۔ بڑے مزے کے آدمی ہیں خدا زندہ رکھے۔"

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"نو بجے پھر ڈاکٹر محمد اقبال آئے۔ اُن کے اصرار سے مع دو مصاحبوں کے آغا حشر کاشمیری کے تھیٹر میں گیا۔"

---

[1] سیر پنجاب صفحہ ۹۱

اس تعلق کے بعد آپس میں ایک عرصہ تک مراسلت ہوتی رہی مگر افسوس ہے کہ وہ مراسلت ناپید ہے۔ مگر یہ باور کرنے کے کئی ذرائع موجود ہیں کہ ان میں بیحد خوشگوار محبت تھی۔ علامہ اقبال جب ۱۹۲۸ء اور ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد رونق افروز ہوئے تو اپنے تاثرات کو "شکریہ" کے عنوان سے ایک مرصع نظم میں ظاہر فرمایا ہے۔ اور ابتداءً چند سطریں نثر میں لکھی ہیں۔ جس سے آپ کے تاثرات کا اظہار ہوتا ہے۔

"گزشتہ مارچ میں مجھے حیدرآباد دکن جانے کا اتفاق ہوا۔ اور وہاں آستانۂ وزارت پر حاضر ہونے اور عالیجناب ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد جی۔سی۔آئی۔ای۔یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم دولت آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمت بابرکت میں باریاب ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز اکسلنسی کے نوازش کریمانہ اور وسعت اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا وہ میرے لوح دل سے کبھی نہیں مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگی حیدرآباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا اور چند[1] اشعار اس عنایت نامہ کے شکریہ میں زبان پر بے اختیار آگئے انہیں زبان قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں۔" اس موقع پر "شکریہ" کے آخری دو شعر دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے ؎

نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا　　محو کر سکتا نہیں جس کو مرور روزگار
شکریہ احسان کا اے اقبال لازم تھا مجھے　　مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

آنجہانی نے اسی زمانے میں اپنے تاثرات کو جب کہ آپ ۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء کو علامہ اقبال کی تقریر[2] کے سلسلہ میں ٹون ہال باغ عامہ کے جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے۔ فرماتے ہیں۔

---

[1] اور چند کے بجائے اس کتاب میں ذیل کے الفاظ لکھتے ہیں۔　　[2] جامعہ عثمانیہ کی توسیعی تقریر بزمانہ ۱۹۲۹ء

"جامعہ عثمانیہ کی دعوت پر سر محمد اقبال کی عالمانہ تقاریر کے سلسلہ میں پہلے لکچر کی صدارت میرے لئے ایک نہایت خوشگوار فریضہ ہے۔ اس موقع پر صدارت کا فریضہ میرے لئے آسان یوں ہو گیا ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے تعارف کی اس لئے ضرورت نہیں کہ اس ملک کا ہر کوئی آپ سے واقف ہے۔ آپ کے کلام سے اس مجمع کا ہر فرد اپنی استعداد اور ذوق کی مناسبت سے قدر دان ہے۔ آپ کی ذات تعارف سے مستغنی اور آپ کا کلام ستائش سے بالاتر ہے ڈاکٹر اقبال کے ذکر کے ساتھ ہی ان کے تصنیفات کے انمول اور وسیع گنجینوں کا ایک بے بالا خزانہ تصور میں پیش نظر ہو جاتا ہے کہ عرض کلام سے گذر کر جو ہر بیان میں فکر سخن و رغلطان و پیچاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال جس مقصد حیات کو اپنے علم و عمل کو پورا کر رہے ہیں وہ انسانی ترقی کو دنیا کے لئے سودمند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا واسطہ بنانا ہے۔ ڈاکٹر اقبال تصوف اور عرفان کے آغوش میں پلکر حکیم ہوتے ہیں۔ اور ان کے حکیمانہ تعلیمات سے ہم سب کو یکساں مستفید ہونے کا اب بالمشافہ موقع ملا۔ جس کی ہم عزت اور قدر کرتے ہیں۔ اور یقین رکھتے ہیں کہ اس مجمع کا ہر برنا و پیر اپنے معلومات میں قابل قدر اضافہ حاصل کرے گا۔"

جنوری ۱۹۳۸ء میں بھی جب علامہ اقبال کی زندگی میں "یوم اقبال" منایا گیا تھا تو آنجہانی۔ ایک اجلاس کی صدارت فرماتے ہوئے اپنے تعلقات اور ان کے تبحر کا مخلصانہ انداز میں ذکر فرمایا تھا مجھے[1] مہاراجہ آنجہانی کے دفتر میں مختلف فہرستوں کو جو دعوت ناموں اور عید کارڈوں کے بھیجنے سے متعلق تھے، دیکھنے کا موقع ملا۔ آنجہانی ہر عید کے موقع پر علامہ اقبال کی خدمت میں ایک کارڈ روانہ کیا کرتے تھے جس سے آپ کے وسیع تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

فانی بدایونی

محمد شوکت علی خاں فانی عصر حاضر کے اُن غزل گو شعراء میں ہیں جن کا کلام جذبات کی مصوری، تخیل کی بلندی و مشاہدات و واردات کی نزاکتوں سے مملو ہے۔ فانی دربار شاد کے خاص شعراء میں تھے۔ جن کو آنجہانی بہت عزیز رکھا کرتے تھے۔ غالبا

[1] راقم الحروف۔

۱۹۲۰ء کی ملاقات کے بعد آنجہانی کی موت تک فانی سے نہایت درجہ ربط و ضبط رہا یہاں تک کہ ایوان شادؔ کے ہر مشاعرہ میں فانی موجود رہا کرتے تھے۔ جب فانیؔ نے اپنا دیوان مرتب کیا تو حضرت شادؔ نے اس کی تاریخ نکالی تھی " اسماء دیوان فانی باقیات الصالحات" کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ آنجہانی اپنے جیب خاص سے فانی کو ہر مہینہ کچھ سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ حضرت فانیؔ نے آنجہانی کی جدائی کے تصورات کو اپنے شگفتہ انداز میں نظم فرمایا ہے جو "نگار" کے صفحوں پر زیور طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی حسن شباب اور عالم سرمستی کی سحر طرازی میں خاص اہمیت کے مالک ہیں۔ جوش ملیح آبادی دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ تالیف و ترجمہ میں ادبی نقاد کے عہدہ پر یک عرصہ دراز تک مامور رہ چکے ہیں۔

جوشؔ سے آنجہانی کے تعلقات کب سے قائم ہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ مراسلات سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ملاقات تھی۔ ان کے مکتوبات سے ان کے تعلقات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے جوشؔ لکھتے ہیں

"سرکار والا تبار مدظلہ العالی۔ تسلیم مع التکریم" بنیا ۲۲ء

" افسوس کہ میں اس سے قبل عریضہ لکھ سکا۔ کوئی خاص سبب عرض نہیں کر سکتا۔ بجز انتشار طبع کے۔ جو اب حزن و ملیات بن کر رہ گیا ہے اور جس نے کسی کام کے قابل نہیں رکھا ہے۔

سرکار کا مزاج کیسا ہے۔ جو صاحبزادی کی طبیعت دشمنان نا ساز تھی خدا کرے کہ اب صحت ہو چکی ہو۔ امید کہ سرکار اپنی خیریت سے مع متعلقین بہ جلد مطلع و مجھے ممنون ہونے کا موقع دیں گے۔

اپنی خیریت کیا لکھوں۔ اگر یہی خیر و عافیت کوئی معنی رکھ سکتی ہے تو اچھا ہوں۔

خدا کا شکر ہے"

آنجہانی جواب عنایت فرماتے ہیں۔

"مہربان ہوش جوشؔ" ۲۵ ردسے ۱۳۴۲ف

"آپ کا خط پہونچا۔ یاد آوری سے شاد شاد کام ہیں۔ آپ نے اس سے پہلے

اپنے خط نہ لکھنے کا سبب انتشار طبع بتایا ہے۔ شاد بادل شاد تسلیم کرتا ہے مگر اس کے بعد یہی کہتا ہے۔

کارساز تو بہ ساز کار تو فکر نواز کار تو آواز تو

آخر میں قضا و قدر سے متعلق ایک طویل بحث فرمائی ہے جس کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

حیدرآباد کے قیام تک جوش بھی ہر مشاعرہ میں شرکت کیا کرتے تھے اور مہاراجہ کے عزیز شعرا میں گنے جاتے تھے۔

حضرت فصاحت جنگ جلیل حضرت جلیل غزل گو شعرا میں اپنے خاص اسالیب کی وجہ ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ جلیل کی غزلیں اتنی عام فہم ہوتی ہیں کہ ہر محفل سرود میں اکثر وبیشتر گائی جاتی ہیں۔ ابتداً شاد اپنا اردو کلام جلیل ہی کو بتایا کرتے تھے۔ اور وہ ایک زمانہ تک مہاراجہ آنجہانی کے دربار فیض سے مستفیض بھی رہے ہیں۔ حضرت جلیل کے تعلقات کا اندازہ اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ وہ ابتدا میں آنجہانی کے استاد رہ چکے ہیں۔

نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کلام عزیز کی سب سے اہم خصوصیت زبان دہلی کی پابندی اور استواری و فاداری ہے۔ عزیز داغ سے بیحد متاثر ہیں اس لئے قدیم اساتذہ کی طرح مسلسل و مربوط غزلیں لکھا کرتے ہیں۔ آنجہانی کے مشاعروں میں شرکت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بزم شاد کے نسخوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ہر محفل مشاعرہ میں اپنے کلام کو سنایا کرتے تھے اور حضرت شاد سے انہیں بڑی عقیدت تھی۔

منظور حسین ماہر القادری ماہر اردو شاعری کے موجودہ دور میں ایک بلند فکر نوجوان شاعر ہیں۔ ماہر اقبال کے طرز تفکر سے بیحد متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کی بعض نظموں اور غزلوں میں اقبال کا انداز صاف نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ حضرت شاد ماہر کو بہت عزیز رکھا کرتے تھے۔ آخری زمانہ میں (یعنی ۱۹۲۸ء میں) ان سے تعارف ہوا اور جب وہ حیدرآباد ہی میں مقیم ہو گئے تو روزانہ وہ حضرت شاد کی صحبتوں میں شریک رہا کرتے اور مہاراجہ کے مشاعروں میں

اکثر شریک ہوتے اور اپنے کلام کی داد حاصل کرتے تھے۔ ماہر پر آنجہانی کی نوازشیں اکثر شاملِ حال رہی ہیں۔ سنتے ہیں کہ شاد انہیں بھی اپنے جیب خاص سے کچھ سرفراز کرتے تھے۔ آنجہانی ان کے کلام کی بے حد قدر کیا کرتے تھے۔ ماہر نے آنجہانی کے فیضِ صحبت کے تاثرات کو ستمبر کے ساقی[1] میں ظاہر فرمایا ہے۔ ان دونوں میں مراسلت بھی ہوا کرتی تھی۔ جن کے تاثرات کی جھلک اس مضمون میں موجود ہے۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی حضرت شاد کے اسٹیٹ سے آغا شاعر قزلباش دہلوی کو ماہانہ مشاہرہ مقرر تھا اور یہ دربار شاد میں اکثر مدعو کئے جاتے تھے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے ساتھ خوشگوار تعلق رہا۔ لکھتے ہیں۔

"سرکار معظم۔ قدر دان نقد سخن مدظلہٗ العالی"

"تسلیم بصد تکریم۔ اک عرصہ سے صحت و ری مزاج کے مژدہ سے محروم ہوں"

مہاراجہ کا جواب۔

"بخدمت جناب آغا صاحب قزلباش۔"

"آپ کا خط ملا" اور آخر میں لکھتے ہیں۔ "آفتاب[2] آج کل کس برج میں ہے۔ شاید گہن میں آگیا بہت دن سے یہ رسالہ نہیں آیا۔"

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کیفی جب حیدرآباد تشریف لائے تھے تو آنجہانی نے ان کی صدارت میں ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا اور اس کے بعد ان سے دوستانہ تعلقات ہوگئے اور کچھ دنوں مراسلت بھی ہوتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ آنجہانی سے کچھ زیادہ دنوں تک تعلق نہیں رہا۔ مگر آنجہانی کیفی کی قدر فرمایا کرتے تھے۔

یوں تو حضرت شاد کا دربار شعراء سے معمور رہتا تھا جن میں ضیا یار جنگ ضیا، تراب یار جنگ سعید، اصغر یار جنگ اصغر، آغا محمد علی خاں داعی الاسلام، مہدی حسین آلم، مسعود علی محوی، عبداللہ العمادی، حبیب الدین صغیر، اکرام الدین خاں اکرام، وحید الدین خاں وحید، عبدالصمد آصفی، کاظم علی باغ، نثار یار جنگ مزاج، سید صادق حسین ضیا، نظیر حسین سخا، منشی کریم الدین برق، نصیر حسین خان خیال

[1] ہندوستان کا ایک ماہوار رسالہ [2] آفتاب ایک رسالہ نکلتا تھا جسکے آغا قزلباش اڈیٹر تھے۔

خیال، لبیب، مرزا واجد حسین یکتا وغیرہ شامل ہیں۔

ان کے علاوہ جگر مراد آبادی، ابو الاثر حفیظ جالندھری وغیرہ سے کوئی وسیع تعلقات نہ تھے مگر تعارف ضرور تھا اور آنجہانی نے انھیں حیدرآباد میں آنے پر مدعو فرمایا تھا۔

آنجہانی کے تعلقات عصر حاضر کے مشہور ادیبوں سے

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" ادبی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ کی خدمات بحیثیت رکن دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کو بھی حاصل رہی ہیں۔ مہاراجہ اور ماجد دریابادی کے تعلقات کوئی مسلسل بائیس سال تک قائم رہے۔ ۱۹۱۹ء کے چند مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو عزیز رکھتے تھے ان کے تعلقات کا اندازہ ذیل کے خط سے بھی بآسانی کیا جاسکتا ہے۔

"ماجد نواز حضرت شاد" "کل تار بابت تہنیت ولادت دختر موصول ہوکر ماجد کی سرفرازی و عزت افزائی کا باعث ہوا۔ یہی ذرہ نوازی و اخلاص پروری شاد کی حقیقی عظمت کا قطعی ثبوت ہے۔"

حضرت شاد جواب ارشاد فرماتے ہیں۔

"شاد نواز" "مودت نامہ موجب فرحت و انبساط ہوا۔ دو نعتیہ نظمیں ایصال کیجاتی ہیں۔ اگر پسند خاطر ہوں تو رسالے کے کسی صفحہ پر جگہ دیجئے۔ یقین ہے کہ آپ مع الخیر ہونگے"

نیاز فتح پوری حضرت ہوش بلگرامی کے توسط سے ۱۹۱۸ء میں پہلی مرتبہ نیاز کو تعارف کی عزت حاصل ہوئی اور اسکے بعد ان کے باہمی تعلقات اس قدر بڑھ گئے کہ ایک عرصہ دراز تک مراسلت ہوا کرتی تھی زندگی تک جب کبھی نیاز حیدرآباد آتے تو دربار شاد سے مشرف ہوئے بغیر نہ لوٹتے تھے۔ ان کے خطوط دفتر شاد میں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ تعلقات کے

اظہار کے لئے صرف ایک خط کا نمونہ دیا جاتا ہے۔

"مطاعی الاعزاز ادامک اللہ بالخیر و الاقبال"

"اس سے قبل میرے دو عریضوں کا جواب نہیں ملا۔ چونکہ جناب کے الطاف نے گستاخ کر دیا ہے۔ اس لئے پھر یاد دہانی کی جرأت کرتا ہوں۔ مزاج گرامی کی خیریت سے کبھی کبھی مطلع فرماتے رہیے کہ عرصہ تک حالات نہ معلوم ہونے سے دل کو نگرانی رہتی ہے۔"

حضرت شاد نیاز کو یوں یاد فرماتے ہیں کہ

"نیاز شاد نواز"

"محبت نامہ افزودہ ... وصول ہوا موجب از دیاد مسرت ہوا" آخر پر لکھتے ہیں "امید کہ آپ مع الخیر ہونگے"

خواجہ حسن نظامی مصور فطرت خواجہ حسن نظامی مہاراجہ بہادر کے قابل احترام ہستیوں میں سے ہیں۔ مہاراجہ آنجہانی نے ۱۹۱۱ء میں جب دہلی میں "دہلی دربار" منعقد ہوا تھا ان سے ملاقات کی تھی اور یہی ان کی شناسائی کا پہلا موقع تھا۔ آنجہانی حضرت خواجہ حسن نظامی کی بہت قدر و منزلت کیا کرتے تھے۔ مہاراجہ نے بقید حیات رہنے تک مرشدانہ تعلق رکھے۔ آپ جب کبھی خواجہ صاحب کو مخاطب فرماتے تو "حضرت قبلۂ حاجات" سے خطاب کیا کرتے تھے۔ اور حضرت خواجہ حسن نظامی آپ کو "ہماری شاہ" کے نام سے۔ جب کبھی خواجہ حسن نظامی حیدرآباد آتے تو وہ آنجہانی کے خاص مہمان رہا کرتے تھے۔ غالباً موصوف آنجہانی کے مرشد بھی ہیں۔ ان کے تعلقات یوں بھی بہت عام اور زباں زد خاص و عام ہیں۔ جن کا ذکر باعث تطویل ہے۔

مولانا ظفر علی خاں ظفر مولانا ظفر علی خاں ظفر سے بھی یک عرصہ دراز تک نیاز حاصل رہا۔ چنانچہ مولانا جب "ستارہ صبح" نکالا کرتے تو مہاراجہ کی نظمیں اس میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ ۱۳۳۲ف میں ان سے باقاعدہ خط و کتابت ہوتی تھی۔ ان کے تعلقات ذیل کے دو مکتوب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

"عالی جناب"

رقعہ دعوت ابلاغ خدمت ہے۔ سرکار نے نظم تو لکھ دی ہوگی۔ جو یقیناً اہل جلسہ کے لئے قوت روح ثابت ہوگی۔"

جواب　"مہربان شاد"

"اٹ ہوم کا رقعہ پہنچا۔ اس مبارک تقریب میں شریک ہونا صرف سعادت ہی نہیں ہے بلکہ شاد اس کو بھی اپنی ڈیوٹی سمجھتا ہے۔"

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں وہ اکثر آنجہانی کے دربار میں شریک صحبت رہا کرتے تھے اور خوب گزرتی تھی۔

مولانا تاجور نجیب آبادی تاجور اور آنجہانی کی مراسلت سے پتہ چلتا ہے کہ تاجور نجیب آبادی کی ملاقات ۳۳ء میں کسی کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں ہوئی اور اس کے بعد راہ و رسم بڑھنے لگے۔ اور کچھ عرصہ تک تاجور سے خط و کتابت جاری رہی اور تاجور کے زیر نگرانی غالباً سیر پنجاب تیار ہوئی ہے۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی۔ اے مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اردو کو حضرت شاد سے کوئی تیس برس پہلے سے تعارف حاصل تھا۔ اور مولوی صاحب معز کو آنجہانی ہمیشہ "مولوی عبدالحق یا مولوی صاحب" سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ گو ان کی مراسلت باضابطہ موجود نہیں ہے مگر آنجہانی کے سپاسناموں میں جہاں کہیں مولوی صاحب کو آنجہانی نے یاد کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر عزت کیا کرتے تھے۔

آنجہانی کے اورنگ آباد تشریف آوری پر مولوی صاحب نے بحیثیت پرنسپل کلیہ سپاسنامہ پیش فرمایا تھا اس کے جواب میں مہاراجہ فرماتے ہیں۔

"مولوی صاحب! آپ نے جس جامع اور معنی خیز الفاظ میں اورنگ آباد کی خصوصیتوں کو بیان کیا ہے اس سے اورنگ آباد کی تاریخ کا مکمل مرقع نظر آگیا۔"

"اورنگ آباد میں مولوی صاحب آپ نے جو کچھ کوشش اس کالج کو کامیاب بنانے سے متعلق

کی ہے وہ نہایت لائق قدر اور قابل تحسین ہے۔ آپ نے اورنگ آباد میں علمی فضا کو قائم کرنے اور اس کی ترقی دینے میں حدود کالج سے باہر بھی جو کوشش کی ہے اُن سے اہل ملک خوب واقف۔ ور وہ اس کی قدر کرتی ہے۔ علم کی ترقی میں آپ کا وجود ظاہر و باطن میں ہندوستان کی متعدد علمی خدمات کا ذمہ دار ہے۔ خورشید آباد میں آپ کی کوششوں سے جن اداروں اور انسٹی ٹیوشنوں کو فائدہ پہونچا ہے ان کا ذکر یہاں میں غیر معمولی خیال کرتا ہوں۔ اورنگ آباد کو انجمن ترقی اردو کا مستقر قرار دیکر جو علمی رونق اور اردو کے لئے کام کرنے کی جو مرکزیت پیدا کردی ہے وہ اس شہر کے لئے مائہ ناز ہے جس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں وغیرہ"

ایک جگہ میوزیم کی افتتاح کے موقع پر یوں ستائش فرماتے ہیں کہ

"مولوی صاحب! یہ سب محض آپ کی سعی حسنہ کا نتیجہ ہے"

مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت

مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت بھی "ایوان شاد" کے خاص شعراء میں سے ایک شاعر ہیں۔ جن کی مزاحیہ انشا پردازی اپنے میں ایک انفرادیت رکھتی ہے۔ "بزم شاد" جو اُن کے شاعروں کا گلدستہ ہے ان میں حضرت فرحت کی بھی غزلیں موجود ہیں۔ جن سے آنجہانی کے خاص تعلقات کا پتا چلتا ہے۔ ۱۹۲۶ء تک نہ مہاراجہ بہادر ان سے واقف تھے نہ وہ اُن سے اتفاقی بات ہے کہ ایک مضمون کے ذریعہ[1] اُن سے تعارف ہوگیا اور جب آنجہانی کے دربار میں آئے تو عمر بھر کے رفیق بن گئے۔ سنتے ہیں کہ آپس میں دلچسپ مراسلت بھی ہوتی تھی مگر دفتر اس مواد سے خالی ہے۔ مگر آنجہانی کی ظرافت طبع سے فرحت کا میلان خوب لگا کھاتا ہے اس وجہ سے بھی یہ خیال کرنا کہ دونوں میں خوشگوار تعلق تھا کچھ بیجا نہ ہوگا

سر تیج بہادر سپرو

سپرو کی باضابطہ مراسلت کا کوئی پتہ نہ چل سکا البتہ ان کے مشیر ان خاص اور معتمد[2] صاحب خانگی سے صرف اس قدر معلوم ہو سکا کہ آپس میں خط و کتابت ہوتی تھی اور یوں بھی سپرو آنجہانی کے کئی دفعہ مہمان خاص رہ چکے ہیں۔ اس طرح دونوں میں کسی نہ کسی طرح تعلق ضرور تھا۔ اُردو سے دونوں کی بے انتہا محبت بھی وجہ اُنس ہو سکتی ہے

حضرت ہوش بلگرامی

جناب ناظر الحسن ہوش بلگرامی نے ستائیس سال قبل آنجہانی سے تعارف کی عزت حاصل کی تھی۔ رفتہ رفتہ تعلقات استوار ہوگئے ۱۹۱۹ء میں

[1] رسالۂ اُردو ۱۹۲۶ء   [2] علمبردار حسین صاحب

جیسے "ہوش رسالہ" وغیرہ " نکالا کرتے تھے اُن پر آنجہانی کی عنایت شامل حال ہوا کرتی تھی ۔ یہ " ایوان شاد" یا صحیح معنوں میں "دربار شاد" کی خاص ہستی ہیں ۔ اُس زمانہ میں مہاراجہ کی بعض تصانیف ان ہی کے زیر نگرانی اور زیر اہتمام چھپی ہیں جن میں " سیر و سفر" " دین حین" قابل ذکر ہیں ۔

ہوش صاحب بلگرامی کی مراسلت سے دفتر پٹا پڑا ہے ۔ ہوش آنجہانی کو " سرکار والا" اور آنجہانی " مائی ڈیر ہوش" سے خطاب فرمایا کرتے تھے ۔ مہاراجہ بہادر کے ہر سفر نامے میں ہوش کا نام ضرور ملتا ہے ۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنجہانی ہوش پر بے انتہا نظر التفات رکھتے تھے ۔

مولانا سید سلیمان ندوی ہوش کے توسط سے مولانا سید سلیمان ندوی کا تعارف ہوا ۔ یوں تو بارہا ہوش نے اپنے بھوپال کے قیام کے زمانہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے مگر ندوی کی انگلستان سے واپسی کے بعد جب وہ حیدرآباد تشریف لائے ہیں تو ہوش کبھی کے یہاں آچکے تھے اور پہلی بار تعارف حاصل ہوا تھا ۔ آنجہانی سید صاحب کی بہت قدر کرنے لگے تھے ۔ مہاراجہ کو آپ کے تحقیقی مضامین سے بڑی دلچسپی تھی ۔ میں نے آنجہانی کے ایک مضمون کو جو غیر مطبوعہ ہے دیکھا جس میں سید صاحب کی تعریف کی گئی ہے ۔ اور اپنے مختصر تعلق کو واضح کیا ہے ۔

سر شیخ عبدالقادر سر شیخ عبدالقادر جب پہلی دفعہ حیدرآباد تشریف فرما ہوئے تھے تو آنجہانی نے دعوت سے سرفراز فرمایا اور اُسی دلچسپ صحبت نے تعلقات بڑھادے تھے سر شیخ عبدالقادر بھی آنجہانی سے متعارف نہ تھے مگر مہاراجہ کی صفات حسنہ سے وہ غائبانہ طور پر متاثر تھے اور وہ بڑی عزت کیا کرتے تھے چنانچہ جس وقت علامہ اقبال نے مہاراجہ کی خدمت میں "شکریہ" روانہ فرمایا ہے تو اس کی تمہید لکھتے ہوئے فرماتے ہیں

> "دکن کے علم دوست اور ہنر پرور وزیر اعظم کی اس خوبی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے کہ اہل علم کی قدر دانی ان کا شیوہ ہے اور مشاغل علمی سے انہیں شغف ہے ۔"

حضرت اقبال علیہ الرحمہ کے انتقال کے بعد جب آپ سالگرہ کے موقع پر تشریف فرما تھے تو آنجہانی نے مدعو فرمایا تھا ۔ وہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے ۔

لے راقم الحروف ۔

ان کا دربار خاص و عام کے لئے عام تھا۔ اور کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ جو کوئی حاضر دربار ہوتا نہایت خندہ پیشانی سے ملتے اور امداد کا اُمیدوار ہوتا تو حتی المقدور امداد سے دریغ نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہر شخص اس دربار سے ناکام واپس نہ ہوتا تھا۔ سب سے بڑی چیز یہ کہ علم کی قدردانی اور علما کی سرپرستی ان کا شعار زندگی رہا۔ اس لئے ہر عالم دربار شادین حاضر ہو کر وہ سب کچھ حاصل کرتا جو اس کی تمنا ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ جوہر شناس اور ربّاض علم بھی تھے۔

اس بیان کی تلافی یوں ہوسکے گی کہ سرشار، داغ، امیر اپنے اپنے زمانہ میں مہاراجہ بہادر کی قدردانیوں کا پھل پا چکے ہیں اور زندگی تک جلیل، اختر، محوی، ثاقب، ہوش، غبار، بیگم اس دربار سے برابر مستفید ہوتے رہے ہیں اس کے علاوہ شمال سے جتنے ادیب و شاعر بھی دکن آئے وہ سب کے سب آنجہانی کے مورد عنایت رہے۔

مہاراجہ بہادر خوش اخلاقی اور مروت میں اپنی آپ نظیر تھے۔ جس سے ملک کا ہر بچہ بچہ واقف ہے۔ انہیں مذکورۂ بالا خصوصیات کے امتزاج نے ایوان شادمیں کچھ ایسی "عالی مقناطیسیت" پیدا کر دی تھی کہ ہر عالم شاد کے "ایوان شاد" میں خود بخود کھنچا چلا آتا اور شاد کام لوٹتا تھا۔ اور جو ایک دفعہ آچکتا تو اس کے قلب و دماغ پر اس غیر معمولی صحبت کے ایسے نقوش مرتسم ہو جاتے کہ وہ ہر صحبت میں شرکت کی تمنا رکھتا تھا۔ گو مہاراجہ بہادر اب ہم میں نہیں ہیں مگر ان کی علم دوستی ہمیشہ انہیں زندہ رکھے گی۔

محمد مصلح الدین (عثمانیہ)
متعلم سال دوم (کلیہ بلدہ)

تو مجسم خیر تھا انساں عبارت تجھ سے تھی

"یہ میری آنکھوں سے بے اختیار ٹپک جانے والے آنسو اور میرے دل سے بے ساختہ نکلی ہوئی آہیں ہیں جو نظم ہو گئیں"

"فانی"

اے مہاراجہ بہادر اے یمین السلطنت
تو مجسم خیر تھا۔ انساں عبارت تجھ سے تھی

اب کہاں رسم مروت اور کہاں ہندوستان
آج بھی باقی یہاں رسم مروت تجھ سے تھی

اس زمانے میں کہ ہے معیار عزت سیم و سنگ
بینوائی میں بھی ہم جیسوں کی عزت تجھ سے تھی

جس شرافت کی اداؤں پر رہا مشرق کو ناز
اُٹھ گئی اب وہ شرافت۔ وہ شرافت تجھ سے تھی

بزم ارباب ادب اجڑی ہوئی محفل ہے آج
بزم ارباب ادب کی ساری زینت تجھ سے تھی

زندہ رکھا تھا سخاوت نے تو خود حاتم کا نام
اور تیرے دور میں زندہ سخاوت تجھ سے تھی

دل سے تیری یاد ہرگز محو ہو سکتی نہیں
اب بھی فانی کو وہی ہے کل جو نسبت تجھ سے تھی

فانی بدایونی

مہاراجہ بہادر آنجہانی کی ملکی و سیاسی خدمات

"اس مضمون پر پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی نے انعام اول عطا فرمایا ہے"   "ادارہ"

ہز اکسلنسی یمین السلطنت کے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای، راجہ راجایان مہاراجہ کرشن پرشاد بہادر آنجہانی کا سلسلۂ نسب دربار اکبری کے اس نورتن راجہ ٹوڈرمل سے ملتا ہے جس پر اکبر کو ناز تھا۔ راجہ ٹوڈرمل کی پانچویں پشت میں رائے مل چند تھے۔ یہ نواب نظام الملک کے ہمراہ دکن آئے اور کروڑگیری و آبکاری کے ناظم مقرر ہوئے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے رائے لکشمی رام کو ان کی جگہ ملی۔ رائے لکشمی رام کے دو بیٹے تھے رائے نانک رام اور رائے نارائن داس۔ رائے نانک رام نے والد کے انتقال پر ان کی جگہ لی۔ رائے نارائن داس کے دو بیٹے تھے۔ ایک چندولال دوسرے گوبندبخش۔ مہاراجہ چندولال ۱۱۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ اور اسی سال ان کے والد کا انتقال ہوا۔ ان دو بھائیوں کی پرورش رائے

نانک رام نے کی۔

مہاراجہ چندو لال پہلے پہل اپنے چچا کے تحت کام کرتے رہے بعد میں ان کو خود آبکاری و کروڑگیری کا ناظم اور چند جنوب مغربی اضلاع کا حاکم بنا دیا گیا۔ ۱۷۹۶ء میں انہوں نے اس عہدہ سے استعفیٰ دیدیا اور بلاری و کڑپا کے حاکم مقرر ہوئے۔ جب میر عالم وزیر اعظم ہوئے تو مہاراجہ چندو لال کو اپنا مشیر خاص بنا لیا ۱۸۰۶ء میں وہ وزیر مالیہ اور پیشکار بنا دئے گئے۔ اور ۱۸۰۸ء میں میر عالم کی وفات پر وہ نظم و نسق کے مختار بن گئے۔ گو نواب منیر الملک بہادر وزیر اعظم تھے لیکن عملاً تمام کام چندو لال ہی کے ہاتھوں انجام پاتے تھے اور اس وقت سے ۱۸۴۳ء تک جب کہ انہوں نے خود اپنی خدمات کا استعفیٰ دیدیا کامل ۳۵ سال پورے ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ ۱۵ اپریل ۱۸۴۵ء کو مہاراجہ چندو لال کا انتقال ہوا۔

مہاراجہ چندو لال کے بڑے بیٹے بالا پرشاد ۱۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے۔ چونکہ کمسنی ہی سے والد کو اکثر معاملات میں مشورہ دیا کرتے تھے۔ امور سلطنت میں خاصہ تجربہ حاصل کر چکے تھے۔ اس لئے کروڑگیری و آبکاری کے ناظم بنا دئے گئے۔ لیکن آپ نے جلد استعفیٰ دیدیا۔ پھر آپ کو پیشکاری کا عہدہ دیا گیا اور آخر زمانہ میں "راجہ دھیراج بہادر" کے خطاب اور پانچ ہزار کے منصب اور چار ہزار سوار و فوج کے ساتھ سرفراز فرمایا گیا۔ مہاراجہ نارائن پرشاد نریندر بہادر انہی بالا پرشاد کے بیٹے تھے جو ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳ جون ۱۸۵۳ء کو پیشکاری کے عہدہ سے سرفراز ہوئے ۱۲۷۱ھ میں آپ کو "راجہ رایاں" کا خطاب ملا۔ پھر "نریندر بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ زمانہ غدر میں آپ کی خدمات کے صلہ میں برطانوی حکومت نے آپ کو ایک تمغہ انعام دیا۔ آپ کا انتقال ۱۴ رمضان ۱۳۰۰ھ کو ہوا۔ آپ کی صرف ایک ہی لڑکی تھی۔

اسی لڑکی کے بطن سے مہاراجہ کشن پرشاد بہادر پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت سنہ ۱۸۶۴ء م ۱۸ رشعبان سنہ ۱۲۸۰ھ ہے۔ مہاراجہ نریندر بہادر نے آپ کی تعلیم و تربیت کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ عربی، فارسی اور مختلف علوم و فنون خاص خاص استادوں کے ذریعہ سکھائے گئے۔

ابتدائی خدمات

جب آپ کا شعور ترقی کر گیا تو آپ نے اپنے جاگیر کی نظم و نسق کی طرف توجہ کی، جو آپ کو نانا کی طرف سے ورثہ میں ملی تھی آپ کی عمر ابھی گیارہ سال ہی کی تھی کہ دربار سالگرہ کے موقع پر ۱۲۹۱ھ میں "راجہ بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۳۱۱ھ میں موروثی خدمت پیشکاری سے سرفراز ہوئے۔ اور ۱۳۱۱ھ میں "راجہ راجایاں مہاراجہ بہادر" کے خطاب سے ممتاز کیا گیا۔ اور ۱۸۹۳ء میں معین المہامی یعنی وزارت افواج کی خدمت پر مامور ہوئے۔ آپ نے افواج کی از سر نو تنظیم اور اصلاح کی۔

مدار المہامی

اعلیٰ حضرت مرحوم آپ کی کارگزاریوں سے بہت خوش تھے[1]۔ ۲۵ ر اگست ۱۹۰۱ء کو جب سر وقار الامراء مرحوم نے رخصت حاصل کی تو مہاراجہ کی قدر دانی فرما کر آپ ہی کو منصرم مدار المہام مقرر کیا گیا۔ اور پھر ۱۵ ر نومبر ۱۹۰۲ء م ۱۵ ر شعبان ۱۳۲۰ھ کو خلوت مبارک میں اعلیٰ حضرت نے ایک عظیم الشان دربار منعقد فرما کر مہاراجہ بہادر کو بالاستقلال مدار المہامی کے عہدہ جلیلہ سے سرفراز فرمایا اور ۱۹ ر شعبان ۱۳۲۰ھ کو اسی استقلال کی نسبت فرمان خسروی شرف صدور لایا جس کی نقل حسب ذیل ہے[2]۔

"اب تک جس خوبی و صداقت و لیاقت کے ساتھ آپ عہدہ جلیلہ مدار المہامی کے اہم فرائض ادا کرتے رہے اس سے مجھے کامل اطمینان ہو گیا کہ آپ آیندہ بھی ایسا ہی بلکہ اس سے بہتر اہم فرائض کو ادا کرتے رہکر مری خوشنودی کے اپنے کو ہمیشہ مورد بنلاتے رہینگے۔ لہٰذا اب میں آپ کو مری ریاست کے عہدہ مدار المہامی پر باضابطہ طور سے مستقل کیا چاہتا

---

[1] اس خوشی کا اظہار غفران مکانؒ نے متعدد تقریروں و تحریروں میں بھی فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"مخلوق نہ کیوں چین سے سوئے آصف — جب شاہ خبردار ہو بیدار ہو وزیر"

جب شاہ کو ملجائے رضی کا وزیر — ملتا ہے جبھی تو حکمرانی کا مزا"

[2] دار آصف۔

ہوں اور بالکل یقین کے ساتھ امید کرتا ہوں کہ آپ اس کا شکریہ صدق و فاداری کے ساتھ میری ریاست و رعایا کی ترقی و بہبودی کے کاموں میں مصروف رہکر ہمیشہ ادا کرتے رہینگے"۔

مدار المہامی پر فائز ہونے کے بعد آپ کی خدمت کا اعتراف حکومت حیدرآباد اور حکومت ہندو، نوں نے کیا۔ یکم جنوری سنہ ۱۹۰۳ء کو برطانوی حکومت نے آپ کو کے۔سی۔آئی۔ای[1] کا خطاب دیا۔ اس کے بعد ۱۱ ذیحجہ سنہ ۱۳۲۲ھ کو دربار عید الضحیٰ کے موقع پر خود محبوب دکن نے یمین السلطنت کا خطاب اور ۵ ہزاری منصب عطا کیا۔ دوسرے سال مدار المہامی کی تنخواہ میں اضافہ کرکے مہاراجہ کے نام تنخواہ دس ہزار کر دی گئی۔

بعض اہم واقعات ۱۔ لارڈ کرزن کی آمد :۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن حیدرآباد تشریف لائے۔ لارڈ کرزن کی آمد میں سیاسی اغراض پنہاں تھے۔ برار کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ لارڈ کرزن کی خواہش تھی کہ کسی طرح برار کا الحاق عمل میں آجائے۔ اور اسی مسئلہ کو جن کو پہلے حضرت غفران مکانؒ نے پیش کیا تھا اب لارڈ کرزن نے خود اٹھایا۔ اور اس کامل ایقان کے ساتھ کہ برار کسی صورت حیدرآباد کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ اس کا خود حضرت غفران مکانؒ نے اپنے ایک نوٹ میں ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

> "وائسرائے نے مجھے دوبار (منعقد دربار) کہا کہ برار کبھی مسترد نہیں کیا جاسکتا ہز ایکسلنسی نے کہا میں نہیں چاہتا کہ یور ہائنس کوئی جھوٹی امید میں رکھوں۔ میں نہایت صاف صاف کہدیتا ہوں کہ نہ صرف میری یہ پالیسی ہوگی بلکہ میرے بعد آنے والے وائسرائے کی بھی یہی ہوگی اور انگلستان کی حکومت کی بھی یہی ہوگی۔ یعنی برار کسی زمانہ میں بھی واپس نہیں دیا جاسکے گا"۔ . . . . جب برار کا واپس ملنا ناممکن ہے تو موجودہ حالت کو قائم رکھنا عقلمندی نہیں ہے یہ بہتر ہوگا کہ پٹہ پر دیدیا جائے اور سال بسال روپیہ

---

[1] Knight Commander order of the Indian Empire K. C. I. E.

(محاصل) لے لیا جائے[1]"

سلطنت کے لئے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ اقتدار اعلیٰ کا دباؤ اور ملک کا مفاد دونوں ایسے متصادم ہوتے تھے کہ مہاراجہ کی ذات ایک کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بالاخر برار دوامی پٹہ پر لکھ دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ـــــ ع ۔ "امور مملکت خویش خسرواں دانند" کے مصداق وقت کی مصلحت موقع کی نزاکت اور حالات کا یہی اقتضا تھا۔ برار کو ہمیشہ کے لئے کھو دینے کے عوض دوامی پٹہ پر لکھ دیا جا کر کم از کم سالانہ (۲۵) لاکھ کی رقم کا مملکت آصفیہ کے موازنہ میں اضافہ کرنا مہاراجہ کی مبین دانشمندی اور نیک نیتی پر دلالت کرتا ہے۔

۲۔ پرنس آف ویلز کی آمد :۔ مہاراجہ کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ آپ ہی کے عہدہ وزارت میں جارج پنجم بحیثیت پرنس آف ویلز ۱۹۰۵ء میں ہندوستان کی سیاحت کے سلسلہ میں حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ملک معظم آنجہانی نے کئی مسائل پر مہاراجہ آنجہانی کو شرف ہمکلامی بخشا اور جب واپس ہو رہے تھے تو اپنے ساتھ مہاراجہ کی گفتگو اخلاق، شخصیت اور کردار کے بہترین نقوش اور اثرات کے ساتھ لے جا رہے تھے۔ آپ نے اپنا ایک فوٹو مہاراجہ کو تحفتہً عنایت کر کے انہی دلی تاثرات واحساسات کا نہایت مسرت کے ساتھ اظہار فرمایا۔ مہاراجہ کے لئے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

۳۔ طغیانی رود موسیٰ :۔ یکم رمضان ۱۳۲۶ھ وہ منحوس تاریخ ہے جبکہ حیدرآباد میں ایک شور محشر برپا تھا۔ اور موسیٰ کی طغیانی نے طوفان نوحؑ کا نقشہ کھینچ دیا تھا۔ ہزاروں بچے یتیم کتنی عورتیں بیوہ اور سینکڑوں خانماں برباد مارے مارے پھرتے تھے۔ سنگ بستہ عمارتیں جھونپڑیاں اور محل کے محل تنکوں کی طرح بہے جاتے تھے۔ انسان کی بے بضاعتی، فلک کج رفتار کی شوخی، حسرت بھری نگاہیں، زندگی کا کھیل، انسانیت کا مذاق۔ یہ تھی مختصر سی روداد اس ہیبتناک گھڑی کی جس وقت

---

[1] مکتوب حضرت "اقدس واعلیٰ" موسومہ لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند ۱۹۲۵ء

اژدہا موسیٰ) ایک اژدہے کی طرح پیچ و تاب کھاتی ہوئی اپنا ہیبت منہ کھولے آس پاس کی ہر چیز کو بھسم کر ڈالتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں مہاراجہ بہادر نے اپنی مشہور انسانی ہمدردی اور ضرب المثل غدا ترسی کے جو نمونے صفحۂ ہستی پر چھوڑے ہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہینگے اور زبان حال سے مہاراجہ کی غم خواریوں کی سراپا اور مجسم تصویر بنے ہوئے اُس داستان غم کو سناتے رہیں گے۔ اس مصیبت کے زمانہ میں مہاراجہ نے جس عمدگی سے انتظامات کئے ہیں شاید ہی کسی مدار المہام نے اپنے زمانہ میں کئے ہوں۔ آپ نے کاموں کو تجویز ہی نہیں فرمایا بلکہ ان کو عمل میں لاکر ثابت کر دیا کہ آپ کی مدبرانہ لیاقت اور قابلیت کس درجہ بڑھی ہوئی تھی۔

سب سے پہلے تو آپ نے ان مصیبت زدگان کی سکونت کے لئے عارضی طور پر جھونپڑے اور جاڑے کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لئے کمبلوں کا انتظام فرمایا۔ پھر مختلف مقامات کا دورہ فرماکر حالات اور واقعات کو بچشم خود ملاحظہ فرمایا۔ چنانچہ ایک ہمعصر مورخ[1] نے لکھا ہے۔

"ہم نے خود دیکھا ہے کہ ہر ویران شدہ محلہ میں آپ سواری پر بھی اور پیادہ تشریف لائے ہیں اور حالات کو ملاحظہ فرماکر ان کی اصلاحیں فرمائی ہیں اور رعایا کی دلجوئی اور تالیف قلوب حقیقی طور پر کرتے رہے ہیں۔ ...... مال خانہ افضل گنج کو ملاحظہ فرماکر اس کی رپورٹ تحریر فرمائی۔ اس معائنہ کے بعد آپ نے تمام متاثرہ مقامات کا دورہ کیا اور مجسٹریٹوں کو ضروری ہدایتیں دیں۔ یکم نومبر ۱۹۰۸ء کو آپ نے محبوب گنج اور مہاراج گنج اور مختار گنج تشریف لیجاکر غلہ فروشوں سے نرخ اجناس دریافت فرماکر ان کو موجودہ نرخ سے ذرا ارزاں نرخ پر غلہ فروخت کرنے کی ہدایت فرمائی تاکہ مصیبت زدہ لوگوں کو غلہ کی گرانی باعث مزید تکلیف نہ ہونے پائے۔"

مہاراجہ نے سکندرآباد میں ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے۔

---

[1] سید محمد حسین اخلب "تاریخ طغیانی"۔

"حاضرین مجلس اردو موسی کی غیر معمولی طغیانی نے جو آفت آسمانی کی طرح نازل ہوئی

ہمارے شہر کو عام ماتم میں ڈال رکھا ہے۔ پہلی تاریخ رمضان کی گویا یوم عاشورہ تھی

...... حضور بندگان عالی نے اپنے مراحم خسروانہ سے اپنی گورنمنٹ کو

اجازت دی ہے کہ اس موقع پر جس طرح ممکن ہو عزیز رعایا کے لئے آسائش کے سامان مہیا

کئے جائیں۔ چنانچہ ریلیف ورک اور پارچہ وغیرہ کی تقسیم اچھی طرح جاری رہے۔"

اس کے علاوہ حسب فرمان بندگان عالی فراہمی چندہ کے لئے باغ عامہ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مہاراجہ نے ایک پر اثر ، دردانگیز تقریر فرمائی جو ایسی دلپذیر اور صداقت سے بھری ہوئی تھی کہ جس کو سن کر پتھر بھی موم ہو جاتا۔ ایک خطیر رقم چندہ کی وصول ہو گئی جس سے مصیبت زدوں کی امداد کی گئی۔

ملکی ترقیاں

۱۔ قانون سازی :۔ مہاراجہ کے عہد مدارالمہامی میں "مجلس وضع آئین و قوانین" میں بہت سی اصلاحات ہوئیں ——

۱۳۱۵ف میں بذریعہ ایکٹ نمبر (۱) دو اراکین کا اضافہ کیا گیا۔[1] ۱۳۲۱ف میں آزمائشی طور پر ۲ سال کے لئے غیر سرکاری اراکین کی تعداد میں تین کا اضافہ منظور ہوا۔ جن کے منجملہ ایک صفائی بلدہ کی مجلس کی جانب سے اور دو باری باری سے ہر چہار اسمات کے لوکل بورڈ کی جانب سے مقرر کئے گئے —— ۱۰ شعبان ۱۳۳۱ھ م ۱۳۲۲ف کو فرمان خسروی شرف نفاذ لایا کہ "ایک نمائندہ صرفخاص کی طرف سے بھی مجلس میں شریک رہے۔" مجلس میں اس قسم کی اصلاحات کے ساتھ ساتھ اس زمانہ میں (۳۵) قوانین منظور ہوئے اور (۸) قوانین میں ترمیمات کی گئیں[2] جو

---

[1] "مدارالمہام ان غیر سرکاری ارکان میں سے جن کا زمانہ رکنیت ختم ہو چکا ہو یا ختم ہونے والا ہو یا منجملہ ایسے اشخاص کے جو کسی مسودہ قانون کی نسبت جو کونسل میں زیر غور ہو خاص واقفیت رکھتے ہوں دو ارکان غیر معمولی کا انتخاب کر سکتے ہیں۔" (رپورٹ کمیٹی اصلاحات)

[2] ان قوانین کی فہرست "بستان آصفیہ" جلد ہفتم کے علاوہ رپورٹ کمیٹی اصلاحات ۱۳۳۲ف کے ضمیمہ ۱۰ میں بھی درج ہے۔

نظم و نسق کے مختلف شعبوں سے متعلق تھے۔ مثلاً طبابت، فوجداری، آبکاری، مالگزاری وغیرہ۔

۲۔ اصلاحات:۔ عہدہ وزارت پر فائز ہوتے ہی مہاراجہ بہادر نے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور ضروری ہدایات و نصائح سے بہرور فرمایا۔

باتباع فرمان خسروی ۱۳۱۷ف میں مشیر قانونی کا عہدہ معتمدی عدالت و کوتوالی سے علحدہ کردیا گیا۔

۱۵ اربہمن ۱۳۰۳ف محکمۂ مال معتمدی فینانس میں ضم کردیا گیا تھا۔ ۱۳۰۵ف سے صیغۂ مال کے معاملات مجلس مالگزاری سے راست سرکار کے ملاحظہ میں پیش ہوتے تھے لیکن مہاراجہ نے اپنے مدار المہامی کے زمانہ میں مجلس مالگزاری برخواست کرکے مال کی علحدہ معتمدی قائم کی مالیات کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ مسٹر کیاسن واکر کا جو اپنے فن میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ مالیات کی معین المہامی پر تقرر کیا گیا۔ موجودہ دور میں حیدرآباد کے موازنہ میں جو اعتدال و توازن اور مالیات میں جو استحکام پایا جاتا ہے وہ مہاراجہ کے اسی عہد کی کوششوں کا نتیجہ ہے[1] جس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ مہاراجہ ۱۹۰۲ء میں جب مدار المہام ہوئے تو مملکت آصفیہ کی کل سالانہ آمدنی چار کروڑ تھی۔ ۱۹۰۴ء میں یہی آمدنی ساڑھے چار کروڑ اور ۱۹۰۸ء میں پانچ کروڑ ہوگئی۔ اور اسی طرح بڑھتے بڑھتے بالآخر ۱۹۱۲ء میں جبکہ مہاراجہ نے استعفیٰ دیدیا تھا تو کل آمدنی سات کروڑ تک پہونچ چکی تھی[2]۔

نواب سالار جنگ کے زمانہ میں کل ریاست پانچ صوبہ جات اور (۱۷) ضلعوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ مہاراجہ نے ۱۶ ارتیر ۱۳۱۴ف سے اضلاع کے سابقہ حدود میں تبدیلی کرکے چار صوبے اور (۱۶) ضلعے قائم کئے اور بیدر کے بجائے میدک کو صوبہ بنادیا گیا۔ اور بلدہ میں اس کا مستقر

---

[1] Pictorial Hyderabad

[2] بستان آصفیہ جلد اول۔ مصنفہ مانک راؤ وٹھل راؤ۔

رکھا گیا۔[1]

۱۳۲۲ف سے قبل کروڑ گیری کے آفیسر کو کمشنر کہا جاتا تھا۔ ۱۳۲۳ف سے اس عہدہ دار کا نام "ناظم" رکھا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ کی مدارالمہامی کا دور وہ دور تھا کہ برطانوی حکومت کی جانب سے مملکت آصفیہ کے سکہ اور ٹپہ کے برخواست کی خاطر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ لیکن مہاراجہ نے اس کی ہر طرح سے مخالفت کی۔ بلکہ ان ہر دو محکموں کی اصلاح میں آپ نے اپنی خاص دلچسپی کا اظہار فرمایا۔

۱۳۱۲ف سے قبل اکثر امرا کے سکے رائج تھے۔ مثلاً مومن پیٹھ۔ گدوال وغیرہ۔ اس لئے ۱۴ ربجمادی الثانی ۱۳۲۲ھ کو اعلان کیا گیا کہ ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ م ۶ ار مہر ۱۳۱۲ف سے سکہ جدید رواج پذیر ہوگا اور اس کو "موجودہ سکہ حالی" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اسی وقت سے سکہ کی باضابطہ تشکیک عمل میں آنے لگی اور ۱۳۱۲ف میں سکہ موجودہ کی شکل کی ابتدا ہوئی۔

ابتداً میں نواب سالار جنگ نے ۱۸۶۹ء میں سررشتہ ٹپہ قائم کیا تھا۔ بعد میں اس محکمہ کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ مہاراجہ نے ۱۳۲۵ھ میں ملک کی ضلع بندی کے بعد اس کے اصلاحی نظم و نسق کی جانب پوری توجہ مبذول کی اور قدیم قانون ٹپہ میں ۱۳۱۲ف ۱۳۲۲ف میں ضروری ترمیمات کیں۔ جس کی وجہ سے اس محکمہ میں باقاعدہ نظم و ضبط قائم ہو گیا۔ اور اس محکمہ کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔

۱۲۹۶ف میں بلدہ و چادرگھاٹ میں علیحدہ علیحدہ صفائی کے محکمے قائم ہوئے تھے۔ لیکن مہاراجہ نے ۱۳۱۶ف میں ہر دو محکموں کو ضم کرکے صفائی کے معاملات ایک مجلس کے تحت کر دئے۔ جو اب بھی مجلس بلدیہ کے نام سے قائم ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ۱۳۱۹ف میں بلدہ و بیرون بلدہ کو چار اسماءات میں تقسیم کر دیا گیا۔

۳۔ قیام جدید محکمہ جات ۱۳۱۶ف میں ایک رصدگاہ "رصدگاہ نظامیہ" کے نام سے قائم کی گئی۔

---

[1] خیابان آصفی۔ از مانک راؤ وٹھل راؤ۔

یکم خورداد ۱۳۱۶ف کو پہلی دفعہ "حیدرآباد اسٹیٹ فیملی پنشن فنڈ" قائم کیا گیا اور بعد میں اس کو موقوف کر کے یکم اسفندار ۱۳۲۲ف سے "حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس فنڈ" قائم کیا گیا۔

یوں تو برقی روشنی کی ابتدا حیدرآباد میں اُنیسویں صدی کے ختم تک ہو چکی تھی لیکن اس کو ترقی دینے کی خاطر ۱۳۲۲ف میں ایک "محکمہ برقی" قائم کیا گیا۔

۱۹۱۳ء م ۱۳۲۲ف میں اعلیٰ حضرت قدر قدرت کی تخت نشینی کے تیسرے سال بلدہ کی تزئین و آرائش کے لئے ایک "محکمۂ آرائش بلدہ" کا آغاز ہوا اور ایک مجلس مقرر کی گئی جس کے لئے سالانہ (۶) لاکھ کی رقم منظور ہوئی۔

مہاراجہ کو ملک کی معاشی ترقی سے خاص دلچسپی تھی خصوصاً زراعت کی اصلاح اور امداد باہمی کی افادیت پر آپ بہت زور دیا کرتے تھے۔ پھر جب حضرت اقدس اعلیٰ سریر آرائے حکومت ہوئے تو خسرو دکن حضرت جہاں پناہی کی رعایا پروری اور ترقی پسند پالیسی اور الطاف و مراحم سے اس خیال کو مزید تقویت پہنچی اور ۱۳۲۲ف میں زراعت اور ۱۳۲۳ف میں امداد باہمی کے محکمے قائم کر دیئے گئے۔

حیدرآباد میں آثار قدیمہ کی جو فراوانی اور بہتات ہے اس کا اظہار غیر ضروری ہے لیکن اکثر عمارتیں جو اپنی نوعیت میں عجوبۂ روزگار ہیں خراب و خستہ حالت میں تھیں اور اکثر و بیشتر منہدم اور برباد ہوتی جا رہی تھیں۔ ان حالات کے مدنظر ۱۳۲۳ف میں "محکمۂ آثار قدیمہ" کی ابتدا ہوئی تاکہ حیدرآباد کی تاریخی روایات اور عظیم الشان ماضی اور بلند پایہ و قابل تقلید تہذیب و تمدن کی مجسم اور انمول یادگاروں کی حفاظت کا انتظام ہو سکے کیونکہ بقول ڈاکٹر لیبان (ماہر فنون لطیفہ) کے عمارتیں "قوموں کے خدمات اور خیالات اور ارادوں کی نہایت صحیح ترجمانی کرتے ہیں" اور بقول خود مہاراجہ بہادر آنجہانی کے "یہ پتھر کی کتابیں تمام دنیا کی کتابوں سے زیادہ صاف زیادہ واضح زیادہ آسان پائی جاتی ہیں۔"[1]

۴۔۔ رفاہی کام :۔ مہاراجہ کے عہد وزارت میں نہ صرف جدید محکمے قائم ہوئے اور نظم و

---

[1] "ان بیر" از شاد صوفی آنجہانی۔

نسق میں اصلاحات عمل میں آئیں بلکہ بہت سے رفاہی کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

ایک طرف نئی عمارتوں میں اضافہ ہوا۔ مثلاً محبوبیہ ٹاؤن ہال باغ عامہ، جو محلہ مبارک، دواخانۂ عثمانیہ وغیرہ۔ مختلف پلوں کی ترمیم عمل میں آئی۔ خصوصاً پل جدید و قدیم، حمایت ساگر و عثمان ساگر کی تعمیر کا اسی زمانہ میں یعنی طغیانی رود موسیٰ کے بعد خیال پیدا ہوا۔ اور دوسری طرف مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ جدید سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔ پورنا تا ہنگولی (۵۰) میل لمبی ریلوے کا ۱۹۱۲ء میں آغاز ہوا۔ غرض مختلف شعبوں میں ترقی کی طرف قدم بڑھایا گیا۔ اور اسی نقش پا پر چلنے کا نتیجہ ہے جو آجکل مملکت آصفیہ کی اس دن دونی رات چوگنی ترقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مہاراجہ نے "دور تنظیم" کی ابتدا کی جس کی جیتی جاگتی تصویر دور حاضر کی ترقیوں اور ملک و قوم کے عروج کی وہ بہتم بالشان عمارت ہے جس کی تعمیر ابھی تک جاری ہے۔ گویا: س عروج اور ترقی کا اس زمانہ میں خواب دیکھا گیا تھا وہ بعد میں چل کر شرمندہ تعبیر ہوا۔ اور ان منصوبوں کی تکمیل ہوئی جن کے پس منظر میں بہت سی تاریخی روایات قومی سربلندی اور ملکی ترقی کے عزم ہائے بالجزم اور بدر آباد کی تہذیبی و تمدنی عظمت و جبروت کے نقوش اور آثار پائے جاتے تھے۔

مہاراجہ کو مدار المہامی کی انہی خدمات کے صلہ میں سنہ ۱۹۱۰ء میں جارج پنجم کی سالگرہ کے موقع پر جی۔ سی۔ آئی۔ ای[1] کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ یہ وہ خطاب ہے کہ اس وقت تک ہندوستان کی کسی دوسری ریاست کے کسی امیر اور والی یا رئیس کو نہیں ملا تھا۔ نیز ۱۹۱۱ء میں جب لارڈ ہارڈنگ وائسرائے۔ اعلیحضرت مرحوم کی وفات کے وقت حیدرآباد آئے تھے تو انھوں نے مہاراجہ کو ان کے کامیاب نظم و نسق اور ملک کی غیر معمولی ترقی پر مبارکباد دی۔

صدارت عظمیٰ حضرت اقدس و اعلیٰ اور لارڈ ریڈنگ کی خط و کتابت کے باعث برطانوی حکومت اور مملکت آصفیہ کے تعلقات میں کسی قدر کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔

---

[1] Grand Commander order of the Indian Empire G. C. I. E.

ملک کے حالات ناسازگار اور ناخوش گوار ہوتے جارہے تھے۔ بالخصوص اس لئے بھی کہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے رزیڈنٹ بارٹن تھے۔ ان حالات میں اعلیحضرت مدظلہٗ العالی کی فراست مآب نظر نے صدارت عظمیٰ کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جو واقعی موزوں ثابت ہوسکتا تھا جونہی مہاراجہ کا نام لیا گیا لوگ ہاتھوں ہاتھ لینے بڑھے۔ مہاراجہ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شورشوں اور ہنگاموں کی شدت پسندی میں آپ کے نام ہی سے کمی ہوتی گئی اور ان ناسازگار حالات میں مہاراجہ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہ حیدرآباد کی تاریخ کا ایک زرین باب ہے۔ عوام کے ہیجان کو کم کرنے کے علاوہ برطانوی حکومت کے ساتھ ہماری سلطنت ابد پائدار کے تعلقات کو خوشگوار بنانا مہاراجہ کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس فرض کو مہاراجہ نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ خود انگریزوں نے مہاراجہ کی اس خدمت اور جانفشانی کا اعتراف کیا ہے۔

بہرحال نومبر ۱۹۲۶ء م دے ۱۳۳۶ف م ۷ر جمادی الاول ۱۳۴۵ھ اعلیحضرت نے دوبارہ قلمدان وزارت مہاراجہ کے تفویض فرمایا۔

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ۱۳۱۱ف میں مہاراجہ کو مدار المہامی کا جائزہ نواب سر وقار الامراء مرحوم نے دیا اور ۱۳۳۶ف میں ان کے بیٹے نواب ولی الدولہ مرحوم سے مہاراجہ نے صدارت عظمیٰ کا جائزہ حاصل کیا۔

قلمدان وزارت اپنے ہاتھ میں لیتے ہی مہاراجہ نے سب سے پہلے مختلف مقامات کا دورہ فرماکر حالات کا بذات خود معائنہ اور تنقیح فرمائی اور اضلاع، تعلقات و قصبات کے لوگوں سے گفتگو کرکے ان کی مشکلات کے رفع کرنے اور مطالبات کو پورا کرنے کا وعدہ فرمایا۔

محکموں کی اصلاح اور جدید محکموں کا آغاز:۔ صدر اعظم ہوتے ہی آپ نے پہلا کام یہ کیا کہ باب حکومت کے دستور العمل کے تحت ذیلی قواعد منظور کروائے جس کا مقصد یہ تھا کہ معزز اراکین کونسل اور صدر اعظم کے تعلقات اور حدود و اختیارات کو متعین کیا جائے نیز مقدمات کی کارروائی اور فیصلوں کے طریق کار اور عملدرآمد کے لئے ایک ضابطہ بنایا جائے۔ چنانچہ

۱۱ر شہریور ۱۳۳۶ف م ۸ ار محرم ۱۳۴۶ھ کو یہ ذیلی قواعد باب حکومت میں باجلاس کونسل صدر اعظم بہادر نے منظور فرمائے[1]۔ اور آج انہیں ضوابط و قواعد پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

۲۰ر رمضان ۱۳۴۰ھ میں صوبیداریاں برخواست کر دی گئیں تھیں۔ ۶ر ذیقعدہ ۱۳۴۰ھ میں صوبہ داروں کا لقب حذف کیا جا کر ناظم مال کا لقب دیا گیا تھا۔ لیکن مہاراجہ نے ۱۵ر شعبان ۱۳۴۱ھ سے پھر صدر نظامت مال کے لقب کو صوبہ دار سے بدل دیا اور حسب سابق چار صوبہ داریاں قائم کی گئیں۔

ایک اور اصلاح اس محکمہ میں یہ ہوئی کہ صدر نظامت کے قیام کے بعد اول تعلقداروں کے اختیارات میں بہت کچھ کمی ہو گئی تھی لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس سے بہت سی انتظامی دقتیں اور نظم و نسق میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ضلع کو دوبارہ اپنے سابقہ اختیارات دیدیئے گئے اس سے ایک طرف تو تعلقداران اضلاع کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا دوسرے رعایا کے نقطۂ نظر سے بلحاظ انصاف رسانی بہت مفید ثابت ہوا[2]۔

حسب فرمان خسروی ۱۳۳۹ف سے ٹکٹوں اور لفافہ و کارڈ کی قیمتوں میں اضافہ کیا گیا اور اسی وقت سے پوسٹ کارڈ بجائے تین پائی کے چار پائی اور لفافہ بجائے چھ پائی کے آٹھ پائی میں فروخت کیا جانے لگا۔

جمیع خاص و عام کی اطلاع کے لئے ایک اعلان ہوا کہ "یکم آذر ۱۳۴۱ف اور اس کے بعد سے قدیم سکہ حالی (محبوبیہ) جس پر چارمینار کی شکل نہیں ہے خزائن سرکار میں عثمانیہ روپیہ کے بدلہ میں لیا جانا موقوف ہو گا۔"

---

[1] تحریکات مہاراجہ بہادر مطبوعہ "باب حکومت"۔

[2] تعلقداروں کے اختیارات میں اضافہ کے لئے صدر اعظم بہادر نے ۲۳ر ربیع الثانی ۱۳۴۵ھ ہی کو صدر المہام صاحب مال کو حکم دیا لیکن اس پر بعد میں یعنی ۱۳۴۶ھ سے عمل ہوا۔

دفتر مہتممی بندوبست کو سنہ ۱۳۴۴ف میں نظامت کا درجہ عطا گیا اور بجائے دو مہتمان کے ایک ناظم اور نائب نظما کی دو جائدادیں قائم کی گئیں۔

سنہ ۱۳۳۷ف میں ایک محکمہ ڈرینج قائم ہوا۔ اسی سال کارخانہ جات کی نگرانی کے لئے ایک چیف انسپکٹر کا تقرر عمل میں آیا۔ پھر محکمہ ترک مسکرات قائم کیا گیا اور یکم آذر سنہ ۱۳۳۷ف سے سیندھی اور شراب کے استعمال کو کم کرنے کے لئے اس پر زیادہ محصول عائد کیا جانے لگا۔

حکومت ہند کی اتباع میں ۱۴ امرداد سنہ ۱۳۴۴ف سے ایک پبلسٹی بورڈ (دفتر معلومات عامہ) کا حیدرآباد میں بھی قیام عمل میں آیا اور آخر ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۵۰ھ سے حسب الحکم مہاراجہ بہادر "اخبارات کی مسدودی و اجرائی و امداد دینے کی کارروائی سررشتہ معلومات عامہ کی تحریک" کی بناپر عمل میں لائی جانے لگی۔ اور پریس کمشنری کو مذکور الصدر کمشنری میں ضم کر دیا گیا۔

اطراف بلدہ کی ایک جدید تعلقداری ضلع باغات کے نام سے قائم کی گئی جس کی ایک عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ نیز عدالت فوجداری و دیوانی کے سوا بلدہ میں ایک عدالت مطالبات خفیفہ کی بھی سخت ضرورت تھی سنہ ۱۳۴۴ف میں اس ضرورت کے مدنظر عدالت مطالبات خفیفہ کا قیام عمل میں آیا۔

ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات اور تمدنی ارتقا کے مدنظر یکم فروردی سنہ ۱۳۴۴ف کو محکمہ ٹاسلکی سرکار عالی قائم کیا گیا۔ اور سنہ ۱۹۳۶ء سے ٹاٹا ہوائی میل سرویس بھی جاری ہوئی جو بمبئی میں۔ کراچی۔ بصرہ۔ بغداد۔ اسکندریہ۔ پیرس اور لندن تک جاتی ہے۔ حکیم پیٹھ میں ایک باضابطہ ہوائی اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا اور سرکاری طریقہ سے ہوائی ٹریننگ کا بھی آغاز ہوا۔

ملک کی معاشی ترقی اور مرفہ الحالی سے مہاراجہ کو بے حد دلچسپی تھی۔ دیہات سدھار کسانوں کی قرضہ سے نجات گریلو صنعتوں کے فروغ اور امداد باہمی کی ترقی پر آپ نے ہمیشہ زور دیا۔ دیہات سدھار کے مسئلہ کی ابتدا آپ ہی کے عہد سے ہوئی۔ دیہی زندگی کو عام طور پر درست کرنے اور ترقی دینے کی غرض سے قصبہ پٹن چرو میں ترقیات دیہی کا ایک مرکز قائم کیا گیا۔

جس میں مرغبانی کے شعبہ کو خاص اہمیت دی گئی۔ دیہی تنظیم کے لئے خود دیہاتیوں کو تربیت دینے کی خاطر اکثر مقامات میں دیہی انجمنیں قائم کی گئیں بچوں کے لئے مدارس روزینہ اور بڑوں کے واسطے مدارس شبینہ کا آغاز ہوا۔

دیہی تنظیم اور دیہی پنچایت کے قریبی تعلق پر زور دیتے ہوئے ۱۸ ذیحجہ ۱۳۴۵ھ کو آپ نے ایک مسودہ قانون دادرسی کاشتکاران بھی پیش فرمایا تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

"اگر ہماری دیہی پنچایت کی تنظیم عمل میں آئے اور مزارعین کو قانونی امداد بھی دی جائے تو یہ باور کرنے کی معقول وجہ ہوسکتی ہے کہ آئندہ مجلس وضع آئین و قوانین[1] کی صحیح نیابت حاصل ہوسکے گی .... میری تجویز کا مقصد اصلی فی الوقت دیہات کی تنظیم اور دیہاتیوں کی امداد ہے۔"

۱۳۴۵ف کے مواز نہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"زرعی قرضداری سے نجات دلانے کے لئے ہر سال سرکاری طور پر مناسب ایجنسیوں کے توسط سے خواہ وہ کوآپریٹو بنک ہوں یا زمین گردی بنک[2] ہوں کم شرح سود اور زیادہ مدت کے لئے قرضہ جات کا انتظام کیا جائے۔"

امداد باہمی سے تو مہاراجہ کو فطری لگاؤ تھا۔ امداد باہمی کا محکمہ آپ ہی کے عہد مدارالمہامی میں قائم ہوا۔ پھر صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں اس کو خوب فروغ ہوا۔ اور اضلاع میں بھی سنٹرل بنکس کھول دئے گئے۔ آپ نے امداد باہمی پر ایک نظم بھی لکھی تھی جو ہر سال امداد باہمی کے سالانہ جلسہ میں پڑھی جاتی ہے۔ ایک دفعہ اضلاع میدک و نظام آباد کے کمبل بننے والوں کی ایک کثیر

---

[1] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "تحریک اصلاحات" آپ ہی کے زمانہ سے شروع ہوئی تھی اور کمیٹی اصلاحات نے دیہی پنچایت کی از سر نو تنظیم کی جو تجویز پیش کی ہے وہ مہاراجہ کے اسی مسودہ سے ماخوذ ہے۔

[2] حال ہی میں زمین گردی بنک کا جو قیام ہوا ہے اس کو دراصل مہاراجہ کی اس تحریک کا نتیجہ خیال کرنا چاہئے۔

جماعت کو مخاطب فرماتے ہوئے آپ نے حالات اور انسانی ہمدردی پر زور دیا اور اپنے فرزند خواجہ پرشاد کے نام سے ایک ہزار کا عطیہ مقامی صدر انجمن امداد باہمی کو عطا فرمایا کہ کمبل پوشوں کی امداد کی جائے۔

اسی طرح ملک کی گھریلو صنعتوں کے احیا اور ترقی کا آپ کو خاص طور پر خیال تھا۔ ایک ماہر فن کاغذ سازی کا تقرر کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا "دیہاتی کاغذ سازی کی صنعت کو نظر انداز نہ کیا جائے اور قیام کارخانے کے مسئلہ کو حقیقی دلچسپی کے ساتھ ماہرانِ فن کے مشورے حاصل کرتے ہوئے تازہ رکھا جائے"۔ اس کے علاوہ بیدری صنعت کو فروغ دینے کی خاطر ۱۴ر جمادی الاول ۱۳۴۲ھ کو آپ نے ایک کمیٹی کی تجویز پیش کی جس کے اراکین ناظم صنعت و حرفت، ناظم تعلیمات ناظم امداد باہمی معتمد فینانس ہوں۔ جو اس پر غور کرے کہ "آیا بیدر میں ایک ایسا کارخانہ پارچہ بافی و صنعت بیدری کا قائم ہوسکتا ہے جس میں اعلی پیمانہ پر پارچہ و صنعت بیدری کی تعلیم پانے کے بعد طالبان معاش کھپ سکیں اور بجور کا کارخانہ بیوہ عورتوں کی پرورش کا بھی ایک ذریعہ بن سکے" اس تجویز پر اگر عمل ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ آج بیدری صنعت ایک نئے روپ میں ہوتی۔

مجلس وضع آئین و قوانین :۔ حسب فرمان خسروی راجہ بالکشن رآنجہانی نے توسیع مجلس وضع آئین و قوانین کی نسبت فراہمی مواد کا کام ۲۸ر فروردی ۱۳۲۹ف سے شروع کیا اور یکم آذر ۱۳۳۱ف میں رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد پیشگاہ خسروی سے اس پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا حکم صادر ہوا۔ کمیٹی کی سفارش کی بنا پر نواب سر نظامت جنگ نے ایک مسودہ مرتب کر کے باب حکومت میں پیش کیا۔ اس کے بعد ۲۵۔ شہریور ۱۳۳۲ف کے اجلاس میں صدر اعظم مہاراجہ بہادر نے باتفاق معزز اراکین یہ طے فرمایا کہ "محکمہ قانونی سے جو مسودہ ضابطہ مجلس وضع قوانین مرتب ہوا ہے وہ ایک سب کمیٹی کے تفویض کیا جائے جس کے اراکین حسب ذیل ہوں۔

(۱) کرنل ٹرینچ۔ (۲) نواب سر نظامت جنگ بہادر۔ (۳) نواب عقیل جنگ بہادر۔ (۴) نواب سر امین جنگ بہادر۔ (۵) رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر۔

اور کمیٹی کو ہدایت کی جائے کہ جس قدر جلد ممکن ہو ضروری ترمیمات کے بعد مسودہ باب حکومت میں بغرض تصفیہ پیش کرے۔

لیکن معزز اراکین کی گول میز کانفرنس کے اجلاس میں شرکت اور دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے ایک مدت تک کارروائی آگے نہ بڑھ سکی۔ یہاں تک کہ ۱۸ بہمن ۱۳۴۲ف کو معزز کونسل نے یہ قرار پایا کہ معتمد باب حکومت اور معتمد قانون ایک نوٹ پیش کریں کہ توسیع مجلس وضع قوانین کی کارروائی اب کس نوبت پر ہے۔ اس نوٹ کے پیش ہونے کے بعد ۲۶ خورداد ۱۳۴۴ف کو معزز کونسل نے یہ طے کیا کہ "معتمد باب حکومت بمشورہ مشیر قانونی ایک آئینی یادداشت مرتب کریں جس میں جملہ امور غور طلب کا حوالہ دیا جائے اور یہ یادداشت معزز ارکان کونسل کے پاس روانہ کی جائے۔" اس کے بعد ۱۵ شہریور ۱۳۴۴ف کو یہ مقدمہ معتمدی قانون سے معتمدی سیاسیات میں منتقل کر دیا گیا تاکہ مجلس امور خارجی اس پر غور کرے۔ مجلس امور خارجی کی بناپر یہ مسئلہ کمیٹی اصلاحات کے سپرد کیا گیا جس نے ۱۳۴۶ف میں تحقیقات کرکے اپنی رپورٹ پیش کر دی۔

تعلیمی ترقی

حضرت اقدس و اعلیٰ کا یہ ارشاد گرامی کہ "تعلیم ترقی کی روح رواں ہے" اور موجودہ صدر اعظم رائٹ آنریبل سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر (سابق صدر المہام فینانس) کا یہ قول کہ "فینانس تعلیمات کی ایک کنیز ہے" مہاراجہ بہادر آنجہانی کے ہمیشہ پیش نظر تھا۔ چنانچہ تعلیم کو عام کر دینے کی خاطر آپ نے جبری تعلیم کا ایک اسکیم کونسل میں پیش کرکے منظور کروایا لیکن افسوس ہے کہ اس کو آپ کے زمانہ میں عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ مسئلہ اس کے متعلق مکرر غور کیا جا رہا ہے۔ تاہم اس عہد کی تعلیمی ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۳۳۱ف میں سررشتہ تعلیمات کے مصارف (۴۱) لاکھ تھے ۱۳۴۶ف میں یہ مصارف ... لاکھ تک ہو چکے تھے۔ ۱۳۳۱ف میں مدارس وطلبا کی تعداد بالترتیب (۴۰۳۶)

۔ رپورٹ کمیٹی اصلاحات۔

اور (۴۴۸۴۴۰۱۰۶) تھی۔ ۱۳۴۵ف میں یہی تعداد (۴۸۰۰) اور (۳۶۴۲۵۳) تک پہنچ چکی تھی۔[1]

۱۳۴۰ف کے موازنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "شہر میں بازی گاہوں کے لئے بارہ[12] لاکھ کی رقم کی منظوری بہت زیادہ ہے .... مری تحریک ہے کہ اس کے منجملہ دس لاکھ روپے دیہات میں مدارس کے لئے مکانات کی تعمیر پر صرف ہوں اور دو لاکھ بازی گاہوں پر .... واضح ہو کہ دیہات میں مدارس کی عمارات کی نہایت ردی اور زبون حالت ریاست کے لئے باعث ننگ ہے اور ...... دیہاتی طلباء کے لئے صحت بخش مکانوں میں تعلیم دلانے کا حتی الامکان انتظام حکومت کا مقدس اور مقدم ترین فرض ہے۔[2]

کتب خانہ آصفیہ تو بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کے لئے کوئی مستقل عمارت نہ تھی۔ مہاراجہ کے عہد میں نئے پل کے قریب ایک شاندار اور مستقل عمارت کتب خانہ کے لئے تعمیر کی گئی۔ پہلے موازنہ میں سالانہ آٹھ ہزار روپے کتب خانہ کے لئے شریک ہوئے تھے۔ مہاراجہ نے اپنی تعلیمی دلچسپیوں کی بنا پر عوام الناس کے افادہ کے مدنظر بارہ ہزار کا اضافہ کروا کے یہ رقم بیس ہزار تک بڑھا دی اور کتب خانہ کے کاروبار کے لئے ایک کمیٹی مقرر فرمائی جس کے صدر خود مہاراجہ بہادر تھے اور نائب صدر علامہ نواب ضیا یار جنگ بہادر تھے۔

جامعہ عثمانیہ :- جامعہ عثمانیہ اور عثمانیہ برادری مہاراجہ کی محبت، خلوص اور ہمدردیوں کے بے پایاں سمندر سے ہمیشہ فیض یاب اور بہرہ ور ہوتی رہی ہے۔ صدر اعظم ہونے اور امیر جامعہ بننے کے ساتھ ہی ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ کے تحت عثمانیہ میڈیکل کالج اور ۱۹۲۹ء میں عثمانیہ انجینئرنگ کالج و عثمانیہ ٹریننگ کالج کا آغاز ہوا۔ ان کے علاوہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے لئے بلدہ، اورنگ آباد، ورنگل، اور گلبرگہ میں چار کالج قائم ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ زنانہ کالج کا قیام بھی عمل میں آیا۔

---

[1] ۔ رپورٹ کمیٹی اصلاحات

[2] ۔ "مجموعہ تحریکات مہاراجہ بہادر" مطبوعہ باب حکومت۔

۱۳۳۵ف میں جلسہ تقسیم اسناد کا خطبہ پڑھتے ہوئے آپ نے پہلی دفعہ جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں کو مخاطب فرمایا۔ اس خطبہ میں آپ نے جامعہ کے تحت السنۂ مغربی کی تعلیم، امداد باہمی، زرعی وصنعتی کالج کے قیام، سائینٹفک تحقیقات کے لئے ایک معمل، اور جامعہ سے ایک علمی رسالہ کے اجرا کی تحریک فرمائی۔ چنانچہ اسی وقت سے "مجلۂ عثمانیہ" شائع ہونے لگا اور انگریزی کے علاوہ جرمن و فرانسیسی زبانوں کی تدریس بھی شروع کی گئی۔ اس وقت معلمین کو مہاراجہ آنجہانی نے جن گراں بہا نصائح سے بہرہ اندوز کیا۔ کاش ان پر ہمارے اساتذہ عمل پیرا ہوتے اور طلباء کی نوخیز امنگوں اور جذبات کے سیلاب دوسرے راستوں کی تلاش کا موقع نہ دیتے۔ آپ نے ارشاد فرمایا تھا۔ اور کس قدر صحت ہے اس قول میں!

"نو عمر طبائع فطرتاً زیادہ تقلید پسند ہوتے ہیں۔ طلباء کی تقلیدی قابلیت کو مفید مطلب پر لگانا اور ان کے طبائع کو مناسب سانچہ میں ڈھالنا دانشمند معلمین کا فرض ہے۔"

تعلیم کی تعمیم کا جو جذبہ آپ کے دل میں موجزن تھا اس کا آپ نے ۱۳۴۳ف کے جلسہ تقسیم انعامات میں اس طرح اظہار فرمایا کہ

"مجھ کو امید ہے کہ اس کلیہ میں جو علم کا چشمہ ہے کسی تشنہ علم کو سیراب کرنے میں تنگی نہ ہوگی۔ داخلہ کی نسبت روک تھام میں جو موانعات ہیں ان کی واہییت کو محسوس کرتے ہوئے میں یہ بھی باور کرتا ہوں کہ اس ملک کے میدان عمل کی وسعتیں شہری رقبہ جات میں عموماً اور دیہی رقبہ جات میں خصوصاً بہت زیادہ ہیں جن کے لئے جامعہ بڑی تعداد میں عالم و عامل پیدا کرسکتی ہے جو ملک کے ہر حصہ میں کارآمد ہونگے۔"

مہاراجہ کچھ دن اور امیر جامعہ رہتے تو ممکن تھا کہ اس تحریک کو خود عملی جامہ پہناتے لیکن۔ کاش ارباب اقتدار اب بھی اس پر غور کریں۔

اسی وقت آپ نے طلباء جامعہ کے لئے ایک یونیفارم کی تحریک فرمائی اور ہمارے موجودہ یونیفارم کو مہاراجہ آنجہانی کی اسی تحریک کی عملی صورت خیال کرنا چاہئے۔ اسی سال جامعہ

کی جدید عمارت کا اسکیم منظور کیا گیا اور ۱۳۴۴ف میں جامعہ اڈکمیٹ میں منتقل ہوا۔ جامعہ سے آپ کی حقیقی محبت اور دلچسپی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے جب آپ فرماتے ہیں "حیدرآباد کے لئے وہ بڑا دن ہوگا جب حیدرآباد کے نظم ونسق کے ہر شعبہ کا انتظام بلا کسی امتیاز کے عثمانیوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔" یہ ایک حقیقی محسن کے سچے جذبات ہیں جو بے ساختہ زبان سے نکل پڑے۔

مہاراجہ جب تک امیر جامعہ رہے ہر سال جامعہ کی ہر تقریب میں تشریف لاتے تھے جامعہ میں آپ کی آخری تقریر ۸ اردی ۱۳۴۴ف کو جلسہ تقسیم انعامات کے موقع پر ہوئی جس کا ایک ایک لفظ عثمانیین کے لئے شمع راہ ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ "مغربی طرز و ادا کو دخیل کئے بغیر یہاں کے طلباء مشرقی سیرت و کردار کے ضرب المثل نمونے بن جائیں۔" کس قدر پاس و لحاظ تھا آپ کو مشرقی تہذیب کے تحفظ کا! اسی تقریر میں آپ نے نصیحت فرمائی کہ "حیا، جرأت، پاکیزہ خیالی، صاف گوئی اپنا شعار بناؤ اور اپنی خوشی کو دوسروں کی خوشحالی پر منحصر رکھو کامیاب رہوگے۔ تملق، خودغرضی، خوشامد پسندی، نخوت، تعصب، جھوٹی شہرت طلبی سے احتراز کرو سرخرو رہوگے۔"

بلدیات اور شہری ترقیات

۱۶ رجب ۱۳۴۵ھ کو یعنی صدر اعظم ہونے کے دوسرے ہی ماہ آپ نے معتمد لوکل فنڈ و صنعت و حرفت کو ایک مراسلہ لکھا جس میں حسب ذیل فقرہ قابل ذکر ہے۔

"میں چاہتا ہوں کہ مناسب آبادیوں میں میونسپالٹیاں قائم کی جائیں۔"[۲]

پھر ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۴۶ھ صدر المہام صاحب سیاسیات و صفائی کو آپ نے انتخابات نائب میر مجلس بلدیہ حیدرآباد کے متعلق حسب ذیل یادداشت روانہ کی۔

---

[۱] ۔ تقریر بسلسلہ جلسہ تقسیم انعامات ۱۳۴۴ف

[۲] ۔ "مجموعہ تحریکات" مطبوعہ باب حکومت۔

"گو حیدرآباد کا شہر ہندوستان میں چوتھے درجہ پر ہے مگر یہاں کی میونسپالٹی کی حیثیت اور ہیئت بلحاظ اقتدارات اور نیابت کے علاقہ انگریزی کے قصبات کی میونسپالٹی سے بھی کم ہے۔ حیدرآباد میں میونسپالٹی کا درجہ اس کے شہری مناسبت سے قائم ہونا چاہئے . . . . صدر المہام صاحب متعلقہ سے مجھ کو امید ہے کہ حیدرآباد میونسپالٹی کو نیابتی اصول پر ترقی دینے کی عاجلانہ کوشش کریں گے"[1]

مہاراجہ آنجہانی کے ان ہر دو احکام کی تعمیل کی گئی۔ بہت جلد مختلف اضلاع مثلاً (اورنگ آباد ناندیڑ۔ گلبرگہ۔ رائچور۔ ورنگل) اور قصبات مثلاً (لاتور۔ جالنہ) وغیرہ میں بلدی کمیٹیاں قائم کردی گئیں اور ۱۳۴۲ف سے بلدیہ حیدرآباد کی مجلس کو نیابتی اصول پر ترقی دی گئی۔[2]

مجلس بشمول میر مجلس و نائب میر مجلس (۳۶) ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ میر مجلس کا تقرر حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اور نائب میر مجلس کا انتخاب منتخب یا مقرر شدہ ارکان کے منجملہ مجلس بلدیہ قرعہ اندازی کے ذریعہ کرتی ہے۔ اراکین کی مدت رکنیت تین سال کی ہوتی ہے۔

اس سال میر عالم کا تالاب نواب سالارجنگ بہادر کو واپس کرکے آبرسانی اور نلوں کا تعلق عثمان ساگر سے کردیا گیا۔

محکمۂ ڈرینج قائم کرکے بلدہ کے سارے کاموں کے لئے نوے لاکھ کی منظوری دی گئی اور وقتاً فوقتاً اس رقم میں اضافہ کیا گیا۔ نیز عثمانیہ دواخانہ سے قریب ڈرینج کا ایک نمائش خانہ بھی کھولا گیا۔

۱۳۳۵ف میں غیر سرکاری مارکٹ و مسالخ پر منجانب صفائی نگرانی و انتظام کے متعلق حکم دیا گیا اور بعد میں معظم جاہی مارکٹ کے نام سے ایک سرکاری عمارت تعمیر کی گئی۔ جیسا کہ

---

[1] "مجموعہ تحریکات" مطبوعہ باب حکومت۔

[2] رپورٹ کمیٹی اصلاحات۔

اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے ۱۹۱۳ء میں مہاراجہ کے مدار المہامی کے زمانہ میں بلدہ کی تزئین و آرائش کے لئے ایک مجلس آرائش مقرر کر کے سالانہ چھ لاکھ کی رقم ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے منظور کی گئی تھی۔ ۱۳۳۵ف میں مجلس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مدنظر یہ رقم (۲۰) لاکھ سالانہ کر دی گئی۔

حیدرآباد کی سڑکوں کی ابتری کی وجہ سے کونسل میں شوارع قسم اعلیٰ کی تعمیر کے لئے مہاراجہ نے ۱۳۳۵ف کے موازنہ میں بیس[1] لاکھ کی رقم منظور کروائی اور ۹ر شوال ۱۳۴۴ھ کو ایک کمیٹی کا تقرر فرمایا تاکہ اس کے متعلق جلد از جلد رپورٹ پیش کرے۔

۲۵ر آبان ۱۳۳۸ف کو بیس ہزار روپے صدر اعظم بہادر کی اقتداری[1] رقم سے صدر المہام بہادر سیاسیات کے تفویض کئے گئے تاکہ اندرون شہر چار گلشن اطفال کی تعمیر پر صرف کریں۔ نیز ۲۹ر آذر ۱۳۳۹ف کو شہر کی ضرورتوں کے مدنظر طبقہ نسوان کی تفریح گاہوں کے لئے دس ہزار روپے اُس اقتداری رقم سے عطا کئے گئے۔ اور ۲۰ر دی ۱۳۳۹ف کو مبلغ پندرہ ہزار روپے ایک مرکز بہبودی اطفال کے لئے دیے گئے۔

رفاہ عام کے دوسرے کام :- اکثر اضلاع رائچور، گلبرگہ، ورنگل، نظام آباد، ناندیڑ وغیرہ میں آبرسانی کے لئے نلوں اور روشنی کے لئے برقی روشنی کی ابتدا آپ ہی کے زمانہ میں ہوئی۔ ۱۳۳۰ف میں معزز اراکین باب حکومت کی ایک کمیٹی "واٹر اینڈ ڈرینج بورڈ" کے نام سے قائم کی گئی جس کی رہبری میں اورنگ آباد، جالنہ اور رائچور وغیرہ میں چالیس لاکھ کے صرفہ سے آبرسانی اور ڈرینج کی اسکیمیں نافذ کی گئیں۔ گندیدگی باؤلیات کے لئے جو خاص سررشتہ قائم کیا گیا اس کے تحت اکیس لاکھ روپے کے صرفہ سے (۱۱۶۷) دیہاتوں میں (۱۵۵۰) باؤلیات کی تعمیر یا ان میں ترمیم عمل میں آئی۔

---

[1] اس سے مراد سالانہ ایک لاکھ کی وہ رقم ہے جس کو صدر اعظم اپنے اقتدار سے بغیر کونسل کی منظوری کے صرف کرسکتا ہے۔

نظام ساگر کی تعمیر کا آغاز ۱۳۳۳ف سے ہوا اور مہاراجہ کے عہد وزارت یعنی ۱۳۴۰ف میں اس کی تکمیل ہوئی۔ ویرا، پالیر، رائن پلی، عثمان ساگر کے تالاب بھی آپ ہی کے زمانہ میں پایہ تکمیل کو پہنچے۔ ناندیڑ میں پل گوداوری یادگیر میں بھیما اور کھم سرپاپیٹھ روڈ پر مانیر کے پل اسی عہد میں تعمیر ہوئے۔ نہر نظام ساگر اور فتح نہر کا آغاز بھی اسی دور میں ہوا۔

اس زمانہ میں (۳۲۶۰) میل سے زیادہ لمبی سڑکیں تعمیر ہوئیں اور ۱۹۳۲ء میں پہلی دفعہ ریلوے بس سرویس کا آغاز ہوا۔ جو آج تقریباً پوری ریاست میں جاری ہے۔ پھر نئی نئی ریلوے لائینوں کا افتتاح ہوا۔ مہاراجہ کے حکم سے جو ریلوے لائنیں تعمیر ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں

عالم پور روڈ تا کرنول (۳۸) میل ۱۹۲۸ء۔ کرنول تا ڈورناچلم (۳۲) میل ۱۹۲۸ء رام گنڈم تا آصف آباد روڈ (۳۶ میل ۱۹۲۳ء) آصف آباد تا بلہار شاہ (۵۲ میل ۱۹۲۸ء) (پربھنی تا پرلی ۴۰ میل ۱۹۲۹ء) وقار آباد تا بیدر (۵۷ میل ۱۹۳۰ء) کارے پلی تا بھدراچلم (۲۵) میل ۱۹۲۷ء) گویا جملہ (۲۸۰) میل لانبی ریلوے لائین تعمیر ہوئی۔ ریلوں اور بسوں کے آغاز و ترقی سے ملک کی معاشی و تجارتی ترقی کی حقیقی معنوں میں ابتدا ہوئی۔

چند قابل یادگار کارنامے

۱۔ ریلوے کی واپسی:۔ یوں تو مہاراجہ کے دور وزارت میں ترقیوں کا ایک سیلاب بہ نکلا لیکن ریلوے کی واپسی آنجہانی کے عہد کا وہ تاریخی اور درخشاں کارنامہ ہے جس کی مثال دکن کی گذشتہ تاریخ بھی پیش نہیں کرسکتی جس میں موجودہ صدر اعظم نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر کی کاوشوں اور کوششوں کا خاص حصہ ہے۔

ریلوے ۱۹۳۰ء میں کمپنی کی ملکیت سے مملکت آصفیہ کے قبضہ میں آتی تھی لیکن ۱۹۳۰ء ہی میں ریلوے کی خریدی سے ہماری مملکت کو (۳۵) لاکھ سکہ عثمانیہ کا فائدہ ہوا [1]۔ لیکن اس رقمی نفع کے سوا حیدرآباد کی تجارتی ترقی کی ابتدا ہوئی اور ملک کو بے شمار سماجی و معاشی فوائد حاصل ہوئے۔

---

[1] بستان آصفیہ۔ جلد ہفتم از مانک راؤ وٹھل راؤ۔

۲۰۔ گول میز کانفرنس:۔ ۱۹۳۱ء کی مشہور گول میز کانفرنس میں ہماری مملکت کے جن نمائندوں نے شرکت کی ان کے نام یہ ہیں۔ نواب سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر۔ مسٹر ٹریچ۔ نواب امین جنگ بہادر۔ نواب نظامت جنگ بہادر۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر۔ اس کانفرنس میں ہمارے نمائندوں کی شرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسئلہ طے ہوگیا کہ "اگر حیدرآباد وفاق میں شریک ہو تو پٹہ اور سکہ حیدرآباد کا ہوگا"[1]

۳۔ استرداد ریزیڈنسی:۔ ۱۹۳۰ء میں ریلوے کی واپسی کے بعد علاقہ ریزیڈنسی کی واپسی کا مسئلہ چھڑ گیا اور بالآخر ۹ ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ ف م ۱۵ ارخورداد ۱۳۵۵ھ یوم یکشنبہ دن کے بارہ بجے یہ علاقہ سرکار عالی کو واپس کیا گیا اور اعلیٰحضرت بندگان عالی کی منظوری خاص کے بعد اس علاقہ سے متعلق نظم و نسق و انتظامات کے لیئے قواعد و ضوابط نافذ کیئے گئے۔

۴۔ تتمہ برار:۔ ۱۹۰۲ء میں مہاراجہ کی مدار المہامی کے دور میں برار کے متعلق دوامی پٹہ کا معاہدہ ہوا تھا اور اب عجیب اتفاق ہے کہ پھر مہاراجہ ہی کی صدارت عظمیٰ میں اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی کی تخت نشینی کے وقت سے سعی پیہم لارڈ ریڈنگ کے ساتھ خط و کتابت اور دیگر وائسراؤں سے متعدد بار گفت و شنید کے بعد بتاریخ ۲ شعبان المعظم ۱۳۵۵ھ م ۲۴ اکتوبر ۱۹۳۶ء تتمہ برار پر اعلیٰ حضرت ظل سبحانی نے دستخط ثبت فرمادئے جس کی رو سے طے پایا کہ۔

> گورنر صوبجات متوسط و برار کے تقرر میں اعلیٰحضرت قدر قدرت کی رضامندی ضروری ہوگی' برار میں جب کبھی برطانوی پرچم بلند کیا جائے گا اس کے ساتھ ہی پرچم آصفی بھی لہرایا جائے گا حضور والا برار کی رعایا کو خطابات سے سرفراز فرماسکیں گے۔ مساجد برار میں حضور اقدس و اعلیٰ کے نام کا خطبہ پڑھا جاسکے گا۔

---

[1] عصر جدید۔ از جانکی پرشاد۔

حضور والا کا ایک ایجنٹ برار میں مقرر ہو سکے گا۔ ولی عہد سلطنت آصفیہ ہز ہائنس پرنس آف برار کے نام سے مخاطب فرمائے جائیں گے۔

علمی و ادبی خدمات

مہاراجہ نے ان خدمات کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی خدمات بھی انجام دی ہیں آپ ستّر سے زائد فارسی اور اردو نظم و نثر کی کتب کے مصنف ہیں۔ (۵۰) سے زائد اردو نظم و نثر کی کتابیں لکھ کر آپ نے زبان اردو پہ بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اور اردو کے محسنوں میں اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کرلی ہے۔ شعرا اور ادیبوں کی سرپرستی فرما کر اپنی علم دوستی اور عالم نوازی کو ضرب المثل بنا دیا۔ مہاراجہ نے حضرت غفران مکانؒ کے عہد میں اپنی زیر ادارت دو رسالے بھی نکالنے شروع کئے تھے۔ ایک نثر میں "دبدبہ آصفی" کے نام سے جس میں مختلف مسائل پر علمی و ادبی مضامین نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں شائع ہوئے جس کے چند منتخبہ مضامین کا ایک مجموعہ "ارمغان وزارت" کے نام سے ۱۹۰۲ء میں شائع بھی ہوچکا ہے۔ دوسرا پرچہ "محبوب الکلام" کے نام سے نکلتا تھا۔ اس میں صرف فارسی و اردو کا منظوم کلام شائع ہوتا تھا۔ اور محبوب دکن محبوب السلاطین حضرت آصف بھی اپنا کلام مرحمت فرماتے تھے۔

فرقہ وارانہ فسادات

مہاراجہ کا دور وزارت امن کا دور تھا۔ فرقہ وارانہ کشیدگیوں سے پاک بیرونی اثرات کی آلائشوں سے مبرا اور مذہبی مناقشات سے محفوظ۔ اس کا سبب مہاراجہ کی بلند پایہ شخصیت اور مہاراجہ کا مقبول عام کردار تھا۔ مہاراجہ سے بلا لحاظ و تخصیص مذہب و ملت سب کو مساوی عقیدت اور محبت تھی۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایسے لوگ بھی جن کو حکومت سے مخالفت تھی اور آئے دن وہ حکومت کے خلاف زہر اگلتے تھے وہ آپ کے گرویدہ اور معتقد ہونے کی حیثیت سے آپ پاس حاضر ہوتے اور آپ کی ذات سے مطمئن ہو کر جاتے تھے۔

مسجد جعفری کے سلسلہ میں جو شیعہ سنی فساد ہوا تھا اس میں مہاراجہ نے ہر دو فرقوں کو نصیحت فرمائی اور اپنے شخصی اثر سے کام لیکر اس کو فرو کرنے کی ہر طرح کوشش کی جس سے اعلیٰ حضرت بندگان عالی بہت خوش ہوئے۔

اس ناخوشگوار واقعہ سے جو خورداد ۱۳۴۷ف میں دھول پیٹھ میں پیش آیا مہاراجہ کو بڑا دکھ ہوا۔ اور ایک سال تک خاموش رہنے کے بعد جب ملک کا افتراق و انتشار دیکھ کر آپ سے رہا نہ گیا تو آپ نے خورداد ۱۳۴۸ف کو ایک مضمون "ہندو بھائیوں سے خطاب" کے عنوان سے لکھا جس میں کچھ ایسی اعجازی قوت تھی کہ ہندو اور مسلمان مہاراجہ سے اپنی عقیدت اور خلوص و محبت کے باعث یک لخت اپنی ناروا اور نازیبا حرکتوں سے باز آگئے۔

کس قدر صداقت ہے آپ کے اس قول میں!

"میں حسباً و نسباً ہندو ہوں لیکن اسی اسلامی حکومت میں وہ تمام اعزاز مجھ کو عطا کئے گئے ہیں جو اسی اسلامی حکومت کے لئے مخصوص ہیں۔ یاد رکھیے کہ جو مراحم و الطاف مجھ پر اور میرے ہندو خاندان پر اب تک مبذول ہیں اس پر مسلمان امرائے عظام بھی رشک کرتے ہیں۔"

کس قدر جادو کا اثر ہے اس تحریر میں۔ آپ بیرونی مفسدہ پردازوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ۔

"تم دریائے راوی میں طوفان پیدا کر لو مگر موسیٰ و عیسیٰ کے سنگم میں افتراق پیدا نہیں کر سکتے۔"

ان الفاظ سے مہاراجہ بہادر کے قلب کی گہرائیوں کی کس اچھے طریقہ سے ترجمانی ہوتی ہے!

"ہماری صرف لفظوں میں غلامی ان کی خطرناک آزادی سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر اس کو بیرون ملک کے باشندے غلامی سمجھتے ہیں تو اس پر ہزاروں آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ اگر یہ غلامی ہے تو دنیا میں آزادی کا صحیح تصور کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔"

شاہ ذیجاہ سے آپ کی عقیدت کی انتہا نہیں ہوتی جب آپ ایک والہانہ اور وفادارانہ جذبہ کے تحت اس طرح ہندو بھائیوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ

"اس کی ذات سراپا رحمت ہے اور اس کا محترم وجود سراپا برکت ....

.... اگر عافیت اندیش ہو تو بادشاہ ذیجاہ کے قدموں پر اپنی پیشانیاں رکھ دو

اور یقین کرلو کہ تمہاری نجات انہی کے سایہ میں ہے۔"

مہاراجہ کا سیاسی مسلک

مہاراجہ کے سیاسی مسلک سے متعلق بہت ہی مختلف خیالات ہیں لیکن ان اختلافات سے ہٹ کر جو چیز مہاراجہ کے سیاسی مسلک میں سب کے پاس مشترک ہے وہ آنجہانی کی شاہ پرستی اور وفاکیشی اور ملک و مالک کی خدمت کا وہ والہانہ جذبہ ہے جس کا اظہار مہاراجہ کی روزمرہ زندگی میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود آپ فرماتے تھے[1]:

"اہل ملک کی خدمت گزاری اور مالک کی جاں نثاری کا گرانبار فرض ایسا سہل نہیں ہے کہ میں یہ سمجھ سکوں کہ میں نے ان کا کوئی حق کما حقہٗ ادا کیا ہے۔

خدمت گزاری اور جاں نثاری کے جذبات اپنے اندر ایک بے پایاں سمندر رکھتے ہیں جس میں خود کو اور اپنے کام کو ایک خطرۂ بے مقدار کے برابر خیال کرتا اور تمنا رکھتا ہوں کہ ان جذبات کے احساس اور ادائی فرائض میں ہمیشہ سرگرم رہوں۔"

آپ کے نزدیک ملکی و غیر ملکی کا تصور یہ تھا کہ "جو مالک اور ملک کی خدمت، اہلیت، دیانت اور درد سے کرے اور انسانوں کی خوشنودی کو ترجیح دے وہ سچا ملکی ہے عام اس سے کہ عرف عام میں وہ غیر ملکی ہو اور وہ ملکی بدترین غیر ملکی ہے جو ذاتی اغراض کو ملک کے مفاد پر ترجیح دے۔ یہی کسوٹی ہے جس پر میں شخصیتوں کو کستا ہوں۔" ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "جب تک میں زندہ رہوں میں ملک و مالک کی خدمت گزاری کے لئے ہر وقت مستعد ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کو ان کے لئے وقف کر دیا ہے۔" یہ صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ اس پر پوری طرح سے تادم مرگ آپ

---

[1] تقریر بافتتاح جدید عمارت صدر جمعیتہ امداد باہمی۔ ۲۸ آذر ۱۳۴۲ف۔

عمل پیرا رہے اور "قول مرداں جان دارد" کے مصداق اپنے قول کو صحیح ثابت کرکے دنیا کو یہ بتلا دیا کہ حقیقی وفاداری اور شاہ پرستی کیسی ہوتی ہے!

ہند و مسلم اتحاد کے آپ دل سے خواہاں تھے۔ اور اپنی ہر تقریر و تحریر میں اس دلی آرزو کا اظہار کیا ہے۔ تعصب سے آپ کو سخت نفرت تھی۔ رواداری آپ کا طغرائے سیاست تھا "ہندو مسلم رعایا آپ کی دو آنکھیں" تھے اور مشرقی ثقافت کے حامل "تعصب کو آپ ملکوں اور قوموں کے زوال اور تباہیوں کی بنیاد تصور فرماتے تھے اور اکبر کی طرح ملک کی ترقی کو ہندو مسلم اتحاد پر منحصر خیال کرتے تھے۔

آپ کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت سے مملکت آصفیہ کے تعلقات ہمیشہ دوستانہ اور خوشگوار رہیں جس میں ہر دو مملکتوں کا مفاد ہے۔

کسی کو خارج البلد کرنا آپ کے سیاسی شعار کے خلاف تھا آپ کا خیال تھا کہ ملک کے اندر رکھکر ہی اخلاق کے ذریعہ کسی کو زیر کیا جاسکتا اور سیدھے راستہ پر لایا جاسکتا ہے۔ شہر بدر کرکے اس کو آزاد چھوڑنا اس کو شرارت کے اظہار کا اور زیادہ موقع دینا ہے۔ یہی مسلک تھا جس کے تحت آپ کی صدارت عظمیٰ کے زمانہ میں بہت سے خارج البلد پھر واپس بلوائے گئے۔

ملک کی ترقی کے لئے آپ مذہب کی پابندی کو ضروری سمجھتے تھے اور خیال تھا کہ

"مذہبی پابندی چھوڑنے سے انسان شتر بے مہار ہوکر گو اپنے کو آزاد سمجھنے پر اصل میں ایسی آزادی کو وہ ایمان کو اڑا دینے والی بارود ہے"[1]

آپ نے آزادی کا حسب ذیل تصور پیش کیا ہے۔

"دراصل سچا آزاد وہی عالی حوصلہ خوش وقت بلند بخت بندہ ہے جو اولاً صفت راستی و راست بازی سے متصف ہو اور ثانیاً طمع و حرص کو اپنے دل سے دور کرچکا ہو۔

---

[1] معراج ترقی۔ از مہاراجہ آنجہانی۔

جو سچا آزاد ہے وہ قیود طبعی و تمدنی سے پریشان نہیں ہوتا اور نہ ان کو اپنی آزادی کا مانع و مخل سمجھتا ہے۔"[1]

پھر آپ نے موجودہ دور کی آزادی پر کس اچھے طریقہ سے طنز کیا ہے۔

"آزادی اس کے معنی نہیں کہ صبح اٹھتے ہی چھوٹی حاضری و کھائی وہ پہر کو بریکفسٹ پہر کو چائے شب میں ڈنر اور سلیپنگ سوٹ پہنکر بدررم میں گئے اور دراز ہوگئے۔ یا یہ کہ ہسکی سوڈا پیا۔ شامپین کی بوتل خالی کی۔ وہ درجن سگریٹ کا دھواں اڑا یا۔"

آج کل کی آزادی آپ کے نزدیک "فراغت کی مشت خاک اڑادینے والی آندھی ہے۔"

دور حاضر کی جمہوریت کے متعلق "ہندوستانیوں سے خطاب" میں کیسی اچھی تنقید فرمائی ہے۔

"ہماری حکومت ہماری ہے۔ اور نام نہاد جمہوریت کی نام نہاد حکومت کے مقابلہ میں جو امن شکنی کا درس دیتی ہے۔ جو معصوم بندگان خدا پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑتی ہے جو انسانیت کے خون سے اپنی ہوس حکمرانی کی پیاس بجھاتی ہے جو ناواقف جہلا کو ابھار کر ان میں نفرت و حقارت کا بیج بوتی ہے ہماری حکومت کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور نہ ان کے خصوصیات کا اندازہ کرسکتی ہے۔"

گویا نواب بہادر یار جنگ بہادر کے الفاظ میں

"جس بات کو مسٹر گاندھی نے راجکوٹ پہنچکر پایا کہ مطلوب حقیقی اچھی حکومت ہے۔ نہ کہ کسی خاص قسم کی حکومت اس کو مہاراجہ نے اپنے تحریر کی بنا پر آج سے برسوں قبل معلوم کرلیا تھا۔"

بہر حال مہاراجہ کی خدمات ریاست حیدرآباد کی تاریخ کا زرین باب ہے۔ اور لوگ ہوں گے جنہیں حیدرآباد کی صدارت سے امتیاز و افتخار حاصل ہوا ہو لیکن آنجہانی کی ذات ستودہ صفات پر خود صدارت عظمیٰ کو ناز ہے اور بجا ناز ہے۔ قلمرو کی جس شعبہ پر نظر ڈالی جائے مہاراجہ آنجہانی کی اصلاح پسند

---

[1] آزادی۔ از مہاراجہ آنجہانی ۱۹۰۵ء

طبیعت کا کوئی نہ کوئی اثر ضرور نظر آئے گا۔

فقیروں اور صوفیوں کی پرورش، غریبوں کی غم خواری، رواداری، سخاوت، خوش اخلاقی، غرض یہ وہ صفات تھے جن کی وجہ سے مہاراجہ نے اس قدر طویل عرصہ تک نہایت نیک نامی اور مقبولیت کے ساتھ مدار المہامی اور صدارت عظمیٰ کے فرائض انجام دیئے اور یہ شرف بہت کم لوگوں کو حاصل ہے کہ وہ حکمرانوں کے عہد میں کارگزاری مقبول اور پسندیدہ رہی ہو اور مرتے دم تک ملک ومالک کی نظر میں سچے وفادار جان نثار اور بہی خواہ ملک ومالک رہنا میسر ہوا ہو۔ تب ہی تو حضرت ظل سبحانی نے مہاراجہ کی وفات پر مرتیر ۱۳۴۹ف کو رنج کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"پرانی بساط کا آخری مہرہ اٹھ گیا" اور جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو دو لاکھ سے زائد آدمی ساتھ تھے مختصر یہ کہ جس طرح نورتن اکبری راجہ ٹوڈرمل جیسے در بے بہا کی وجہ سے جگمگا اٹھا تھا اسی طرح نورتن عثمانی مہاراجہ جیسے گوہر بے مثال کی وجہ سے ضیا بار اور نور افگن تھا۔ ــــ اب اُس کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترس رہی ہیں۔

محمد بن علی باوہاب
متعلم بی۔اے (آخری)

حضرت شادؔ کی نظم و نثر

"اس مضمون پر ادارہ کی جانب سے انعام اوّل دیا گیا" "ادارہ"

دلی اُجڑی تو لکھنؤ اور حیدرآباد ہی ایسے دو مقام تھے جہاں اہل علم و فضل کے لئے حوصلہ افزا فضاء میسر آسکتی تھی دکن کے بادشاہوں کی سرپرستیاں اور معارف نوازیاں ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور تھیں۔ شاہی دربار ہر وقت نواردا و غریب الوطن شعراء کے لئے کھلا رہتا تھا۔ مہمان نوازیاں چشم براہ رہتی تھیں۔ بادشاہ تو خیر بادشاہ ہی تھے۔ لیکن یہاں کے امراء کی جود و سخا نے بھی ہزاروں علماء و فضلاء اور شعراء کو کسب معاش سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان امراء کی صف میں مہاراجہ چندو لال شادؔاں سب سے آگے تھے۔ مہاراجہ چندو لال شادؔاں کا ایوانِ علم و ادب شعر و سخن کی شیریں صداؤں سے گونج رہا تھا دربار میں بہترین شعراء و ادباء جمع تھے نصیرِ دہلوی اور حفیظ کو بھی اس خوان کرم سے فیض یاب ہونے کا شرف حاصل تھا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے آنکھ کھولتے ہی اپنے گھر کو شعر و سخن کی فضاء سے معمور پایا۔ گویا کہنا چاہئے کہ شاعری مہاراجہ کی گھٹی میں پڑی تھی۔

انسان کی زندگی اور اس کے رجحانات دراصل اس کے اپنے ماحول کے آئینہ دار ہوتے ہیں جس شخص کی پرورش ایسی علمی فضاء میں ہوئی ہو اس کا ادیب بننا ایک یقینی امر تھا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر بتاریخ ۱۸ شعبان المعظم ۱۲۸۰ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۸۶۴ء اپنے نانا راجہ نریندر پرشاد کے گھر پیدا ہوئے آپ کے والد راجہ ہری کشن پرشاد بہادر تھے۔ مہاراجہ نریندر پرشاد بہادر کے کوئی اولاد نہ تھی۔ نواسے ہی کو اپنا فرزند تصور کرتے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت میں

انھوں نے خاص دلچسپی لی۔ اور عربی و فارسی کے قابل اساتذہ مقرر کئے۔ مہاراجہ کو عربی اور فارسی کے علاوہ تلنگی اور مرہٹی کی بھی تعلیم دی گئی۔ فن خطاطی میں انھوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ مدرسہ عالیہ میں انگریزی تعلیم کی غرض سے شریک کئے گئے۔

مہاراجہ کی تصانیف | مہاراجہ نے اُردو فارسی کی تقریباً ساٹھ سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ جو ان میں سے اکثر ان کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں مجموعہ غزلیات، ناول، افسانے، رباعیات، قطعات، سفرنامے، نظمیں، دیگر مضامین اور مذہبی کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر نہایت ہی اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ ان کے ساتھ دیباچہ، مقدمہ اور تقریظ وغیرہ بھی شامل ہے۔ لیکن بعض کتابوں کی اشاعت میں نہایت ہی بے احتیاطی برتی گئی ہے۔ سنہ اشاعت بھی درج نہیں ہے۔ کتابوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ باغ شاد ۔ ۲۔ بیاض شاد ۔ ۳۔ جذبات شاد ۔ ۴۔ ضلع جگت ترانہ شاد ۔ ۶۔ نگاہوالا آنکھ والے کی تلاش میں ۔ ۷۔ رباعیات شاد ۔ ۸۔ صبح امید ۔ ۹۔ مثنوی نسیم سحر ۔ ۱۰۔ نغمہ شاد ۔ ۱۱۔ رقعات شاد ۔ ۱۲۔ خم کدہ رحمت ۔ ۱۳۔ ایمان شاد ۔ ۱۴۔ خمار شاد ۔ ۱۵۔ آشوب عظیم ۱۶۔ سیر پنجاب ۔ ۱۷۔ دسہرا ۔ ۱۸۔ بزم خیال ۔ ۱۹۔ مطلع خورشید ۔ ۲۰۔ سیر ناگپور ۔ ۲۱۔ تفریح شاد ۲۲۔ سیر و سفر ۔ ۲۳۔ ارمغان وزارت ۔ ۲۴۔ مخزن القوافی ۔ ۲۵۔ مثنوی آئینہ وجود ۔ ۲۶۔ شگوفہ بہار ۲۷۔ ارمغان زیبا ۔ ۲۸۔ وظائف شاد ۔ ۲۹۔ نذر سلطان ۔ ۳۰۔ گلبن تاریخ ۔ ۳۱۔ ماتم حسین ۳۲۔ دین حسین ۔ ۳۳۔ فریاد شاد ۔ ۳۴۔ رین بسیرا ۔ ۳۵۔ پریم درپن ۔ ۳۶۔ جلوۂ کرشن ۔ ۳۷۔ جذبہ شاد ۔ ۳۸۔ اسپیچ محبوب گنج ۔ ۳۹۔ روضۂ شریف ۔ ۴۰۔ بزم شاد ۔ ۴۱۔ مجموعہ مناجات ۔ ۴۲۔ موتیوں کی لڑی ۔ ۴۳۔ سفر شاد نگر ۔ ۴۴۔ قدوم سلطانی ۔ ۴۵۔ محبوب الکلام ۔ ۴۶۔ لطائف بے نظیر ۔ ۴۷۔ جام جہاں نما ۔ ۴۸۔ معراج ترقی ۔ ۴۹۔ آزادی وغیرہ ۔

چند اہم کتابوں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

"باغ شاد" شاد کے کلام کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۳ھ میں شائع ہوا اس میں ۱۰۶ غزلیں ہیں

جن میں کل ۱۹۸۴ اشعار ہیں دو خمسے چار قصیدے اور آخر میں چند رباعیاں بھی شامل کردی گئی ہیں۔
اس کتاب میں متعدد اصحاب کی نظم و نثر میں تقاریظ یا رائیں بھی شامل ہیں۔

"بیاضِ شاد" یہ دوسرا دیوان ہے جو ابتدا میں کلام شاد کے نام سے چھپا تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں کچھ فارسی غزلیات کا اضافہ کیا گیا اور بیاضِ شاد کے نام سے طبع کیا گیا۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر غزل کے ساتھ تاریخ اور مقام بھی درج ہے۔

"رباعیات شاد" اس نام سے مہاراجہ کی چار کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب میں مہاراجہ کی رباعیاں قطعات وغیرہ شامل ہیں۔ ایک جلد میں صرف وہی رباعیاں شامل ہیں جو حضرت غفرانمکان کے گراں بہا اشیاء مثلاً گھڑیاں، آم، تصاویر، جواہر وغیرہ عطا فرمانے پر ان کی سپاس گزاری میں پیش کی گئی تھیں۔

ترانہ شاد یہ ایک مجموعہ ہے جس میں تمام ٹھمریاں اور ترانے شامل ہیں اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد نہ صرف غزلیات اور قصائد کے میدان میں شاعری کرتے تھے بلکہ ٹھمریاں اور ترانے کہنے میں بھی انہیں خوب مشق تھی۔

آنکھ والا آنکھ والے کی تلاش میں

اس کتاب کا اسلوب بیان دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ اس میں وہ حالات درج ہیں جو ناگپور کے سفر میں پیش آئے تھے۔ مہاراجہ نے ایک بزرگ کی تلاش میں یہ سفر اختیار کیا تھا۔

"سیر پنجاب"

یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی ادبی حیثیت سے یہ مہاراجہ کی کتابوں میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ۶ جون ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ نے عرس میں شریک ہونے کی غرض سے اجمیر کا سفر کیا تھا۔ اس میں حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کی سوانح عمری کے علاوہ وہ تمام واقعات درج ہیں جو دوران سفر میں پیش آئے۔ اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر شہر کا نہایت ہی گہری نظر سے معائنہ کیا ہے۔ اور وہاں کے باشندوں کی طرز زندگی وغیرہ سے متعلق تفصیلی معلومات بہم پہنچائے گئے ہیں

مہاراجہ کی تصانیف میں بڑی تعداد سفرناموں کی ہے انھوں نے اپنے سفر کے حالات روزنامچہ کے طریقہ پر قلمبند کئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہندوستان و بیرون حیدرآباد سے متعلق ہیں اور بعض اندرون حیدرآباد ہی کے حالات سفر پر مشتمل ہیں اُردو ادب میں سفرناموں کی جو کمی محسوس کی جاتی تھی اس کی مہاراجہ نے بڑی حد تک تلافی کردی ہے۔ یہ سفرنامے ادبی اور افادی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہیں ان کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مقام کا نہایت ہی گہری نظر سے معائنہ کرتے تھے بہت سی نئی اور مفید معلومات بہم کی گئی ہیں۔ ہر سفرنامے کی ابتدا میں سفر کے فوائد پر مہاراجہ نے بطور دیباچہ کے مضمون لکھا ہے اور سفر کی وجہ بھی ساتھ ہی بیان کی ہے ان کی تحریر میں سادہ اور شستہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ کہیں کہیں منظر کشی کے لئے لطیف استعارے اور تشبیہوں سے بھی کام لیا ہے۔ باشندگان ہند اور ان کی طرز معاشرت پر تنقیدی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ بعض ان مشہور ہستیوں کا بھی مناسب الفاظ میں تعارف کرایا گیا ہے جن سے مہاراجہ کو دوران سفر میں ملاقات کرنے کا موقع ملا تھا۔ چنانچہ سیر پنجاب میں مولانا حالی کی ملاقات کو ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔

"آج شمس العلماء مولوی الطاف حسین حالی تشریف لائے۔ ان کا دم نہایت غنیمت ہے گو پیری نے اپنا عمل دخل کر لیا ہے مگر دل جوان ہے اور عقل آزمودہ کار۔ ان کی ہر بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر ایسی اترتی ہے جیسے انگوٹھی میں نگینہ خدا زندہ رکھے لطف صحبت سے نہایت محظوظ اور مستفید ہوا"

"رقعات شاد" مہاراجہ کے صاحبزادہ نے ان کے تمام خطوط کا مجموعہ رقعات شاد کے نام سے مرتب کیا ہے۔ ان رقعات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مہاراجہ ہر مذاق کے آدمی سے روابط قائم رکھتے تھے۔ چنانچہ اس کتاب میں وہ خطوط درج ہیں جو اطبا، شعرا، ادبا، مشایخ اور علماء کے نام لکھے گئے تھے۔ خطوط میں سادہ اور صاف زبان استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ماہر القادری صاحب نے اپنے مضمون میں جو خط شائع کیا ہے اس کا اسلوب بیان ان خطوط سے بالکل جدا ہے۔

"اسپیچ محبوب گنج" مہاراجہ کی ایک کتاب "اسپیچ محبوب گنج" کے نام سے شائع ہوئی ہے در اصل وہ تقریر ہے جو ضلع اندور کے دورے کے بعد عوام کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ اس کے جملے اور الفاظ مہاراجہ کی

عام تحریروں سے بدلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"اگرچہ میں نے خیال کیا تھا کہ پندرہ روز کی مہلت ایک ضلع اور اس کے متعلقہ تعلقوں کی تنقیح کے لئے کافی ہوگی۔ مگر اب تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ اگر اچھی طرح بہ اطمینان کسی ضلع کی تنقیح معہ اس کے تعلقات کے کی جائے۔ تو اس سے زیادہ مدت ضرور درکار ہوگی۔"

ان کی تصانیف میں مذہبی کتابیں بھی شامل ہیں۔ جن میں سے اکثر کی تفصیل تصانیف کے ضمن میں دی گئی ہے۔ انھوں نے بعض اصلاحی مضامین بھی لکھے ہیں جو ادبی رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تصنیف "دسہرہ" میں راجہ رام چندر جی کی سوانح عمری درج ہے۔ جو کسی پنجاب کے رسالہ کے لئے قلمبند کی گئی تھی۔ اور بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

مہاراجہ کی تحریر پر مغربی دفاتر کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ تشبیہ و استعارہ بھی استعمال کرتے تھے [illegible] کی پابندی سے آزاد رہنا پسند تھا جو کچھ دل میں ہوتا تھا مناسب اور موثر انداز میں صفحہ قرطاس پر نقش کر دیتے تھے۔ منظر کشی کے بہت دلدادہ تھے۔ اور روزنامچوں میں بھی جہاں کہیں موقع ملتا ہے الفاظ کی مصوری کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ ان کی تحریر میں تاریخی تلمیحات بھی بکثرت موجود ہیں لیکن بہت ہی عام اور مناسب مثلاً سفر شاد نگر میں تحریر فرماتے ہیں "آبادی کا حصہ ایک خونی منظر ہے [illegible] ملک گیری۔ دارا کی جاہ پرستی جولیس سیزر کی خون آشامی یزید کی شقاوت قلبی۔ چنگیز و ہلاکو [illegible] سوزی و سفاکی سے قطع نظر کیجئے"

اپنے دوسرے ہم عصروں کی طرح نثر میں بھی انگریزی الفاظ بے تکلف استعمال کرنے کے عادی [illegible] مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ یہاں نہ تو شہروں کے سے کلب ہیں اور نہ سوسائٹیاں۔

۲۔ [illegible] والی ٹرین میں انگریزی ٹرین کے منتظم سے ملاقات ہوئی

۳۔ [illegible] سے سینری کا اسکیچ لیا اور واپس ہو۔ (از سفر شاد نگر)

یہ تمام انگریزی الفاظ ایسے ہیں جنھیں آج بھی ہم گفتگو میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ اگر

شاد نے آج سے بہت پہلے ایسے مانوس انگریزی الفاظ جن کو جہلا بھی سمجھ سکتے ہوں۔ استعمال کئے ہوں تو قابل اعتراض نہیں۔

سرشار مرحوم سے مہاراجہ کے بہت گہرے روابط تھے انہی کے مشورہ سے مطالعہ بھی کرتے اور لکھتے بھی تھے۔ رقعات شاد میں سرشار مرحوم کے نام بیسیوں خط موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم ادب کے معاملہ میں سرشار سے مشورہ کیا کرتے تھے شاید انھیں کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا کہ ناول نویسی کی طرف بھی توجہ مائل ہوئی ان کی ناولیں فنی نقطہ نظر سے خاص اہمیت نہیں رکھتیں ان میں معاشرت و سماج کے مذموم رواجوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا ہے اور ناول کو موثر بنانے کی امکانی کوشش کی گئی ہے۔

مہاراجہ کی نثر ادبی اعتبار سے اتنی قابل قدر نہیں ہے جیسے کہ وہ افادی نقطہ نظر سے خیال کی جا سکتی ہے۔ ان کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جس کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو اس کے اقتضا کے مطابق اسلوب بیان اختیار کر لیتے ہیں۔ سیرت نگاری پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تحریر میں وہ ساری خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں جو ایک سوانح نگار کے لئے ضروری ہیں ادیبوں سے مخاطب ہوتے ہیں تو ادبی پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔

یوں تو مہاراجہ نے متعدد موضوعات پر قلم اٹھایا ہے لیکن ان کے قلم کی روانی سفرناموں کے سرانجام دینے میں نہایت کامیاب رہی۔

مہاراجہ نے "ضلع وجگت" بھی ایک کتاب لکھی ہے اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ اس موضوع پر ان کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس میں جہاں ضلع وجگت کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ شاعری سے اس کا تعلق اور اہمیت بھی واضح کی گئی ہے۔

شاعری مہاراجہ بہادر نے ابتدائی زمانہ میں رائے بجولال "تمکین" سے خط اطلی سیکھی تھی اور فارسی کلام میں بھی ان سے اصلاح لیتے تھے۔ حضرات غفرانمکاں سے انھیں شرف تلمذ حاصل تھا انھوں نے اپنی تصنیف "جذبات شاد" میں اس کا ذکر کیا ہے آخری زمانہ میں اردو کلام فصاحت جنگ "جلیل"

اور فارسی علامہ ضیا یار جنگ بہادر "ضیا" کو دکھاتے تھے ۔

غزلیات | مہاراجہ نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ۔ ان کے ماحول ہی کا اثر ہے کہ غزلیات میں تصوف کا رنگ جھلک رہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس خصوصیت کو اپنے جد اعلیٰ مہاراجہ چندولال "شاداں" سے حاصل کیا ہے ۔ غزل کے متعلق جناب "نیاز" صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شاعری کے تمام اصناف میں غزل گوئی کی روح کی گہرائیوں اور قلب کے اعماق سے خبر دار کرنے والی چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف غزل ہے ۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ غزل کا ارتقا تصوف ہے ۔ مگر تصوف سے مراد علوِ فطرت عروج روحانیت و انتہائی تصور ہے جہاں انسان مادیت سے گذر کر اپنے مرکز اصلی نور ربانی و جلوہ حقیقی سے ہم آغوش ہوتا ہے اور تمام امتیازات دنیوی کے ساتھ امتیاز مذہبی کو بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے ۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل ہی میں جو منزل لب بام ہوا کرتی ہے شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے اور دنیوی زیر و بم میں بھی اس نغمہ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر دم اس کو لذت سے بیخود رکھتا ہے یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے اور بہت کم ایسے ہیں جو "بیدل" کے مرتبہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں ۔ لیکن فطری دو ہی شاعر خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل میں ہو نہ اس سوز و گداز سے دو تا ثیر اس حلاوت زبان اور اس حقیقت و صداقت سے معرا نہیں ہو سکتا جو فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہیں کی جا سکتی ۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر "شاد" کی غزلیات متذکرہ بالا خصوصیات کی حامل ہیں وہ صوفی تھے انھوں نے تصوف کا نہایت ہی دقت نظری سے مطالعہ کیا تھا اور ان کا مسلک کفر و اسلام کی قیود سے آزاد تھا وہ صوفی ہونے کی حیثیت سے وحدت وجود ہی کو اپنا ایمان سمجھتے تھے دیر و حرم مسجد و کعبہ ہر جگہ شاہد اصلی کے جلوہ سے اپنی آنکھوں کو روشن کرتے تھے ۔

شراب عشق و مستی کے سرشار اور بزرگان دین کے عقیدت شعار پیرو تھے انھوں نے اپنے صوفیانہ مسلک کا متعدد اشعار میں اظہار کیا ہے ۔

دیر و کعبہ میں گئے اور کبھی بتخانہ میں کبھی پابند رہے شاد اور آزاد کبھی

کفر و اسلام کے جھگڑوں سے مبرا ہے شاد یہ گرفتار تیرا سب سے ہے اے یار جدا

اے شاد کفر و دیں کے جھگڑوں سے باز آ ہوتا نہیں ہے ان سے تو آزاد کس لئے

مہاراجہ بہادر کی زندگی پر تارک الدنیا فقیروں کا بہت گہرا اور دیرپا اثر پڑا وہ دنیوی دولت پر دین کی نعمت کو ترجیح دیتے تھے۔ اس صوفیانہ طریق ہی کا نتیجہ تھا کہ شان و شوکت اور منصب و دولت سے بیزاری پیدا ہو گئی تھی۔ جو کچھ آتا وہ تقسیم کر دیتے تھے۔ اور اپنے لئے دولت وحدت ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ انھیں فقیری پر فخر تھا اور باطن کی شاہی پر ناز۔

فقر سے عزت ہے میری فخر ہے میرے لئے چھوڑ کر باطن کی شاہی تاجداری کیا کروں

وہ طالب دنیا ہے میں ہوں طالب مولیٰ منعم سے میری شاد طبیعت نہیں ملتی

شاد کا مطالعہ نہایت ہی وسیع تھا اردو فارسی شعراء کا کلام ہمیشہ مطالعہ میں رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بہت سی خصوصیات و محاسن کا حامل بن گیا ہے۔ یہ اپنے کلام میں عشق حقیقی فقر و فقیری اور عقیدہ توحید کی تلقین کرتے ہیں۔

چشم وحدت سے دیکھتا ہوں جدھر نظر آتا ہے تو ہی تو مجھ کو

بادہ خمخانۂ توحید کا مے نوش ہوں چور ہوں مستی میں ایسا بیخود و بیہوش ہوں

مئے عشق ہر کس و ناکس کو میسر نہیں آتی اس کے لئے وسیع ظرف کی ضرورت ہے وہی اسے حاصل کر سکتا ہے جو سخت کوش اور جانکاہی کو خاطر میں نہ لائے۔

کچھ آساں نہیں دعویٰ عشق و الفت جو مشکل نہ حل ہو وہ مشکل یہی ہے

شاد کو آنحضرت صلعم کی ذات سے والہانہ عشق تھا۔ وہ آپ کی محبت میں سرشار و بے خود رہتے تھے۔ "نمکدہ رحمت" میں انہی قلبی تاثرات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے
اس کتاب میں نعتیہ اشعار جمع کئے گئے ہیں۔ زبان شستہ، اسلوب شگفتہ اور تخیل بلند ہے۔ ان ہی خصوصیات نے ان کے دیوان کی قدر و قیمت بڑھادی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "شاد" کا سینہ نور محمدی سے روشن ہے۔ ان کی بدمستی و خود فراموشی کا یہ عالم ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں ان کی نظروں کے سامنے شمع عرفان ہے جس کا طواف کرنا ان کا مقصد حیات ہے۔

پیمبروں میں کوئی ایسا آفتاب نہیں　　حضور احمد مختار کا جواب نہیں
حضور سرورِ عالم کی شان صلی علی　　کہ کائنات میں ان کا کوئی جواب نہیں

ہے احمد بے میم کا دربار مقدس　　جو عرش خدا ہے وہ ہے ایوانِ مدینہ
خاکِ رہ یثرب کو بنادوں گا میں سرمہ　　دیکھوں گا ان آنکھوں سے جو میدانِ مدینہ
زاہد کو ہے جنت کی تمنا تو مبارک　　ہم کو یہی حسرت ہے کہ مل جائے مدینہ
عاشق ہوں مجھے جنتِ فردوس سے کیا کام　　ہے سر میں ازل سے مرے سودائے مدینہ

محمد پہ دل اپنا شیدا ہوا ہے　　ستارہ نصیبے کا چمکا ہوا ہے
خداوند عالم ہے جس طرح واحد　　حبیب خدا بھی تو یکتا ہوا ہے
فقط نعت گوئی سے اے شاد تجھ کو　　یہ عزت ملی ہے یہ رتبہ ہوا ہے

باغِ یثرب سے محبت کی ہوا آتی ہے　　غنچے غنچے سے مجھے بوئے وفا آتی ہے
ہوں فنا ذات میں ایسا کہ پھر ہر سو سے　　ذکر ما کان محمد کی صدا آتی ہے
کفر چھوڑا پی کے مئے توحید کی　　رنگ شاد اب عاشقانہ ہوگیا

شاؔد کا کلام عاشقانہ مضامین سے بھی مملو ہے شوخ نگاری نے جان ڈالدی ہے۔ واردات قلب اور معاملات عشق و مستی کا نہایت ہی لطیف اور دلچسپ انداز میں اظہار کیا گیا ہے۔ زبان کی سلاست، الفاظ کا شکوہ، تخیل کی رفعت اور محاورات کا برمحل استعمال غزل کی شان میں چار چاند لگا دیتا ہے۔

محبت اور بدگمانی لازم و ملزوم ہیں۔ مہاراجہ نے اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے۔

اگلی سی مجھ سے اس کو محبت نہیں رہی — اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ بدگماں نہیں
اے دل خیال خام ہے وہ شک نا مہیں — معشوق ہو کہ تجھ سے کہیں بدگماں نہ ہو

سبحان اللہ آخری شعر میں دل بے قرار پر کتنے تسکین بخش انداز میں معشوق کی بدگمانی کا سبب واضح کیا گیا ہے۔

شاؔد کے آئین الفت میں نالہ و فریاد جرم ہے اور درد اس وقت تک درد نہیں کہلایا جاسکتا کہ عاشق تڑپ تڑپ کر جان نہ دیدے۔

وہ درد ۔ درد کب ہے جو دل میں نہاں نہ ہو — دم دے تڑپ تڑپ کے تو پھر بھی عیاں نہ ہو
مثل پروانہ کے جل جائے مگر اُف نہ کرے — عشق میں نالہ و فریاد کا دستور نہیں
سوز و گداز عشق ہیں میرے نصیب میں — روز ازل سے اس کے لئے آزردہ ہوں
سمجھو نہ مجھ کو تازہ گرفتار عشق کا — اس کا تو ابتدا ہی سے لذت چشیدہ ہوں
تو ہے بے تاب تو میں صبر طلب ہوں اے دل — کیوں پسند آئیگی اب مجھ کو رفاقت تیری
خوگر درد ہوں پروا نہیں کچھ اسکی مجھے — میری فریاد کو سمجھے جو بہانہ کوئی

حضرت غالب کی طرح شاؔد بھی مئے نوشی کے جواز کا اس لئے فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ غم غلط کرنے کا مناسب شغل ہے۔

مئے پیو فکر میں اندوہ میں اچھا ہے یہی — پیر مغاں کا رند کو فتویٰ ہے یہی

غزل گو شعرا میں شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جس نے جناب شیخ پر طعنہ زنی نہ کی ہو۔ حضرت شاؔد بھی

جناب واعظ و شیخ سے برہم نظر آتے ہیں لیکن طرز تخاطب ان کا اپنا ہے۔

کیوں قدم رنجہ کیا شیخ سے پوچھے کوئی — محفل رنداں سے یہ تو تھے نکالے ہوئے
بندے ہیں ہم تو شیخ غفور الرحیم کے — تشویش کچھ نہیں ہمیں یوم القیام کی

ان کی بالغ نظری ملاحظہ ہو۔

شیخ ہم سے نہ الجھ دیکھ جتا دیتے ہیں — رند بھی ایسے کہ ہم حق سے ملا دیتے ہیں

حقیقت نگاری ملاحظہ ہو۔

سوز پر دانہ ملے گا کس طرح سے مرغ کو — راہ عرفاں اور واعظ یہ خیال خام ہے

عالم پیری میں عہد شباب پر آنسو بہاتے ہیں اور ان رنگ رلیوں کو یاد کرتے ہیں جو جوانی کے ساتھ خواب و خیال ہوگئیں۔

وہ ولولہ نہیں وہ طبیعت نہیں رہی — پیری میں یاد آتا ہے عالم شباب کا
آسماں پر گر گرے برق نگاہ تند بار — ابر میں رہ جائے چھپ کر اس کے ڈر سے آفتاب

حضرت "داغ" کا رنگ ملاحظہ ہو۔

وصل کی شب میں نے چھیڑا تو کہا — یہ تیری طرز شتاب اچھی نہیں
قیامت یوں بپا کی ہے انھوں نے آج محفل میں — میرے پہلو سے اٹھ کر متصل دشمن کے بیٹھے ہیں
کسی کی شامت آئیگی کسی کی جان جائیگی — بنا کر صبحت انھوں کو وہ بن ٹھن کے بیٹھے ہیں
آنکھ میں سرمہ لگائے آتے ہیں وہ بہر قتل — رنگ نیلا ہو رہا ہے جوہر شمشیر کا

اشارے غیر سے کرتے ہوئے چتون کے میٹھے ہیں تنی ہے تیغ ابرو قتل کو وہ تن کے بیٹھے ہیں

اس کے مژگاں کی ہے کھٹک شب و روز گویا چبھتا ہے دل میں خار عجیب

مہاراجہ کا کلام محاورہ اور روزمرہ سے مملو ہے۔ انھیں محاورہ استعمال کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا نہایت ہی بے تکلفی سے مشکل سے مشکل محاورہ بھی استعمال کرتے ہیں۔

اب مفلسی کا روز ستارہ ہے اوج پر جو دو سخا نہیں رہے دولت نہیں رہی

تن بے جاں میں جان ڈالی ہے بات میں بات کیا نکالی ہے

ہمیشہ دیکھتے ہیں وہ غضب آلود نظروں سے خدا جانے کہ دشمن کان کیا ہر روز بھرتے ہیں

"شاد جو ہندو مسلماں دونوں میں بدنام ہے راز پوشیدہ نہیں یہ تو طشت از بام ہے"

جب بہار آتی ہے ہوتا ہے جنوں سر پر سوار دھجیاں دامان صحرا کی اڑاتا ہوں میں

تیری آواز کے سننے کا ہوں ہر دم مشتاق شور ناقوس پر کان لگاتا ہوں میں

جب سے اپنا ہاتھ کھینچا ہو گئے ہم بے نیاز اس لئے رہتے ہیں ہم اب پاؤں پھیلائے ہوئے

صبر تکیہ ہے جن کو بہت اچھے ہیں وہ لوگ فکر کرتے ہیں نہ کچھ رنج و الم کرتے ہیں

رباعیات | کوئی تین چار کتابیں رباعیات "شاد" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ ان رباعیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ صوفیانہ، نعتیہ اور مدحیہ۔ عمر خیام کے رنگ میں بھی رباعیاں موجود ہیں لیکن بہت کم۔

رباعی گوئی نہ صرف اس لئے مشکل ہے کہ اس میں ایک مخصوص بحر کی پابندی لازمی ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ چار مصرعوں میں مضمون کو اس درجہ مکمل کر دینا پڑتا ہے کہ کوئی بات تشنہ نہ رہنے پائے۔

عارف کو نہیں چاہئے ادیان سے نفور کعبہ ہو کہ دیر سب میں اس کا ہے ظہور

ہیں دیدہ و دل اس سے روشن اے "شاد" ہے دونوں گھروں میں ایک فانوس کا نور

حق شناسی کی پہلی منزل خود شناسی ہے، جسے اقبال نے خودی کا نام دیا ہے "شاد" کائنات کے اسرار کی تلاش اپنی ذات میں کرتے ہیں۔

دی پیر مغاں نے مجھے اے شاد خبر ہے جملہ یہ کائنات تیرے اندر
تجھ میں ہے خدا اور خدائی میں ہے تو ذرہ بھی نہیں ہے شاد تجھ سے باہر

معشوقِ حقیقی کا اسی وقت پتا ملتا ہے جب کہ دل میں جستجو کا صحیح جذبہ ہو اس کی آخری منزل پر من و تو کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور انسان "انا الحق" پکار اٹھتا ہے۔

ہو عرش بریں پر کہ زمیں پر ہو خدا ملتا ہے اسے جس نے کہ دل سے ڈھونڈا
جس دم کہ ہو ذات سے اس کی واصل منصور کی مانند وہ کہتا ہے "انا"

مئے وحدت کا سرشار کفر و اسلام کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔

وحدت ہی کی تعلیم ہے سب میں بہتر لازم ہے کہ عارف کی ہو وحدت پہ نظر
اسلام سے اور کفر سے کیا کام اسے اے شاد جو رکھتا ہے نظر وحدت پر

"شاد" اپنے مقام کا اعلان کرتے ہیں۔

ہندو ہیں کسی راہ پر اے شاد اڑے مسلم ہیں کسی راستے پر جا کے اڑے
عارف تو پہنچ چکے جہاں جانا تھا یہ تو ہیں قیامت کے پڑے ہیں جھگڑے

پند و نصائح ملاحظہ ہوں۔

اونچی نہیں رکھتا جو کوئی اپنی نظر رہتا ہے وہی شاد ہر ایک سے دب کر
ہمت کو بلند رکھ ہمیشہ اے "شاد" ہے تیرے لئے یہ باعث فتح و ظفر

ہندو مسلم اتحاد کی تلقین فرماتے ہیں۔

ہندو مسلم نہیں آپس میں جدا دونوں کے دلوں میں نہ تعصب ہو ذرا
لازم ہے رہیں شیر و شکر یہ مل کر دن رات یہی ہے دل سے اے شاد دعا

حضرت غفران مکان سے انتہائی عقیدت تھی۔ چونکہ مہاراجہ کی علمی و دیگر ترقیاں دراصل حضرت غفران مکان

لی ہی رہین منت تھیں۔ اس لئے اعلیٰحضرت مرحوم کی مدح میں کئی رباعیاں کہی ہیں۔ ایک بار شہزادوں کی تصویریں حضور نے عطا کی تھیں اس کی سپاس گزاری میں تقریباً ۱۷ رباعیاں پیش کرنے کی عزت حاصل کی۔

آنکھوں میں سمائیں یہ وہ تصویریں ہیں   دل میں اتر آئیں یہ وہ تصویریں ہیں
جو ان کا نظارہ کرے اس کو اے شادؔ   تصویر بنائیں یہ وہ تصویریں ہیں

آئینہ کو بھی میری طرح سکتا ہے   حیران ہے تصویروں کو یہ تکتا ہے
جو شان ہے جو آن ہے جو ہے انداز   اے شادؔ بیاں کس سے وہ ہو سکتا ہے

ایک دفعہ بارگاہ خسروی سے شمشیر کا قبضہ اور گھڑیاں عنایت ہوئی تھیں۔ اس کی سپاس گذاری میں کئی رباعیاں گذران دیں۔

وہ صاحب دکن جو صاحب جوہر ہے   شوکت میں جم اقبال میں سکندر ہے
کی شادؔ کو شمشیر عطا، زرہ لطف   واللہ یہ شمشیر ظفر پیکر ہے

گھڑیاں ہیں یہ وہ جن پہ دل و جان نثار   ہے عمر کی گھڑیوں کا اس پر تو مدار
آتی ہے گھڑی گھڑی زباں پر یہ دعا   پل پل کی دیکھیں خوشی کی گھڑیاں سرکار

شاہزادوں کی سالگرہ کے موقع پر یہ تہنیت رباعی کی شکل میں پیش کیا تھا۔

کیا وقت خوشی ہے کیا مبارک ہے یہ روز   ہے سالگرہ کا جشن عالم افروز
شاہزادوں کے حق میں یہ دعا شادؔ کی ہے   ہر رات شب قدر ہو ہر دن نوروز

مہاراجہ کے معاصرین میں آزادؔ اور حالیؔ جیسے انقلابی شاعر بھی شامل تھے ان کی ان تحریکات کا جو شاعری کے خدوخال کے بدلنے کی غرض سے روبہ عمل لائی جارہی تھیں، ان پر بھی اس کا اثر پڑا اور وہ نظم گوئی کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے مختلف دلچسپ نظمیں لکھی ہیں " پریم درپن۔" ان

سب میں دلکش ہے۔ مہاراجہ نے یہ نظم لکھ کر نظم گو شعرا کی فہرست میں اپنے لئے ایک نمایاں جگہ پیدا کرلی ہے یہ نظم مثنوی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ نگینہ ہے بلا کی آمد روانی ہے بار بار پڑھنے کے بعد وہی لطف باقی رہتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہرِ شکار اک روز جہانگیر — آیا بن میں طالب نخچیر
شہنشاہِ ہندوستاں تھا — رعب شہی چتون سے عیاں تھا
آپ کہیں تھا فوج کہیں تھی — بحر کہیں تھا موج کہیں تھی
ایک خیاباں دور سے دیکھا — گھوڑا اڑا کر واں تک پہنچا
دیکھا پختہ اک مندر ہے — مندر کیا ہے خوش منظر ہے
سامنے اک چشمہ ہے جاری — اور تر و تازہ پھولوں کی کیاری
دیکھا واں اک حور لقا کو — حسن کی دیوی ہوش ربا کو
سر سے پا تک نور کی صورت — تھی وہ پری یا حور کی صورت
سادگی اس کے پیراہن پر — حسن فدا بے ساختہ پن پر
روپ سنگار نام تھا اس کا — کہتے تھے سب پیار سے روپا

ایک نظم اپنے ایک دوست کے بیاہ کے موقع پر فی البدیہہ کہی تھی۔ اور تاریخ بھی نکالی تھی۔ اس سے مہاراجہ کی کہنہ مشقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

نکالی شاد نے تاریخ دل سے — مبارک اتفاق شیعہ و سنی

۱۳۵۱ ہجری

مثنوی نسیم سحر کے عنوان سے ایک نظم اعلیٰحضرت غفران مکان کی سالگرہ کے موقع پر لکھی تھی۔ یہ مثنوی اس ترتیب سے لکھی گئی ہے کہ غفران مکان کے نام کے جملہ حروف مفردہ کے مطابق ہر شعر ایک حرف سے شروع ہوتا ہے۔ چند شعر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اعلیحضرت ظل سبحانی نواب میر محبوب علی خان شاہ دکن۔

حروف مفرد۔ ا ع ل ی ح ض ر ت ظ ل س ب ح ا ن ی ن و ا ب م
ی ر م ح ب و ب ع ل ی خ ا ن ش ا ہ د ک ن

الف ۔ اللہ کی حمد لکھ رہا ہوں	مدح رسول کر رہا ہوں
ع ۔ عاشق ہوں دل سے پنجتن کا	او صاف حسین اور حسن کا
ل ۔ لا ساقی پلا شراب توحید	ہو جائے ہمارے گھر میں بھی عید
ی ۔ یاروں کو ہے خواہش صبوحی	صدقے تیرے فداک روحی
ح ۔ حاصل ہے جہاں کی آج شادی	کردو ہر شہر میں منادی

مرثیہ | اصطلاح شاعری میں مرثیہ اس صنف سخن کا نام ہے جو کسی شخص کی موت پر اظہار تعزیت کے لئے لکھا جاتا ہے۔ اور اس میں متوفی کے کارنامے نیکیاں وغیرہ گنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں اُردو شاعری کی طرح مرثیہ گوئی کی ایجاد کا سہرا اہل دکن کے سر ہے۔ دکنیوں نے چمنستان ادب میں مرثیہ کا تخم بویا شمالی ہند کے متعدد شعراء نے پانی دیا۔ اور آخر کار انیس و دبیر نے اس بیل کو منڈھے چڑھایا۔ مہاراجہ کو انیس سے اور اس کے کلام سے اُنس تھا۔ انھوں نے بھی ماتم حسین کے نام سے ایک مرثیہ لکھا ہے۔ جس کا طرز بیان انیس سے ملتا ہے۔

ظلم کیا کیا نہ سہے صبر نہ چھوڑا شہ نے	راہ سے حق کے ذرا منہ کو نہ موڑا شہ نے
حق کا رشتہ کبھی باطل سے نہ جوڑا شہ نے	حق تو یہ ہے کہ کفر کو توڑا شہ نے

گھوڑے کی تعریف۔

اللہ رے راھوار کی وہ جست و خیز	بند تھی بھاگنے والوں کے لئے رہ گریز
دیکھئے سرعت کے کرشمے کوئی ہنگام ستیز	قصد راکب کا کیا کرتا ہے کار مہمیز

نظم طباطبائی کی وفات پر ایک مرثیہ لکھا ہے۔ جو درد و غم کا بہترین مرقع ہے

ایک شور ہے جہاں سے علی حیدر اُٹھ گئے	اس تیرہ خاکداں سے علی حیدر اُٹھ گئے

دنیا کے بوستاں سے علی حیدر اُٹھ گئے بزم سخنوراں سے علی حیدر اُٹھ گئے
نالہ لبوں پہ آتا ہے ہر ہر نفس کے ساتھ اُٹھتا ہے میر قافلہ بانگ جرس کے ساتھ

مثنویات | مثنوی ہی وہ صنف شاعری ہے جس میں متقدمین نے کافی طبع آزمائی کی ہے۔ مہاراجہ نے بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ ان میں جلوہ کرشن کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جو کرشن جی کے حالات زندگی اور جنگی کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس میں لطافت زبان متانت وسنجیدگی کے ساتھ درد واثر بھی پایا جاتا ہے۔ منظر کشی ملاحظہ ہو۔

میدان میں پہلوان کھڑے تھے دو بچوں کی جان پر اڑے تھے
ہتیار ہر ایک تولتا تھا تلوار کا ڈورہ کھولتا تھا
وہ گرد اُٹھی غبار چھایا ہر شخص نے اپنا سر اُٹھایا
دامن ہوا چاک گرد کا جب دو مہ نکل آئے آخر شب
سب جان بچا کے اپنی بھاگے بڑھ آئے کرشن سب سے آگے
تلوار لئے اڑے رہے وہ جس جا تھے کھڑے کھڑے رہے وہ
جب آیا قریب مست ہاتھی ایک ہاتھ میں سونڈ کاٹ ڈالی
چھنگاڑ کے فیل مست بھاگا پیچھا دیکھا نہ اس نے آگا
آلودہ بخوں تڑپ رہا ہے سر تن سے کہیں جدا پڑا ہے
نیچا تھا غرور حکمرانی عبرت کی ہے جا جہان فانی
بے گور و کفن پڑا ہے لاشا دیکھا کئے سب کھڑے تماشا

تاریخی قطعات | گلبن تاریخ کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس میں مہاراجہ کے تاریخی قطعات وغیرہ درج ہیں۔ ابتدا ہی سے انھیں تاریخ نکالنے کا شوق تھا۔ بعض تاریخیں لاجواب ہیں شاید ہی کسی اور شاعر نے اس قدر تاریخیں نکالی ہوں۔ نظم طبا طبائی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس سے تاریخ وفات بھی نکلتی ہے۔

لکھی ہیں۔ شاد تم نے یہ تاریخیں بھی غنیمت بزم ادب جناں میں ہوئے پہونچے "نظم" جب

۵۱ ۱۳ ہجری

نواب صلابت جاہ مرحوم کی وفات پر دو تاریخیں کہی تھیں۔ صلابت جاہ فرشدزادہ مرد آہ

۴۳ ۱۳ فصلی

جناب "فانی" کے دیوان کی تاریخ ملاحظہ ہو۔ دائما دیوان "فانی" باقیات الصالحات

۴۳ ۱۳ عیسوی

حضرت غفرانمکان کی کلکتہ سے واپسی پر ایک تاریخی قطعہ پیش کیا تھا۔

"کلکتہ کو جاکے شاہ آصف تشریف دکن میں جب کہ لائے
کی عرض مراجعت کی تاریخ با نصرت و فتح واپس آئے

۱۷ ۱۳ ہجری

ہم اس مضمون کو شاعر اعظم علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کرتے ہیں جس نے مہاراجہ کی نظم و نثر کو حیات دوام بخش دی ہے۔

اس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری اُس کی تحریروں پہ نظم مملکت کا انحصار

شیخ رحیم الدین کمال
سال اول

مہاراجہ دُرہا کی محفلیں

(۱)

مہاراجہ کشن پرشاد بہادر مدارالمہام ہو چکے ہیں حضرت غفران مکان علیہ الرحمہ کے الطاف وکرم کی ان پر بارش ہو رہی ہے سلطنت کے کاموں میں منہمک ہیں معتمدین باری باری ت اپنے اپنے سررشتہ کے اہم کاغذات لیکر ڈیوڑھی پر آرہے ہیں۔ سردار پریم سنگھ اور نواب وزیر جنگ بہادر اے ڈی کانگ ان کو مہاراجہ کی پیشی میں پہنچا رہے ہیں۔ پیشکار کی دیوڑھی مرجع انام بنی ہوئی ہے پہلے جو گاڑیاں، گھوڑے، میانے، بیگم پیٹھ کی طرف جایا کرتے تھے اب ان کا رخ شاہ علی بنڈہ کی طرف ہو گیا ہے۔ چارمینار سے لے کر پیشکار کی دیوڑھی تک ہر آنے جانے والا دستار بگلوس میں نظر آرہا ہے اور لطف یہ ہے کہ جانے والوں کے چہرے مہاراجہ سے ملنے کے اشتیاق کی جھلک دکھا رہے ہیں تو آنے والوں کے چہروں پر مسرت ملاقات کی لہر دوڑ رہی ہے۔ ان میں عوام بھی ہیں خواص بھی۔ ادنیٰ بھی ہیں۔ اعلیٰ بھی۔ رند بھی ہیں اور زاہد بھی۔ ہفتہ میں ایک بار عام ملاقات کا دن مقرر ہے آئینہ خانہ مشتاقان ملاقات سے بھرا ہوا ہے۔ اور جوش خروش کا یہ عالم ہے کہ آئینہ خانہ میں ہر شخص اپنے آپ کو ایک کی بجائے دو دیکھ رہا ہے نشست کی کوئی خصوصیت نہیں جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھا ہوا ہے مہاراجہ بہادر امور سلطنت سے فارغ ہو کر ہاتھ میں نیمچہ لئے ہوئے آئینہ خانہ میں آتے ہیں۔ ان کا یہ رفیق (نیمچہ) جو کبھی ان کے ہاتھ کی رونق اور کبھی بغل کی زینت رہا کرتا ہے مہاراجہ کی کرسی کے بازو رکھا ہوا اپنے مالک کی حفاظت کی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے مہاراجہ اپنی جگہ بیٹھکر سلام لے رہے ہیں کسی کو سروقد تعظیم دے رہے ہیں اور کسی کو بیٹھے ہوئے

مگر بیٹھے ہوئے بھی اس طرح کہ اپنا ہاتھ کرسی کے پایہ کی جانب جھکا کر اونچا کرتے ہوئے اس کے سلام کو بھی تعظیم کے دائرہ سے خارج نہیں ہونے دیتے۔ اور سلام لینے کا یہ انداز ہر ایک کے مراتب کی تفسیر بیان کرتا جاتا ہے۔

یہ وہ محفل ہے جس میں چھوٹے سے چھوٹا اہلکار بھی ہے اور کسی متمدی کا مددگار بھی۔ مگر بعض وقت دیکھا گیا کہ مہاراجہ بہادر مددگار سے زیادہ صیغہ دار کی تعظیم فرما رہے ہیں۔ اس برتاؤ سے محفل حیران ہونے کے بجائے سبق لے رہی ہے اور ہر شخص مہاراجہ کے اس درس حقیقت کے مطالعہ میں مصروف ہو کر یہ دیکھنے لگا ہے کہ ہاں یہ اہلکار فقط اہلکار ہی نہیں ہے جس کی حیثیت موجودہ کو پیش نظر رکھ کر بعض لوگ اگلی کرسی پر اس کے بیٹھنے کو بھی گوارا نہیں کر رہے ہیں۔ معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی تعظیم کرتے وقت مہاراجہ کی نظر اس کی اہلکاری یا اس کے کم قیمت لباس یا اس کے اترے ہوئے چہرہ پر نہیں بلکہ ان کو اس کے پیچھے اس کے روایات۔ اس کے بزرگوں کے اعزاز۔ اس کے موروثی خدمات اور اس کے خاندانی علم و فضل کا ایک لشکر نظر آ رہا ہے۔ بادشاہ کے بعد حکومت کے سب سے بڑے افسر کے اس حقیقت شناس طرز عمل نے ایک طرف صرف عہدہ یا دولت مندی کی بے حقیقت مشیخت پر نازاں نہ ہونے کی فضا چوطرف پھیلا دی ہے اور دوسرے طرف اس شریفانہ طرز عمل اور کریمانہ برتاؤ نے ملک کی نظروں میں مہاراجہ کی عزت کو چار چاند لگا دئے ہیں سلطنت کے کاروبار کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ عوام سے ملنا جلنا یہ اس زمانہ کے اہم ترین فرائض تھے اس سے دادرسی میں سہولت۔ اور جدید اصطلاح کے مطابق عوام سے موثر اشتراک عمل کا مقصد حاصل ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تمام تفصیلی امور جن کا اول تو ایسے اعلیٰ افسر کے کانوں تک پہنچنا دشوار اور دوسرے یہ کہ ذرائع متعلقہ سے پہنچے بھی تو پورے طور پر اس کے تمام اچھے برے پہلوؤں کے ساتھ پہنچنا غیر یقینی ہو سکتا تھا وہاں اس موثر اشتراک کے باعث ہر واقعہ اور ہر کیفیت کا پوری صداقت کے ساتھ مدارالمہام کی مقتدر ہستی تک پہنچ جانا یقینی تھا۔

ایک طرف تو اس انداز کا دور مدارالمہامی ہے صبح و شام اسی مشغلہ میں گزر رہے ہیں

مگر دوسری طرف مہاراجہ کا وہ ذوق سلیم جوان کو علم کے ساتھ ہے اوران کا وہ ادبی وعلمی مذاق جس کے باعث وہ ابتدا سے اہل علم وصاحبان فضل کی محفلوں میں قدر کی نظروں سے دیکھے جاتے رہے مصروفیت امور سلطنت کے باوجود رہ رہ کر مہاراجہ کے دل میں گدگدیاں لے رہا ہے۔ اس مذاق کو پورا کئے بغیر مہاراجہ کو کس طرح چین آسکتا تھا۔ اسلئے انھوں نے اس سرکاری محفل کے ساتھ ساتھ ایک دوسری بے تکلف محفل بھی آراستہ کرلی ہے۔

(۲)

اس زمانہ کے قابل ترین افراد کو منتخب کرکے مہاراجہ نے مجلس اتحاد کے نام سے ایک جماعت بنائی ہے جس کے ارکان مولانا نورالضیاء الدین صاحب ضیا (حال ضیا یار جنگ بہادر) مولوی سید محمد حسینی شاہ صاحب عقیل سجادہ درگاہ بیکمال۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نانڈیڑی۔ مولوی حسن علی صاحب طلسمی مولانا ظہیر شاگرد حضرت ذوق۔ پنڈت سورج بھان تھانوی بینش۔ نواب سراج الدین خان صاحب سائل داماد حضرت داغ۔ مولوی غلام مصطفےٰ صاحب رسوا (حال رسا) مولوی صدیق احمد صاحب فہیم قاضی پربھنی۔ جناب ترکی علی شاہ صاحب ترکی شاعر دربار آصفی۔ مولوی عبدالعلی صاحب حقانی استاد زادہ مہاراجہ بہادر۔ اور راقم الحروف وغیرہ تھے۔ ہفتہ میں ایک روز (روز تعطیل) اس کا اجتماع ہوتا ہے کبھی طرحی مصرعوں پر طبع آزمائی ہو رہی ہے کبھی غیر طرحی کلام میں داد سخنوری دیجاری ہے۔ اس محفل کے مشہور نقاد جناب ترکی جو شعر کے پرکھنے میں حقیقتاً ید طولیٰ رکھتے تھے ہر ایک کے شعر کو حسن وقبح کی ترازو میں تول رہے ہیں۔ جہاں کہیں ان کے خیال میں نقص نظر آیا فوراً آواز دی کہ ذرا ٹھیر جائیے۔ یہ ٹھیرجائیے کی آواز شاعر کے حق میں قیامت سے کم نہ ہوتی تھی۔ اور ساتھ ہی ترکی صاحب نے زانو بدل کر اعتراضات کی بھرمار شروع کردی۔ غزل پھیکی۔ مضمون پھیکا حتیٰ کہ محفل کا رنگ پھیکا کردیا مگر مہاراجہ بہادر کبھی اعتراض کا ایک معقول جواب دیکر اور کسی بے محل اعتراض پر ایک پرلطف پھبتی اڑا کر شاعر کا حوصلہ بلند اور محفل کا رنگ جما دیتے تھے۔ ایسے بیسیوں مواقع آئے ہیں کہ حضرت ترکی کے ایسے اعتراضات کو جن کا جواب بن پڑنا مشکل نظر آتا تھا مہاراجہ نے اپنی خداداد ذہانت وقابلیت سے جواب ترکی بہ ترکی دیکر اعتراض کو

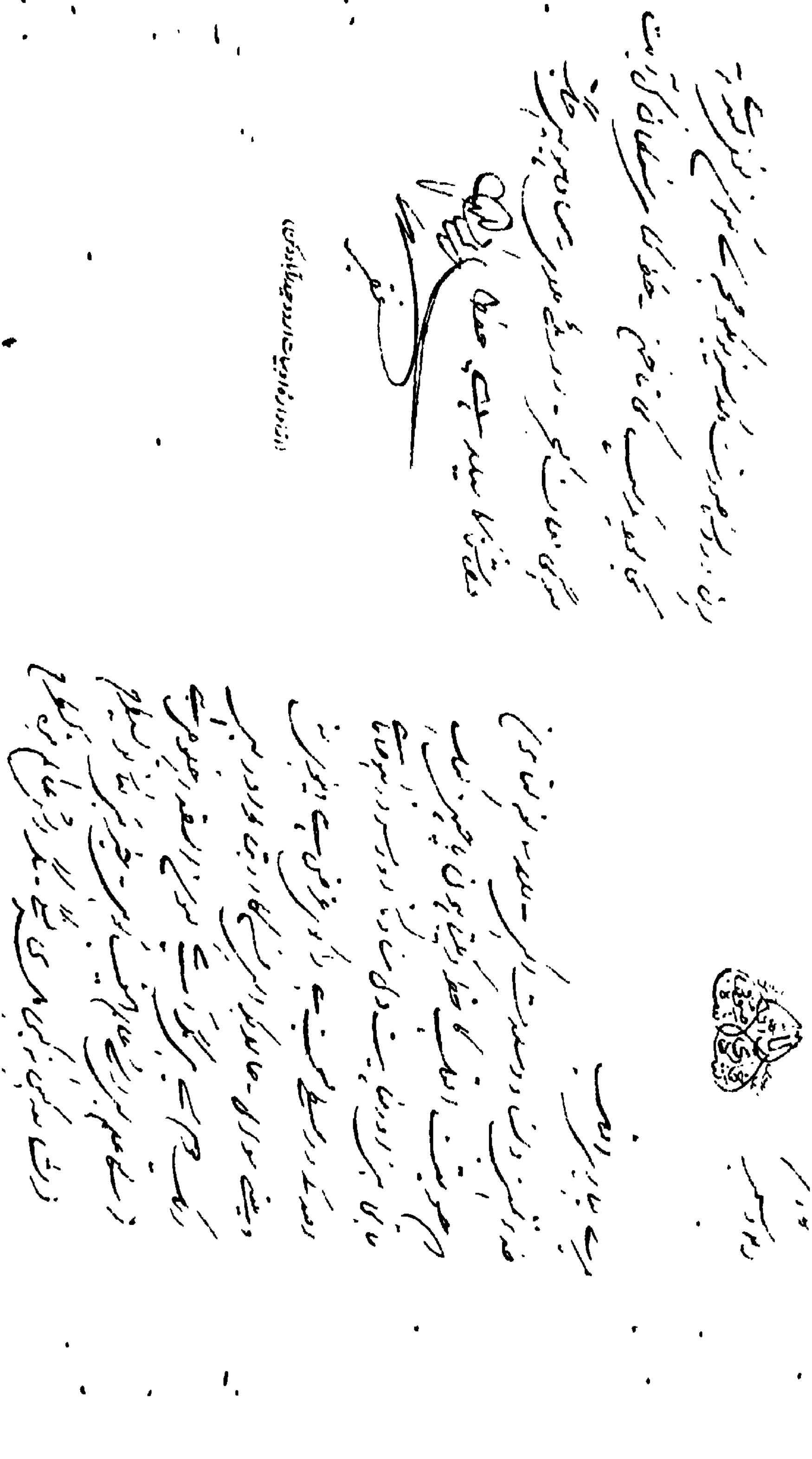
اس خوبی کے ساتھ ادا کر دیا ہے کہ محفل دنگ رہ گئی۔ مہاراجہ کی غزل سنانے کیلئے قوالوں کی چوکیاں موجود ہیں۔ غزل کا رنگ۔ گانیوالوں کا اظہار کمال۔ آواز کی لطافت۔ سننے والوں کی حسن عقیدت یہ سب مل کر عجب سماں پیدا ہوگیا ہے۔ وہ بے تکلف محفل۔ وہ علم وادب کی موشگافیاں۔ وہ شعر وسخن کی بذلہ سنجیاں۔ دیکھنے اور سننے سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ لکھنے میں وہ رنگ اور کہنے میں وہ لذت نہیں آسکتی بمصداق ۔ع ۔

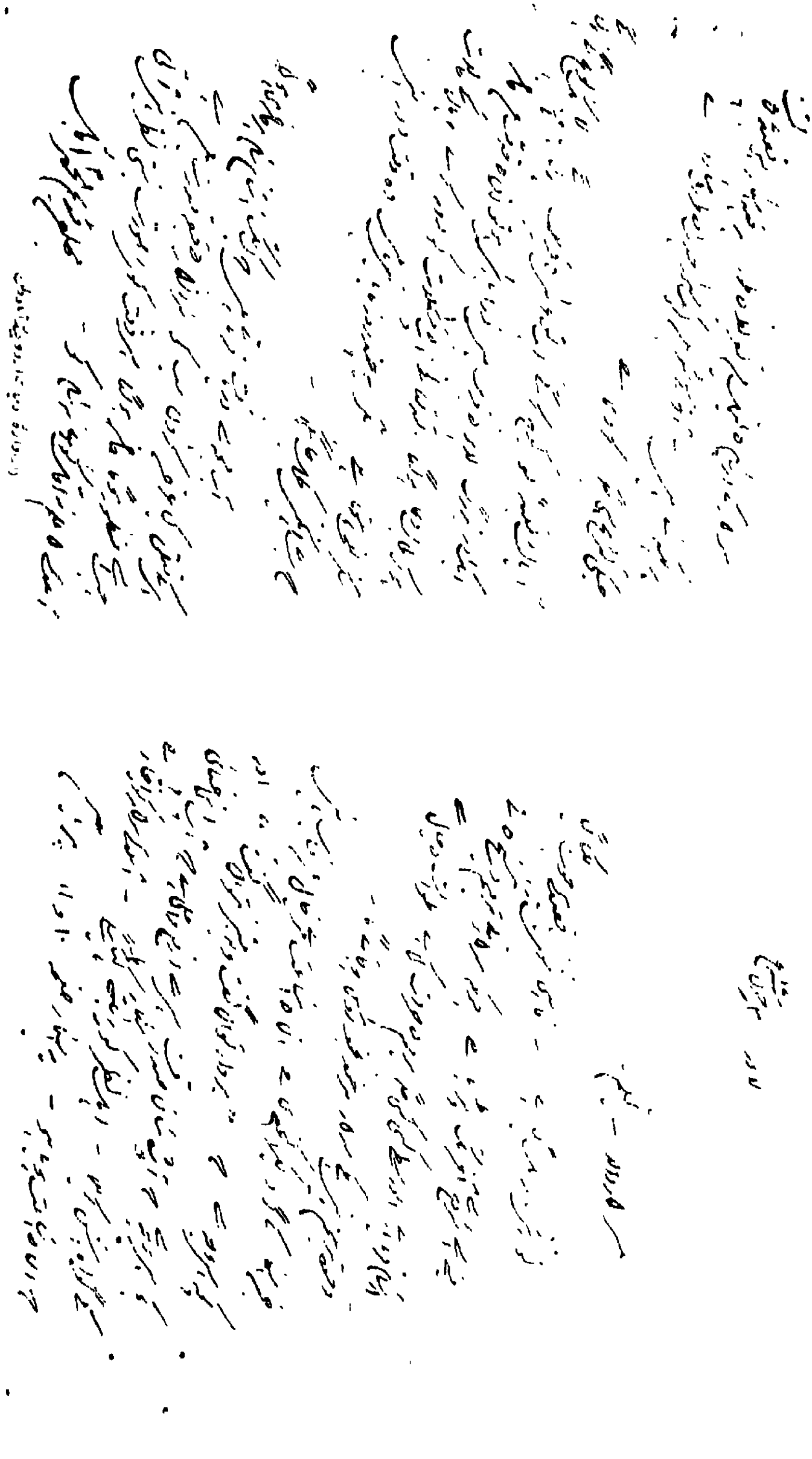
"لطف ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی"

یہ محفل کبھی۔ پھول باغ میں۔ کبھی جلّل گوزہ میں۔ کبھی بارہ دری میں دادِ یکجہتی دیکرنگی دیرہی ہے کسی روز صبح سے شام تک بہترین گانے والیاں اپنے حسن وجمال کے ساتھ ساتھ اپنے فن کے جوہر دکھلا رہی ہیں اہل محفل داد پر داد دے رہے ہیں۔ دفعتاً گانا بند ہوگیا۔ مزامیر خاموش ہوگئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ مہاراجہ ان کو ان کی غلطی تبلا رہے ہیں جس کو تسلیم کرکے وہ شکریہ ادا کررہی ہیں۔

کسی روز سارا دن پیراکی کے لئے وقف ہے سب کے سب لنگوٹ کسے ہوئے پانی میں دن گزار رہے ہیں۔ اس فن میں بھی مہاراجہ بہادر سب پر فوقیت لے جارہے ہیں۔ ایک ایسا دن بھی ہے کہ کشتیوں میں تلواریں جمائی ہوی رکھی ہیں اور اسٹانڈ پر ذبح شدہ بکرے لٹک رہے ہیں۔ آج مشق سپہ گری کا دن ہے۔ اور ہر ایک شخص تلوار ہاتھ میں لے کر لٹکے ہوے بکرے کو کاٹنے کی کوشش میں وار پر وار چلا رہا ہے مگر کوئی ہاتھ دو انچہ سے زیادہ گہرا یا اس کی کھال کے بال صاف کرنے کے سوا اور کام نہیں کر رہا ہے مگر مہاراجہ ہیں کہ کوئی ہاتھ خالی نہیں جاتا وہ ایسے مشاق ہیں کہ ایک وار میں دو ٹکڑے کئے دیتے ہیں۔ وہ ایک جوہر قلم دکھا رہے ہیں تو دوسری طرف جوہر شمشیر بھی۔ غرض کہ کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں ان کو دخل نہ ہو۔ وہ صحیح معنوں میں مجموعہ کمالات تھے۔

سید ابوالحسن قادری قیصر





کلیہ کی خبریں

انتخابات :- انجمن اتحاد طلبائے جامعۂ عثمانیہ کے ملتوی شدہ انتخابات بالآخر ماہ بہمن میں عمل میں آئے ۔ محمد عمر صاحب مہاجر (جنھوں نے امیدواری سے دستبرداری کرلی تھی) احمد خاں صاحب، اور کرشن دیال صاحب ستم صدارت کے امیدوار تھے ۔ احمد خان صاحب اور ان کی وزارت نے انتخابات سے قبل اپنے نام واپس لے لئے تھے ۔ اس مرتبہ اس انتخاب میں طلبا نے بہت ہی عدم دلچسپی کا اظہار کیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ۔ انھیں ان انتخابات سے کوئی سروکار نہیں ہے ۔ شائد یہ پہلے جوشش و سرگرمی کا ردعمل ہو ۔ نتائج انتخابات حسب ذیل ہیں :-

صدر :- محمد عمر صاحب مہاجر ۔ بی ۔ اے ۔

نائب صدر :- سید عبدالرزاق صاحب قادری بی ۔ اے ۔

معتمد :- قادر محی الدین صاحب متعلم سال چہارم

کتب خانہ دار :- ابو تراب خلیل الدین صاحب متعلم بی ۔ ایس ۔ سی ۔

نمائندگان شعبۂ فنون :- سید عبدالرشید صاحب قریشی متعلم ام ۔ اے ۔

جلال الدین صاحب　　متعلم سال چہارم ۔

امیر احمد صاحب خستہ　　متعلم سال سوم ۔

نمائندگان شعبہ سائنس :- عبدالوہاب صاحب　　متعلم ام ۔ ایس ۔ سی ۔

حامد علی صاحب　　　متعلم بی۔ ایس۔ سی

محی الدین شاہ خاں صاحب　　　متعلم سال دوم

نمائندگان شعبہ قانون: ۔ سیف علی بیگ صاحب　　　متعلم ال ال بی

دینیات: ۔ یوسف الدین صاحب　　　متعلم ام۔ اے۔

انجنیرنگ: ۔ احمد بیگ صاحب غازی　　　متعلم بی۔ ای۔

ہم اس کابینہ کو مبارک باد دیتے ہیں۔

انتخابات کو جامعہ کی اجتماعی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے اور ان کو جائز حدود کے اندر رکھنا بھی ہمارا ہی کام ہے۔ ہم جامعہ کی ان تمام سرگرمیوں کو استقامت کردار کا ایک امتحان سمجھتے ہیں ہمیں یہ بکھکر قلق ہوتا ہے، کہ مغرب کی اور برائیوں کی طرح انتخابات وعمومیت کی خرابیاں بھی ہم میں گھر کرتی جارہی ہیں میکیاویلی کا یہ اصول کہ مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کے ذریعہ کا استعمال خواہ وہ اخلاقاً جائز ہو یا ناجائز روا ہے، انتخابات میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ حسن خلق ایفائے عہد بزرگوں کے فیصلہ کو ہر حال میں نہ صرف قابل احترام بلکہ قابل تعمیل سمجھنا۔ اپنے قول کا پاس رکھنا، اور مقصد سے بے پایاں عقیدت ومحبت یہی ایک مضبوط کردار کے جوہر ہیں۔ اور کردار کی تعمیری ہماری تعلیم کا مقصد وحید ہے۔ کیا ہوا اگر ہم عہدوں کی بھول بھلیوں میں اصل مقصد کو ہاتھ سے کھو دیں! ادنیٰ اور ظاہری طمطراق کی خاطر ضمیر کی صداقت کا خون کرنا اخلاقی شکست و روحانی موت ہے!! عہدہ کا حاصل کرلینا، خواہ وہ کتنا ہی بڑا ہو، کامیابی نہیں ہے انتخابات کی کشمکش میں نتائج کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات پر قائم رہنا ہی کامیابی کی روح ہے۔ اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ہوبا اور ہنگامہ پسندی کے ذریعہ انتخابات لڑے اور جیتے جاسکتے ہیں لیکن زندگی کی دیگر اعلیٰ مہموں کو کس طرح سر کیا جاسکتا ہے؟

ان عام حقائق کے پیش نظر کبھی کبھی ہم سوچنے لگتے ہیں کہ ان جامعی سرگرمیوں کو صحیح معنوں میں عملی زندگی کی تیاری کے لئے استعمال کرنے کی ہم کس حد تک کوشش کررہے ہیں!!

جلسہ کرسی نشینی عالیجناب نعیمن امیر جامعہ کی صدارت میں جلسہ کرسی نشینی منعقد کیا گیا تھا۔ سابق صدر جناب تراب علی خاں صاحب نے انجمن کی سالانہ روئداد پڑھی صدر منتخب نے فی البدیہہ خطبہ دیا اور برادران جامعہ سے بہت سی مفید تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کیا۔

کھیل اس سال جامعہ کے ایک سابق استاد نے یہ اعتراض کیا تھا کہ جامعہ میں کھیلوں کا معیار آئے دن گرتا جارہا ہے۔ ادارہ نے بھی اس جانب توجہ دلائی تھی ہمیں یہ بیان کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ہماری آواز صدابصحرا ثابت نہ ہوئی چنانچہ آل انڈیا ٹورنمنٹ منعقدہ اورنگ آباد میں ہماری فٹ بال ٹیم اور ہاکی ٹیم نے شرکت کی اور دونوں ٹیموں نے شیلڈ حاصل کیا۔ ہم ان ٹیموں کو مبارکباد دیتے ہیں۔

نیکنزی ٹورنمنٹ سکندرآباد میں ہمارے ہاں کی ٹینس کی ٹیمیں شریک ہوئی تھیں۔ مسرت کی بات ہے کہ قیصر نے سنگل اور حفیظ نے ڈبلز کا فائنل جیت کر چیلنج کپ حاصل کیا۔

بزم معاشیات بزم معاشیات کے نئے انتخابات میں محمد بن علی صاحب باواہب متعلم سال چہارم صدر اور احمد عبدالرشید خاں صاحب معتمد منتخب ہوئے ہیں بزم کا جلسہ کرسی نشینی زیر صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر معین امیر جامعہ منعقد ہوا۔ صدر بزم نے خطبہ صدارت پڑھا اور ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب صدر شعبہ معاشیات نے State Banks for India پر مقالہ پڑھا۔ جلسہ کے اختتام پر عکس کشی ہوئی۔ ہم منتخب عہدہ داران کو مبارکباد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ وہ بزم کی روایتی سرگرمی کو برقرار رکھیں گے۔

تقریری مقابلے کچھ روز ہوئے نظام کالج کے سالار جنگ رولنگ کپ تقریری مقابلے میں ہماری جامعہ کی جانب سے انجمن اتحاد نے ایک تقریری جماعت روانہ کی تھی۔ گذشتہ دو تین سال سے جامعہ عثمانیہ نے اس مقابلہ میں شاندار کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ لیکن برادرانِ جامعہ کو یہ معلوم کرکے افسوس ہوگا کہ اس سال یہ روایات باقی نہیں رکھی گئیں۔ اس سے غالباً کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ کہ جامعہ میں بہتر سے بہتر تقریری صلاحیتیں

نمائندگی رکھنے والے طالب علم ہر جماعت میں موجود ہیں۔ اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ اگر جامعہ کی صحیح نمائندگی کی جاتی تو کسی اور کالج کو بمشکل ایک انعام بھی ملتا۔ نمائندگی کے ہر موقع پر انجمن اتحاد کی یہ روایت رہی ہے کہ اپنے طور پر کسی کو نامزد کرنے کی بجائے بہترین مقررین کے انتخاب کی غرض سے تقریری مقابلہ منعقد کرتی ہے۔ لیکن اس موقع پر "ہمارا آدمی غلط یا صحیح" کے مقولہ پر عمل کرتے ہوئے کارکنانِ انجمن نے جامعہ کی کوئی اچھی خدمت نہیں کی۔

علی گڑھ و دہلی کے کل ہند مقابلوں میں بھی انجمن اتحاد نے، بغیر کسی انتخابی مقابلہ اور جلسہ عام میں موازنہ کی منظوری سے قبل، دو جماعتیں روانہ کی ہیں۔ اس پر مختلف حلقوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ کیا یہی طلباء کی آزادیاں ہیں جس کا پرچار کرتے کرتے منھ سے کف جاری ہو ہو جاتا تھا اور کیا یہی انجمن اتحاد کے دستور کے تقدس کا تحفظ ہے جس کے راگ الاپتے الاپتے آنکھیں پتھرا پتھرا جاتی تھیں؟ ذاتی مفاد اور آزادی میں کس قدر قریبی تعلق ہے! ہم یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ انجمن اتحاد کے عہدہ و روایات کا وقار شخصی ناموری پر قربان کر دیا گیا ہے!! پھر بھی ہماری دلی تمنا ہے کہ یہ جماعتیں کامیاب واپس ہوں۔

MANAGING COMMITTEE OSMANIA MAGAZINE 1940."



see how Maharajah "Salammed" and showed his obeissence to his august Sovereign. His ancestral office was that of a Peshkar or Chief Secretary to the regining Sovereign of Hyderabad Deccan and this office he valued more than any other office the duties of which he might be asked to perform. He virtually looked upon His Exalted Highness as his master in the true sense of the term One who sat in his society can alone get an idea of the reverence with which he could refer to his Sovereign in the course of conversation.

As an administrator, he was an asset to the State. Though he was born in the old school of thought, yet he easily adapted himself to the new surroundings. I never went to him with a reform proposal which was not eventually accepted by him. As a Sadr E-Azam there was no question of his being inaccessible to a Government servant even in the lowest rung of the ladder. A peon could not Salaam him without being responded to in eastern style. He fully understood the feeling and the prompting of every branch of society found in Hyderabad. If there was an agitation in the State and the Maharajah wished to give some advice to the agitators, it was difficult for them to say 'No'. Such was his hold upon their hearts.

This was Maharajah Kishen Pershad about whom his Exalted Highness whom he so much loved and respected, is said to have remaked at his bier "Shatranj-Ka-Akhira Mohra utgaya" (The last Chess man on the Chess board is also gone.)

MIRZA YAR JUNG.

---

that belief would take him out of the category of Hindus. He used religion for his own spiritual advancement, and not for identifying himself with a particular sect or creed. Amongst Muslims he was a Sufi. Amongst Hindus, he was a theosophist. He never cared for what people thought of his religion. He would not discuss religion with anybody as he considered that religion was the most sacred possessions of a man's own conscience over which nobody had a right to trespass, but the essence of religion guided every moment of his life. A Hindu temple where Hindus carried on meditations about the creator of the Universe would command as much respect from him as a Mosque where Muslims worshipped the same Creator though in different surroundings. Ordinarily a name can be given to the religion of everybody, but in the case of Maharajah no name can be given to his religion, for, it resembled so little with existing religions. Apparently he left it to others to give to his religion whatever name they wanted to give, without bothering himself about the same. His corpse was burnt on a Chita but I believe there were Muslims who shook their heads over this method of disposal. Probably the Maharajah himself never cared how the residence of his Soul should be disposed of after his demise. His Soul would probably say to the body 'Dust thou art and to dust shalt thou return in some form or other,' but as to the form itself his Soul would not trouble itself.

Descended from an ancestor who came with Asaf Jah the founder of the Nizam's dynasty—loyalty to the Asaf Jahi throne was another feature of his character. To him disloyalty to the Nizam was a sin and crime. He inherited this spirit from his ancestors, and it was apparent on every occasion that I saw him. It was a sight to

affectionate friend. His simplicity of manners free from all show, outward form, or affections touched the hearts of all those who approached him. A day before he handed over charge of the Presidentship of the Hyderabad Executive Council when I went to see him, I was so much touched by the affection and courtesy which he extended to me on that occasion that I could not help exclaiming "Maharajah! Your rule over me as Sadr-E-Azam might cease tomorrow but the rule over my heart will never cease. I remain yours for ever."

His tolerance appeared most prominently in matters relating to Religion so much so that a Muslim would sometime be lead to think that the Maharajah was a Muslim at heart, where as a Hindu would always accept him as a pious Hindu. How often I saw him weeping in Majlises in which the martyrdom of Imam Hussain was graphically described. How often I saw him in coloured clothes on Holy occasions. Congratulatory cards would be exchanged on both Dasara and Id days. A stranger may feel some difficulty in believing that the Maharajah had both Hindu and Muslim wives, but it is a fact. The Muslim wives were not treated as concubines. They occupied the status of wives and their children were treated as his legitimate issues for all worldly purposes. They were married in Muslim families with all the formalities and pomp befitting the Mahrajah. Their names alone would show whether they born of Hindu or Muslim wives. This aspect of Maharajah's life would be inexplicable to a foreigner but I have seen with my own eyes how nobly he conducted himself in that branch of life.

As to his religion, he apparently believed in the Unity of God in the sense taught by Islam, but he did not think

what it gave in charity, but often felt ashamed of not being able to give more. Nothing but resources could restrain the promptings of his charitable heart. Everyday the treausrer must set apart a certain sum for charity, however much disconcerted he might feel on certain occasions. Happy the Maharajah felt when he gave to others, depressed he found himself when there was nothing to give or none to receive. It has never been his concern to see whether the man who begged him deserved his charity or not. He himself once explained the distinction between 'Sakhe' and 'Karim' words of which I find difficult to convey the exact idea in English. He said "Sakhe (Charitable) was one who gave to the man who deserved his charity, where as "Karim" was one who did not care to probe into the question whether the begger deserved his charity or not. The Maharajah lead the life of a Karim.'

In his mode of living, he was a happy combination of the East and the West. The 'Farsh' would go side by side with a drawing room furnished in Western Style. In his society a Pundit or Molvi would feel as comfortable as a European. Simple in dress, but Royal in style were the garments he put on. At his table one would find Pulao, Kurma, Kufta, Biryani and Kheer served as sumptuously as 'Almond Soup', Chicken Cutlets or fruit pudding. How often I noticed him eating simple rice with Kurma and pass on other dainty dishes which came one after another in succession to his guests.

Another distinguishing feature of his personality was the stream of affection which flowed continuously towards all those who came into contact with him. Everybody who sat near him thought he was his most intimate and

REMENISCENCES OF THE LATE MAHARAJAH KISHEN PERSHAD

THE late Maharajah Kishen Pershad was a typical nobleman of Hyderabad Deccan. In his rank as nobleman, he stood first and foremost. In his qualities as nobleman it is difficult to surpass him. He was a born Mahrajah and maintained the traditions of his position up to his last moment. He lived as a Maharajah and died as a Maharajah. A few traits of his character which struck every body who came in contact with him threw a flood of light on the qualities of his head and heart.

Charity in the broadest sense of the term, was the most distinguished feature of his character. Ever ready to forgive and ever anxious to help the needy and the oppressed was his guiding principle: In the streets of Hyderabad, the scene of a passing motor and its occupant throwing money right and left over the begging poor came to an end with the passing away of the Maharajah. During his tenure as the President of the Executive Council the beggars kept themselves in touch with the Council days and the routes he followed on his way to and from the Council House, in order to be sure of some silver pieces. The formation of queues of the poor and the decrepit in the court yard of his palace daily at the time he was expected to come out, and distribution of alms and charities to them reminded one of a noble's life in the old moghul days. One can easily imagine the height of the magnanimity of a spirit which seldom thought of

the poor. The number of persons whom he has helped individually, and the reasons and ways of helping them are too many and various to be described at length. All of us are acquainted with his generosity. It was really true of him that his left hand did not know what his right hand gave. The poor, the needy, the despised, whose lives were spent in dirt and despondency— they were the persons who were helped and loved by him. To help the poor was one of the supreme joys of his life. 'The poor and the needy have lost in him their greatest friend'.

It would gladden the hearts of all the Osmanians who loved and respected him if something were done in the University to perpetuate his memory. The Editor of the Urdu section of the Magazine has sponsored the idea of 'The Maharaja Poor Fund'. What better memorial than the Poor Fund could be founded, for to help the poor and to espouse the cause of the depressed was the chief mission of his life. While I fully appreciate and agree with the foundation of such a Fund, I despise the humiliating word 'Poor' which should not be associated with any of our humanitarian activities. To help our fellow-students is our principal duty. It is a sad reflection to me that we have deferred very long in establishing a Duty Society in our University. Our late Chancellor's unbounded love for the poor inspires us to the establishment of a Duty Society in the University. Every individual who has keenly studied the students of the University, will appreciate the idea.

I request my fellow-students and members of the University to make an effort for this noble cause. The writer has taken an initiative in this connection, and was assured of full support from various quarters. I consider this the purest ideal of humanity. Let us all unite and move as one man for raising funds, I dedicate myself to it.

"ONE OF YOU" LL.B., (PREVOUS.)

eating into the very vitals of our national life. This question, far more than any other question, goes deeper down into our national fabric. There is primarily an individual solution to this question, which shall surely make a collective solution possible. Each person, whether Hindu, Muslim, Parsi, Sikh, Christian or Harijan, should transcend the inherent and personal barriers and limitations that bind us down to narrow ways of thinking. The Maharaja had clearly underestood and followed this ideal. In the Maharaja no vestige of this feeling ever found any place in his relations with the people of this country. To him all men were the children of one Heavenly Father, whose love included all and transcended all distinction. We know him today as one who in his own life loved his countrymen and humanity at large. He broke down the barriers of petty communal prejudices. His magnanimity was his most dominant characteristic. The establishment of peaceful relations between two major communities of this country was the professed and practised mission of his life.

The Maharaja's profound devotion and loyalty to the Sovereign of Hyderabad was indeed singularly examplary. It was his faith that the throne of Hyderabad was the fountain-head of the rights and privileges of the citizens of Hyderabad. This serves as a strong and singular ideal to a united and free Hyderabad. He always pleaded for the attachment and loyalty to the throne, and zealously served it to the very end of his life. I wish the youth made it their ideal.

There is one other gleaming aspect of his life - the genuine, unbounded love for all sufferers. There are daily witnesses of the many expressions of his love for

THE MAHARAJAH DUTY SOCIETY

THE Maharaja is dead, but his memory will ever remain in the depth of our hearts. The Maharaja was the embodiment of certain high ideals and thus will always live in us to inspire us to nobler goals. Any human being who is born in this world, is bound to disappear in course of time. This is a rigid law of nature. The physical form of the Maharaja has vanished, but even after his departure from this perishable world, his great name will remain imperishable in our history. He has left behind him the footsteps of service and noble traits of character which will lead us to perfection.

The Maharaja was the Chancellor of our Alma Mater for a number of years, and considered it his proud privilege to serve the University whose ideals were not different from his own. His enthusiasm and keen interest in the progress of the University has endeared him to all of us. The happy old days wher he used to be amidst us with extreme joy and interest in all our lives are all dead and gone How we mourn for them.

The Maharaja was a perfect gentleman, and was the last remnant of the catholicity of taste and temperament which was distictly characteristic of the Moghul culture. His breadth of affection and largeness of heart and unsurpassing love for the sovereign were his outstanding characteristics.

To our shame we own the prejudice of communities. Sectarian animosities and petty communal jealousies are

His death is a national calamity. He has left a gap which can never be filled. Born in the time of Akbar, he would have been more than a Todar Mal and Khankhana. He used to spend a great part of his income in charities. His death is an irreparable loss. He was a great nationalist, great statesman, a great poet, a great patriot and a man of great generosity. He was like a bright star in our darkness to lead us on the right path.

AHMED ABDUR RASHEED KHAN,
III YEAR.

---

always appreciated his good character. He had no pomp. He wrote his name very humbly as, "Fakir" and "Sufir." He was like an angel to the poor and the beggars. Whenever his car went by the poor used to shout and call to him.

He was a great statesman and a politician. He was the prime minister of Hyderabad and was very successful in his administration. His door was always open to the poor and he tried his level best to relieve them from their distress. He was the best model of Mogul culture and toleration In the words of our august master, " He was the last." He was also a great patriot and a nationalist.

Besides being a statesman and a patriot, he was a poet of great eminence. His poetry is both in Persian and Urdu. He had a great reputation as poet. He was a great scholar. He was a great patron of Urdu. specially of Urdu poetry. Many poets were patronised by him He recognised their merits and rewarded them. He had a fine taste and a quick eye to recognise genius. It was the patronage of Maharaja Sir Kishan, which invited Fani, the famous Urdu poet and Talat Yazdi, the Persian poet to Hyderabad. His Mushairas are very famous. During his chancellorship, he always honoured the University functions with his presence.

He was not only a poet but also a writer of prose. He has written many books, which have a high place in Urdu literature. His literary works are the following. Bazam-e-Khial, Ruba-iat-e-Shad, Armughan-e-Visarat, Prem Duroun, and Sair-e-Punjab.

MAHARAJA SIR KISHAN PERSHAD

"Lives of greatmen all remind us"
"We can make our lives sublime"
"And departing leave behind us"
"Foot sprints sands of time."

(Longfellow)

THESE lines may well be quoted in the cherished memory of our beloved chancellor the late Maharaja Sir Kishan Pershad.

The character of great men, is said to be deeper than the deepest sea. The depth of their character is unfathomable. Maharaja Kishan Pershad was a man of such a great character. "A man he was to all the country dear." His death is a national tragedy, both for Hindus and Muslims. He was respected more for his character than his wealth and premiership.

He was a Hindu by birth, but had no prejudice towards any community or any religion. Both Muslims and Hindus were the same in his eyes. He respected the Holy men of Islam, Maulana Hasan Nizami, was always a welcome guest to him. He had great respect for him.

Though born in the wealthiest family of Hyderabad he led his life very modestly. He was the grandson of the famous Divan Chandu Lal. His family is very famous for its loyalty towards the Asafia family. Our beloved king

The Maharaja Bahadur continued to take keen interest in literature all his life. His death last May, at the age of seventy-six, has deprived Hyderabad of one of her greatest, worthiest, and noblest sons.

His body was cremated at 2 a. m. on the morning of of the 14th may. He leaves behind him, as his successor Raja Khaja Pershad Arjun Kumar, a noble son of a great father.

Maharaja Sir Kishan Pershad, a symbol of Hindu-Muslim unity and a monument of Indian culture, possessing many good qualities of head and heart, has passed away and his loss is felt all the more because such rare qualities as he possessed are rarely found in one single man.

Yet we should not go on bewailing and bemoaning indefiniltely, for "let us rather think we have an ideal bequeathed for us. and let us follow. instead. the virtues of the man we extol."

SHAHID ALI KHAN
2nd Year Arts.

Apart from being a poet and a writer he was also a great patron of letters. Dagh, Jaleel and Sarshaar are a few of the many men-of-letters for whom the Maharaja did much besides materially supporting them when their fame was not so widespread.

The heavy burden of work could not stop him in his literary pursuits and even after becoming the Prime Minister in 1926, he was as interested in literature as before, and once or twice a week poets used to gather at his palace for the recital of their works.

The Maharaja Bahadur's ideas are very clearly expressed in his Rubaiyat. For instance his unquenchable thirst for knowledge and truth is expressed in one of these where he says, "whatever is seen is merely illusion. What is called the world is a net of deceit. Whoever attains knowledge, Oh! shad, to him will be unfolded everything about the world." [1]

He also holds in his Rubaiyat that self-denial and mortification are more than mere tyranny. He says, "Indulge in self-denial and not in tyranny. Fear God and respect your elders. Perish in the love of God, for he alone is imperishable." [2]

Then again in one of his Rubaiyat he speaks in high terms of the virtue of generosity. He says, "A generous man is the friend of God. If you have wealth distribute it among human beings. This will be a bargain for the after world, for what you give, you shall take with you." [3]

1. Translated from the Rubaiyat-i-Shad. See No. 24.
2. Translated from the Rubaiyat-i-Shad. See No. 62.
3. Translated from Rubaiyat-i-Shad. See No 132.

Before joining the Madrasa-i-Àliya he had learnt to read and write Persian. Arabic, Sanskrit, Telugu, and Marathi, which he could speak fluently.

Maharaja Sir Kishan Pershad's Urdu and Persian poetry have made him a "conspicious star in the galaxy of contemporary poets of our country."

For a long time he was editing two monthly journals, "Dandabai Asfiia," and "Mahboobul-Kalam." The former being devoted to prose while the latter was entirely for poetical contributions. These journals were both printed at a private press owned by him.

The late Nizam honoured the Maharaja Bahadur with the title of "Shagird-i-Khas Asafiah" (the special pupil of His Highness), which is considered to have "a very special honour attached to it and is seldom bestowed by a sovereign on his subject."

His keen literary tastes made the late Maharaja a great poet, and since, according to Ben Jonson, "Poets are rarer births than Kings," our respect for his wroks increases all the more.

His many works indicate the diversity of thought. For instance "Safar-i-Shadnagar" and "Sair-i-Punjab" show us his capabilities as a descriptive diarist. In "Eeman-i-Shad" and "Deen-i-Hussain" he half-heartedly gives some glimpse into his religious beliefs. His "Rubaiyaat-i- Shad" show how ardently he was a seeker after truth. His other noteworthy works are, "Jawab-ba-Sawab," "National leader," "Diary of Gulburga," and "Pairaani-Aqilath."

In his religious beliefs people have mistakenly compared him with Dara Shukoh or other free thinkers. A free thinker, we should remember, is a person who feels bored when religious discussions go on. This was not the case with the late Maharaja Bahadur, for, on the contrary, he took great delight in the company of sadhus and sanyasis, and listened with keen interest to all.

His religious views are fairly expressed in two of his books, the "Eeman-i-shad," and the "Deen-i-Hussain." The former is in Persian while the latter is in Urdu.

The late Maharaja once said, "some people carry their politics into religion, while I carry my religion into politics." But the religion he carried into polities remains somewhat unknown.

Some people hold that like Akbar diplomacy and tact had absorbed his religious instincts and that his underlying purpose was mainly political.

But whatever might have been his religious belief, we must here note that he was tolerant of all religions. He was a Sufi and a mystic, and an ardent seeker after truth.

He left no stone unturned in trying to bridge the gulf which existed between the Hindus and Muslims of his time, and has contributed much towards the communal harmony that exists now.

He can be compared to Mr. Winston Churchill in that he was a statesman as well as a literateur.

and his memory retentive. He was of a kind disposition and his tender heart made him highly sensitive and extremely affable in his manners towards the lowest person. He was never severe and was never responsible for an unjust order.

The Maharaja Bahadur's manners were modest and unaffected, and this made everyone feel at ease in his company. He did not spend much on himself but lavishly distributed whatever he had among the poor. He was great among the great, and lowly among the humble.

He was very fond of travelling As he himself said, "How can we become cultured and refined? Can we attain the goal of culture and refinement by confining ourselves to our homes? Never. For this we need to travel and see the wonders of the outside world, so as to acquaint ourselves with the culture and civilization of the various peoples inhabiting the numerous countries."[1]

This indicates how much he cared for travel, and gives us a true insight into the love he possessed for social contacts. He thought that travelling also helps to enrich one's ideas and to cultivate broad-mindedness and toleration, so vital to human progress. His genial disposition and fine manner acted as a magnet in attracting people towards him and wherever he went he endeared himself to both young and old.

We may here recollect how fond of children the late Maharaja was. His sole joy was in being surrounded by children. One usually saw him with his grand children, for it was a source of happiness and recreation to him to take them out to the pictures or carnivals.

1. Taken from "Sair-i-Punjab."

He stood as a monument of kindness and love for the weak, the disabled. and the distibute. Just like Abdur Raheem Khan-i-khana of the Moghul times, Maharaja Bahadur will go down to posterity as a legendary figure, as far as almsgiving is concerned.

The late Maharaja Bahadur was a true aristocrat. Through Maharaja Chundoo Lal he claimed to be a direct descendant of Akbar's famous Ministers Raja Todar Mall. He received a good training and upbringing. " The surroundings which nourished his refined soul have given his personality the dignity it richly deserves," observed a writer. He respected the old Moghul traditions, maintained the old ideals and was proud of the culture of bygone days; hence he tried all he could to maintain the dignity and status of the premier state of India.

Maharaja Sir Kishan Pershad was very broadminded, and therefore tolerant of all castes and creeds. He believed in toleration, for as the poet said,

> "So many castes, So many creeds,
> So many paths that wind and wind;
> But just the art of being kind
> Is all this sad world needs."

He fully realised this need, and always tried to fulfill t. "His catholic vision, and genial temper had attracted all those who had come in contact with him."

His indefatigable industry and thoroughness, unwearied vigilance, sense of justice and purity of character, produced that keen insight into affairs of state, which many a statesmen lacks. His understanding was quick,

upon it. It would not be an exaggeration to say that no other nobleman of Hyderabad ever gave larger sums towards benevolent funds than the late Maharaja. The real inspirer of the late Maharaja in this connection seems to have been his revered master the late Highness Nawab Mir Mahboob Ali Khan Bahadur, who was himself famous for his great generosity.

Most of us have still fresh in our memories, the scene on the streets and roads which the Maharaja happened to pass. We only need to look back a few months. What do we see?

We see the naked and semi-naked sons and daughters of India, crowding the footpaths, so hopeful, so glad, so relieved-- nay even so thankful to the one who has not yet passed that way. But listen! there goes the whistle. and there comes a huge black car, slowly and gracefully, with a black flag flying on its bonnet, and a dignified old man sitting next to the driver glances pitifully at the bystanders, while another from behind throws out silver coins among them -- and in a moment everything is over But many are the prayers that rise from the depths of the hearts of the bystanders as they are engaged in hurriedly picking up the coins.

Thus the Maharaja Bahadur passed through the streets of Hyderabad, his A.D.C. always throwing money out as the car passed. This was an old Moghul custom followed by Moghul Emperors and noblemen.

This made the Maharaja Bahadur immensely popular among the masses of the people who now bemoan his loss.

He had two distinct sides, the aesthetic and the practical. While his tender heart, quickly responsive to human affections and keenly sensitive to the beauties of nature, marked him out as a born poet, his foresight and tact gave ample proof to show that he was a statesman as well.

Thus when we study his character in the light of these two distinct traits, we find that he combined in himself the gentleness, the tenderness and the broadmindedness of the poet, with the keen insight, the tact, and the toleration of the statesman.

His generosity was boundless and he took such a pleasure in these lavish distributions that he may well be termed the Hatim Tai of Modern Hyderabad. It is through the channels of charity that the virtue of compassion must flow, for it is through almsgiving that the rich can show their compassion towards the poor, and probably it was this that the late Maharaja believed and practised.

He had also inherited this quality from his generous ancestor Maharaja Chandoo Lal, about whom it is well-known, that he so lavishly distributed alms that it often passed the bounds of discretion, and in the north people talked of Hyderabad as "Chundoo Lal's City". History repeats itself, and four generations later there was to be born one who was to possess the same benevolent disposition which characterised his ancestor.

Maharaja Sir Kishen Pershad's charity is so widely known, and so much appreciated, that we need not dilate

Though he resigned in 1912, as Prime Minister, yet he retained the hereditary office of Peshkar, and for the next fourteen years the statesman in him was definitely subordinate to the poet. These fourteen long years he devoted to the pleasures of Arts literature and painting being his hobby. During this period the great statesman and politician, was slowly and steadily moulding into a greater writer and a still greater poet.

But after a gap of more than fourteen years, the accomplished poet and veteran statesman was again recalled to the "helm of the state." This was the first instance in the History of the Administration of Hyderabad that in one reign a Premier was recalled to his post, after his resignation.

Maharaja Bahadur resumed office as the Sadre-Azam on 24th November 1926. He succeeded Sir Ali Imam as chancellor of the Osmania University, and remained as chancellor till 1937, when he was succeeded by Sir Akbar Hydari, our present Sadre-Azam.

In his qualities he very much resembled his great ancestor, Maharaja Chandoo Lal. An interesting incident might be recalled. It is said that His Highness the late Nizam, who was two years younger than the late Maharaja Sir Kishan Pershad, once remarked before his courtiers, "what a remarkable likeness the young Raja bears to Maharaja Chandoo Lal," and continued, "I think he will be another bright star in his family" This Royal remark bears ample testimony to the promise the late Maharaja showed ever since he was a boy.

photograph is still to be found in the Central Hall of the Maharaja Bahadur's city palace.

The Royal appreciation of the firm character and fine qualities of the nobleman did not stop at this, for during the birthday celebrations of H. M. King George V in the year 1910, the Maharaja Bahadur was honoured with the title of G. C. I. E. by the King-Emperor. This was an unparalleled example of Imperial favour since no ruling chieftain had been decorated with a G. C. I. E till then.

The late Maharaja Bahadur may well be termed a versatile genius. His brilliant capacity for administrative work, proved very beneficial to the state, and under his able guidance rapid advancement was made in every sphere of life in Hyderabad.

When in October 1911, Lord Hardinge then Viceroy of India, came to Hyderabad to offer his condolences to His Exalted Highness the Nizam on the death of His Highness Mir Mahboob Ali Khan Bahadur, he congratulated the Maharaja Bahadur on his excellent administrative and constructive genius, and on the rapid strides made in all directions during his ten years' Premiership.

In 1912, after having served for eleven years as Prime Minister he tendered his resignation. As a great scion of a great house that claimed a still greater ancestor, Maharaja Sir Kishan Pershad had during his long period of service, proved his worth, and his unbiased mind won for him universal applause.

pieces of jewellery from the late His Highness Mir Mahboob Ali Khan Bahadur. He received the title of Raja Rajayan Maharaja Bahadur, which had been held by his ancestors.

He justified the confidence placed in him by fulfilling his duties with the just and generous disposition, which so much characterised him. His uncommon genius, his enormous energy and courage, won for him golden opinions, and on 13th November 1902 he was finally confirmed as Prime Minister.

On the 1st January 1903, during the New Year celebrations the Maharaja Bahadur received from the British Government, the insignia of Knight Commander of the Indian Empire. By now the Maharaja Bahadur had distinguished himself by his loyal services, and had gained the trust and confidence of his Royal Master who during the Bakrid Durbar of 1903 decorated the Maharaja Bahadur with the title of Yaminus Saltanat, as a mark of appreciation of his loyal services.

His brilliant career, noble descent, and high ideals had made him one of the most distinguished men in Hyderabad; and therefore in 1905, it fell to his lot to entertain their Royal Highnesses the Prince and Princess of Wales (later H. M. King George V and Queen Mary) when they visited Hyderabad during their Indian tour.

During their stay in Hyderabad, the Maharaja Bahadur, discussed all matters of interest with the Prince who, impressed by the noble bearing and dignified appearance of the gifted conversationalist, presented the Maharaja Bahadur with a photograph of his. This

A MEMOIR OF THE LATE MAHARAJAH SIR KISHEN PERSHAD BAHADUR.

VERY few people emerge successful from the trying ordeal of life. Maharajah Sir Kishan Pershad Bahadur was one of the rare successes. He was born on the 28th January 1864. He was the only son of Raja Hari Kishan. His mother was the only daughter of Maharaja Naraindar Pershad, grandson of the celebrated minister Maharaja Chandoo Lal.

Maharaja Naraindar Pershad had no male issue and therefore adopted his grandson, the late Maharaja Sir Kishan Pershad as his heir. He received his early education at the Madrasa-i-Aliya, under the guardianship of his grandfather, on whose death he succeeded him to the hereditary jagirs, in which he was given full civil and criminal powers over his people. This is only enjoyed by the highest nobles of the state.

On the 21st May 1893 he was appointed to the hereditary post of Peshkar, and was also given the portfolio of the Military Department. This happy occasion was celebrated by a Firman of His Highness the late Nizam, when all offices were closed for two days, and the Maharaja received several pieces of valuable jewellery from His Highness.

In 1897 he was made a member of the council of Nobles. On the 25th August 1901 he began to officiate as Prime Minister and received in this connection six

not only Hyderabad has lost a great statesman but a still greater moral influence for the development of those feelings of unity between the different classes of people in which alone lies our future success in the political field. Above every thing else he was a great gentleman. I deeply regret that Hyderabad should have been deprived of his wise guidance at this juncture but I have no doubt that his memory will always be a valued treasure.

(Sd.) TEJ BAHADUR SAPRU.

AN APPRECIATION OF THE LATE MAHARAJAH BAHADUR.

NOTE:—Upon the editor's request, Sir Tej Bahadur Sapru was kind enough to send us the following lines, for which we are very grateful.

BETWEEN 1920 and 1940 during my repeated visits to Hyderabad I had the honour and privilege of meeting the late Maharaja Sir Kishan Pershad Bahadur on numerous occasions and was the receipient of much kindness and courtesy and hospitality at his hands. He was one of the most remarkable men whom I have in my long experience met anywhere. I have not come across a better type of representative of the old culture, which, I regret to say, is fast disappearing. A nobleman of the first rank he combined in himself most attractive manners, a perfect command over polished language and most winning manners. Throughout my conversations with him I discovered that his ruling passion in life was loyalty to the State and its great Ruler but this did not prevent him from entertaining the most sympathetic and generous views on some social and economic questions affecting the welfare of people at large. Naturally from one who belonged to his school of thought one could not expect that he would subscribe to some of the modern theories and ideas which many people believe in or affect to believe in at the present moment. One might almost describe him as a liberal-mined conservative but this does not mean that is conseratism prevented him from reading the signs of the times correctly and bringing about re-adjustments in response to the needs of the time. In his death

offence. Devoid of self interest he was free from fear, because his conscience and his hereditary high rank gave him confidence in his ability to serve his master and the State from the best and purest of motives.

I first began to know him in 1901 and I served under him in various capacities, and several times as Judicial Secretary and as Political Secretary between 1904 and 1912. I was a member of the Executive Council in the Political Department when he became President in 1927 and I had the opportunity of comparing the past man with the present: and I found that the best in him had survived. My personal knowledge of him extends over a period of nearly forty years, and I am proud to say that I always felt honoured by his friendship, the rememberance of which compels me to pay this last tribute to his memory.

NAWAB SIR NIZAMAT JUNG BAHADUR,
KT., C.I.E., O.B.E.

nature a reconciler of opposites and a moderator of extreme views, he always remained remarkably free from communal narrowness, and his whole life typified Hindu-Muslim unity as an achievable success. In this way he set the best example for all India to follow if it would reach the object of its political ambition. His public service, in this respect, is of the highest value, and what ever portion of his reputation as Prime Minister or President survives him, the memory of this most characteristic aspect of the man should not be allowed to fade.

When thinking of some of his many accomplishments, which made his private life beautiful, it is a pleasure to recall that he was a scholar and poet by natural inclination, that he was a seeker after some comprehensive creed unting the best elements of all religions; that he was an amateur artist who devoted hours to painting, and a lover of Indian music. But, far above culture and elegance of taste I would place his native qualities of the heart, for the charm of his personality always made itself felt as an influence for good. He was as true and sincere to his frinds as he was firm in his loyalty and to his master. His sympathy with all men was like a perennial stream; at times it became an irresistible impulse and made his generosity seem almost like a fault when its bounty exceeded the limits prescribed by prudence. Thus his heart was always full and his purse empty!

Though his rank gave him the first place among courtiers, he never stooped to servile flattery but maintained his self-respect unimpaired to lend support to his representations to his master. He was never afraid of speaking the truth, and managed it so gracefully that it never gave

of secretaries who had served under four prime-ministers from the days of the great Sir Salar Jung was yet alive and able to work with him. His path was thus made smooth for a time, and when Nawab Emad Jung died in 1904 there was Mr. (afterwards Sir George) Casson Walker, Asst. Minister for Finance at his side, whose weight and firmness served to balance the administration. And there was also Mr. A J. Dunlop, a veteran in whose hands the Revenue Department was quite safe. The City Police was under the strong hand of Nawab Akbarul Mulk, a man of mark, and the District Police was under Mr A. C. Hankin, one of the best British officers Hyderabad ever had. In this way Sir Kishen Pershad's regime began under favourable conditions and his administration became steadily prosperous till the demise of H. H. the late Nizam in 1911

In 1912 circumstances induced him to resign and he retired into seclusion. But he was not idle. He was following the course of events, observing the signs of the times and meditating and maturing! Thus he was on the whole better fitted for the Presidentship of the Council when the call came in 1927. He had watched Sir Ali Imam's meteoric career, he had seen the ups and downs in the Presidential path and he had probably arrived at the conclusion that it was not only cleverness and tactics, but a fine combination of ability and tact and sincerity and good-will and sympathy with the nobler aspirations of the people that made a good minister. And he knew that moral weight and prestige, which personal character alone could give, were necessary to success. These qualities he possessed in an eminent degree and therefore he merited and enjoyed the confidence of the public. By

MAHARAJAH SIR KISHEN PERSHAD YAMINUS SALTANAT

A NOBLE spirit has passed away from our midst and Hyderabad is the poorer for the loss.

Of the greater nobility Maharaja Sir Kishan Pershad was the last connecting link between the calm and dignified life of the past and the progressive tendency of the present age. As the representative of an ancient family, one of whose members, Raja Chandoo Lal, has played an important part in the History of the Deccan, Sir Kishan Pershad was always mindful of his responsibility for maintaining its prestige by his own reputation as a loyal servant of the State eager to preserve peace and harmony. Fully trusted by the master who chose him for the highest office of trust on Sir Vikar-ul-Omra's retirement from the Premiership in 1901-2, he knew what his position was and what it should be, both with the master who had honoured him, and with the people of Hyderabad who expected much from him. He prepared himself accordingly, by becoming a dutiful disciple of his master, whose inherent greatness was well understood by him, and for whose perspicacity and foresight and unerring judgment he had profound respect; and this was his best approach to the heart of the people.

Perhaps he was at a slight disadvantage in the beginning of his career in not having near him many able and experienced officers of the old regime, yet there was compensation in the fact that the oldest and most experienced

Glenview, Fernhill.
16th May 1940

It was with the deepest regret that I read of the death of Maharajah Sir Kishan Pershad on Monday, and I am writting to express my sincerest sympathy with you in your great sorrow.

Like many thousands, I feel I have lost a great and good friend in him.

Yours Sincerely,
MIRZA M. ISMAIL

46, F. Warden Road,
Bombay, 15th May 1940.

Dear Sir,

I have learnt with the deepest regret that your distinguished father, Maharaja Sir Kishan Pershad Bahadur passed away on the 13th instant. By his death the country has lost the services of a great nobleman, scholar and statesman, and I write to convey to you and the members of your family my deep sympathy in your bereavement.

Yours sincerely,
M. VISVESWARAYYA.

Shoodian House,
Via. Nilgiries, 16th May

My dear Syed Alambardar,

It has been a great grief to us that the Maharajah has passed on and that we were not present to pay our last respects. His has been a long and very distinguished life and Hyderabad mourns the passing of its most distinguished public servant. To me the recollection that I most especially cherish of Hyderabad is that I was privileged to serve for three years under Sir Kishan Pershad. He was the last of the great nobles of the old order and of a great tradition. Please convey to his family my very real sympathies for them in their sad bereavement.

Yours sincerely
R. M. CROFTON.

Profoundly grieved to learn of the passing away of a great personality a great statesman and pillar of Hyderabad. Your illustrious father Maharaja Sir Kishan Pershad Saheb Bahadur. It would be very hard to fill his place within Nizam Dominions. H. E. Highness lost one of his devoted and loyal servants, whole Hyderabad will mourn the great Maharaja's loss. Tender you and your family my heart-felt sympathy may Almighty grant strength to bear with resignation is my fervent prayer.

RABINDRANATH TAGORE.

Please accept my sincere condolences on the death of my old and respected friend Sir Kishan Pershad. He was a nobleman of the widest sympathies and great force outside the State regarded as a sound advisor and trusted friend.

SIR C. P. RAMASWAMY IYER.

Deeply grieved at sad news of death of His Excellency Maharaja Sir Kishan Pershad. Kindly accept this sincere expression of our heart-felt sympathy and condolence.

MAHARAJA PRATAB SINGH of Nabha.

Deeply sympathise with you in your bereavement India loses fine gentleman and great statesman.

TEJ BAHADUR SAPRU.

Sorry for your bereavement heart-felt sympathies with you.

SADRYAR JUNG.

SOME MESSAGES UPON THE DEATH OF MAHARAJA SIR KISHEN PERSHAD BAHADUR

NOTE:— By the kindness of the family of the late Maharaja Bahadur we have been permitted to publish here copies of some of the messages of condolence received on the passing away of the Maharaja Bahadur. They are from all parts of India, and reveal the universal esteem which our late Chancellor enjoyed.

MUCH grieved sad news my heart-felt sympathies and condolences in your great bereavement.

AZAM JAH

We send you and the family our heart-felt condolences in your sad bereavement.

MOAZZAM JAH

Your reverend father's death great loss am extremely grieved offer condolence.

SIR MOHD. YAKUB

Greatly shocked fathers death irreparable loss to me and Hyderabad heart-felt condolences deep sympathy with self family.

RAJA BAHADUR KRISHNAMACHARI



all literary circles. His great hobby was sketching particularly landscapes in water colours. As an amateur artist, he is considered as foremost among India's noblemen as a painter.

Socially considered, he was a man of wide sympathies. Men of all ranks, tastes, and accomplishments were his companions. His genial temper, refined humour, and amiability attracted persons from the four corners of India

Such a personage of extraordinary virtues, and of wide, comprehensive and deep nature, passed away on the 13th of May 1940, and left a void in the literary and social life of Hyderabad that will be impossible to fill. Blessed be his soul and God's grace attend him!

through the scrolls. of the chronicle of the state. A quality which ran, as as it, were, in his blood, was his unswerving loyalty to his sovereign. His influence is main fest in every branch of the Hyderabad administration, and during his tenure of office a remarkable advance was made in all directions. "He threw himself heart and soul into his work and surpassed every one by the manner in which he approached al' questions with an open and unbiased mind." His sincere love of the people and his devotion to the best interests of the State are the hall-marks of his administration. He was an earnest and untiring advocate of educational advancement. He did not only emphasise the importance of education and enlightenment in his public addresses, but spent his time between his books, and manuscripts, in his private life.

The quality that was foremost in him was that of generosity. He embodied the spirit of his glorious grandfather, Maharajah Chandoolal, the first Hyderabad Statesman, who laid down a tradition of charity and philanthropy in the family. The needy and the poor have lost in him their greatest benefactor and friend, and their perpetual prayers for his welfare have turned into divine blessings upon his peaceful soul

The versatility of his genius may be gauged by his profound scholarship in Persian, Arabic Urdu, Theosophy, and Art. Under the non-de-plume Shad he loved to write verses both in Urdu and Persian, mostly lyrics full of mystical thoughts. Sufism was in grained in his nature and he pinned his faith to the oriental spiritual philosophy which colours almost all his literary compositions letters, epistles, poems, essays and eulogies. He is remembered and admired as a great literary artist in

attachment to our late Chancellor, by sending their inspiring messages. To them and Sir Tej Bahadur Sapru who has contributed an article to this issue, our heartfelt thanks are due.

We publish with thanks, the articles of some of our College brethern who had closely and intimately studied the life and work of the Maharajah This special issue, therefore, contains generally three view-points those of the Hyderabad administrators, of the distinguished British Indian personalities, and of the Osmanians, and sheds a considerable flood of light upon the most prominent aspects of the late Maharaja's life. We are thus content with what and how much we publish in this Number.

Now we dedicate ourselves for a while to the memory of our late chancellor, whose life holds out invaluble lessons to us.

The late Maharajah was one of those few heroic and ideal personages who are born with a message in their mouths, an ideal in their eyes, an example in their actions and a divinity in their hearts. He was in words and deeds an enthusiastic up holder of the cause of communal amity. As a descendant of Todar Mal, the Minister of Akbar, he culturally belonged to the school of Akbar, and was considered to be "the last of the Moghuls." The illustrius house to which he belonged had played an important role in building up the fabric of the "Deccani" culture and nationalism. He was "Chevalier Bayard, without the sword as the advocate of his chivalry. His advocate is his love, spontaneous, inherent, unostentatious, for his fellow men." As an administrator, his name will always shine

EDITORIAL.

THIS is the long-awaited special Maharaja Number with which our tenure of office as editor comes to a close. The size of the English section is not as large as it should be, to which various reasons may be assigned. The first and foremost among them is the paucity of the writers in English in Hyderabad, and greater still the small number of those writers in English who had been in contact with the late Maharajah during his life-time; for only such writers are in a position to persent a perspective of the late Maharajah's life and work in their articles rather then those whose knowledge of him is confined only to what his friends and admirers revealed to the country. Some of such qualified writers were unable to contribute their articles in time and some of them could not write an all on grounds of ill-health and of multifarious engagements. Neverthless, we were fortunate enough to get valuable articles from Nawab Sir Nizamut Jung Bahadur, the ex-political minister, and Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, the ex-judicial minister- personages, who were once the official colleagues of the late Maharajah during his term of office as the Prime Minister, and among his closest friends at home, -to whom our sincere thanks are due. Again, as the late Maharajah's circle of friends and admirers was not only confined to the Hyderabad State but it compassed the whole of India, so we have been in communication with some of the distinguished personalities outsite our Dominions, who affirmed their sincere

VOL. XIII. NO. 4

CONTENTS

Annual Subscription	Rs.
From Government	12
.. Universities, other Institutions and State Officers ..	8
.. General Subscribers	6
.. Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms	[illegible]
.. Present Students, Osmania University .	4
. Abroad	Fifteen Shillings
.. Old Students, Abroad	Ten Shillings
.. Single Copy	Four Rupees.

Note.—Registration and V. P. P. Charges Extra.

Can be had at :-

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XIII No. 4

ADVISORY BOARD

President

Qazi Mohamed Hussain, Esq. M.A., LL.B., (Cantab.) Pro-Vice-Chancellor

Adviser, English Section

V. S. Krishnan, Esq. M.A. (Oxon)

Adviser, Urdu Section

Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore, M.A. Ph. D. (London).

Honorary Treasurer

Prof: Wahidur Rahman, B. Sc.

MANAGING COMMITTEE

1348 49 F.

President

Qazi Mohammed Husain, Esq., M.A., LL.B. (Cantab.), Pro Vice-Chancellor

Adviser English Section

V. S. Krishnan Esq., M A., (Oxon.)

Adviser Urdu Section

Dr. Syed Mohiuddin Qadri Zore. M.A., Ph. D. (London).

Honorary Treasurer

Prof: Wahidur Rahman, B. Sc.

Secretary.

Ahmed Khan. B.A. (Osman).

Managing Editor & Editor Urdu Section

Mohammed Turab Ali Khan.	Syed Mohammed Taqi Hashmi M.A. (Osman.)
Vice-President, Students' Union.	*Editor, English Section.*
Syed Husain Razvi	Ghulam Ghous Khan B. Sc.
Asst: Editor, Urdu Section.	*Asst: Editor, English Section.*

THE

OSMANIA MAGAZINE

Maharajah Memorial Number

MANAGING EDITOR

AHMED KHAN B.A., (Osman)

EDITOR

SYED MOHAMMED TAQI HASHMI M.A.,

JOINT EDITOR

GHULAM GHOUS KHAN, B. Sc.

Vol. XIII 1940 No. 4

Printed at

THE AZAM STEAM PRESS

HYDERABAD-DN.